مقالاتِ یومِ شبلیؔ

ترتیب

خانؔ عبیداللہ خانؔ

اُردو مرکز لاہور

مُقالاتْ یوْمِ شِبْلیؒ

مقالاتِ یومِ شبلی

ترتیب

خانِ عبیداللہ خان

★

اُردو مرکز لاہور

تعداد : ۱۰۰۰

بار اول : ۱۹۶۱ء

ناشر : ظہیرالدین احمد

ادارہ : آردو مرکز ، لاہور

طابع : سویرا آرٹ پریس ، لاہور

★

صدر دفتر

اردو اکیڈمی سندھ

۱۶ - بہادر شاہ مارکیٹ ، لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعارف

شبلی مرحوم کا سو سالہ جشن ولادت

مارچ ۱۹۵۷ء کی ایک رات میں نے لاھور میں مولانا شبلی مرحوم کو خواب میں دیکھا کہ باقاعدہ جبہ و عمامہ پہنے عینک لگائے چھڑی ھاتھ میں لئے ایک کرسی پر جلوہ افروز ھیں اور ان کے فاضل شاگرد و جانشین سید سلیمان ندوی مرحوم کرسی کے پیچھے کھڑے ھیں۔ میں کچھ دیر اس روح پرور نظارے سے خواب ھی میں فیض اندوز ھوتا رھا۔ سید سلیمان صاحب سے تو علی گڑھ میں کئی مرتبہ شرف ملاقات حاصل ھوچکا تھا لیکن مولانا شبلی مرحوم کی زیارت کبھی نصیب نہیں ھوئی تھی اور اس سلسلہ میں اپنی کم نصیبی پر میں اکثر پروفیسر براؤن کے الفاظ ”وائے کہ از زیارت آن علامہ عصر محروم ماندیم“ دھرایا کرتا ھوں۔ استاد اور شاگرد کی ایسی یکجائی تصویر بھی میری نظر سے کبھی نہیں گذری۔ یہ کیفیت کچھ دیر قائم رھی تو خواب ھی میں میری زبان پر ایک فارسی مصرعہ جاری ھوگیا حالانکہ شعر سے ذوق کے باوجود شاعری کی نعمت سے یکسر محروم ھوں۔ چونکہ اس مصرعہ کا

تعلق خود میری ذات سے ہے۔ اس کا اظہار ضروری نہیں سمجھتا۔ دونوں بزرگ بالکل خاموش رہے اور کچھ دیر کے بعد یہ سماں خواب و خیال ہو گیا۔

صبح اٹھا تو اس نظارے کی تازگی سے میرے دل و دماغ پر ایک وجد انگیز مسرت طاری تھی۔ ایک روحانی اور قلبی مسرت و طمانیت کا گہرا احساس موجود تھا۔ اور تمام کیفیت میرے پردہ ذہن پر اپنی پوری گیرائی اور گہرائی کے ساتھ نقش تھی۔ ایک ھفتہ بعد ایک نیک اور دیندار دیرینہ دوست سے ملاقات ہوئی جو اب افسوس ہے مرحوم ہو چکے ہیں۔ انہیں خواب سنایا تو وہ بھی بے حد مسرور ہوئے۔ اور نہایت دل خوش کن اور مسرت آمیز تعبیریں بیان فرماتے رہے۔ اس کا تذکرہ میں نے ان دوست کے علاوہ کسی سے نہیں کیا۔ لیکن ان دو مردان مجاھد کی زیارت کے جلوہ کے تقاضے سے متعلق میرے دل و دماغ مصروف کاوش ضرور رہے۔ اور میں نے اس زبان بے زبانی کا مفہوم سمجھنے کی کوشش ضرور جاری رکھی۔ اسی ادھیڑ بن میں دوبارہ 'حیات شبلی' کا مطالعہ شروع کیا۔ تو یہ حقیقت نئے سرے سے سامنے آ گئی کہ مولانا ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے تھے اور ۱۹۵۷ء ان کی ولادت کے سو سالہ جشن کا سال ہے۔ ہندوستان اور پاکستان نے اس سال تحریک آزادی کا سو سولہ جشن منانے کا فیصلہ کیا اور دونوں ملکوں نے جشن آزادی کی تیاری اور تقریب کے لئے اپنی تمام قوتیں وقف کر دیں۔ ایسے میں ماہ مئی میں کسی فرد واحد کے صد سالہ جشن ولادت کے منانے کے لئے فضا سازگار نظر نہ آئی۔ ۱۲ جون کو چنیوٹ سے لاھور جاتے ہوئے جب میں بس میں سوار مولانا کی زیارت کے تقاضے پر غور کر رہا تھا تو میں نے فیصلہ کر لیا۔ کہ مولانا کے سے مرتبہ و شان اور عشق ملت سے مخمور و مسرور بزرگ روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ ایسی تقریب پر ان کی خدمت میں ھدیہ عقیدت نہ پیش کرنا قوم کی بے حسی اور محرومی کی

دلیل ھوگی - میں نے طے کر لیا - کہ اور کچھ نہیں تو اسلامیہ کالج چنیوٹ کے مجلہ 'البصیر' کا ایک 'شبلی نمبر' اس تقریب کی یادگار میں شائع کیا جائے اور اگر ممکن ھو تو اس سلسلہ میں ایک جلسہ اھل علم کا چنیوٹ اسلامیہ کالج کے زیر اھتمام منعقد ھونا چاھئے -

شبلی نمبر کے لئے اس فیصلہ کے فوراً بعد کام شروع کر دیا گیا - اور اپنے نوجوان رفیق کار پروفیسر حافظ عبیداللہ خاں صاحب سے اس سلسلہ میں بحیثیت اڈیٹر دوڑ دھوپ شروع کر دینے کو کہا تو انہوں نے بھی ڈاک کے گھوڑے دوڑانے شروع کئے - جن لوگوں سے ملنا ممکن تھا ان سے ملے - درخواست ، یاد دھانی ، رقعہ ، پرچہ ، تار سبھی قسم کے قاصد اور نامہ و پیام استعمال ھوئے - پاکستان اور ھندوستان کے کونہ کونہ میں پہنچنے بلکہ ایک دوسرے ھمسایہ ملک سے بھی مقالات حاصل کرنے کی کوشش کی گئی - لیکن چنیوٹ نہ کراچی ھے نہ لاھور - اور ایک چھوٹے سے نئے کالج کے پاس نہ ملکی رسائل کا سا عملہ ھے ، نہ ذرائع ، نہ رسوخ و اثر اور نہ غافلوں کو آمادہ عمل کرنے کے لئے نام و دام -

میری ایک تجویز یہ تھی کہ مولانا کی ایک ایک کتاب پر سیر حاصل تبصرہ لکھوایا جائے اور اس کتاب سے ان کے طرز استدلال اور اسلوب تحریر کے نمونے دکھائے جائیں - افسوس ھے اس کام کے لئے نہ معاونین میسر آ سکے اور نہ ھی وقت مل سکا - ایک دو نمونے پیش کئے جا رھے ھیں -

مجھے ان بزرگوں کا دلی شکریہ ادا کرنا ھے جنھوں نے اس تجویز کو عملاً پسند فرمایا اور ھماری درخواست اعانت کو شرف قبولیت بخشتے ھوئے اپنے مقالات سے ممنون فرمایا - مجھے ذاتی طور پر اس سلسلہ میں ڈاکٹر محمد حبیب اللہ خان صاحب - ولائیت منزل علی گڑھ - حاجی محمد مقتدیٰ خان صاحب شروانی علی گڑھ اور شیخ محمد عبداللہ صاحب

ایڈوکیٹ - بانی مسلم گرلز کالج - علی گڑھ کا دلی شکریہ ادا کرنا ہے کہ ان بزرگوں نے اس سلسلہ میں باوجود چند موانع کے ہمیں اپنی معلومات سے بہرہ اندوز فرمایا -

ایک دور افتادہ مقام پر ایک نوزائیدہ تعلیمی درس گاہ کی یہ کوشش فی الحقیقت ملت کی طرف سے ایک فرض کفائیہ کی انجام پذیری ہے - اللہ تعالیٰ شبلی مرحوم کو خدمت ملت کی جزائے خیر دے - اور ملت کو وقتاً فوقتاً اپنی رحمتوں سے نوازتا رہے - اور اس دور فساد و همه گیر انتشار میں ایسے بزرگوں کے ظہور سے سرفراز فرماتا رہے - جو ملت کی سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کا مذہبی فریضہ انجام دے کر ملت کو اسلامی زندگی بسر کرنے پر راغب کرتے رہیں -

عطـــا اللہ

ترتیب

حرفِ آغاز

مئی ۱۹۵۷ء میں جناب پرنسپل شیخ عطاء اللہ صاحب کے خواب کو عملی جامہ پہنانے اور علامہ شبلی مرحوم سے اہل پاکستان کی عقیدت کے اظہار کے لئے چنیوٹ جیسے دور افتادہ مقام پر ان کے صد سالہ جشن ولادت کی تقریب منعقد کرنے کا خیال آ تو گیا لیکن جب اس کار خیر کو انجام دینے کی ساعت قریب آئی تو یہ کام پہاڑ کی طرح مشکل نظر آیا۔ بعض بزرگوں اور دوستوں سے مشورہ کیا۔ سب نے اس کام کو پسند فرما کر حوصلہ افزائی فرمائی۔ سب سے زیادہ مکرمی مولانا سعید انصاری صاحب مدظلہ، نے اس کام میں نہ صرف ہاتھ بٹانے کا وعدہ فرمایا بلکہ عملی طور پر ہمارے ساتھ اس جد و جہد میں شریک بھی ہوگئے۔ چند ہی دنوں میں اس جشن کا چرچا ہو گیا اور مختلف شہروں سے خطوط آنے لگے۔ خیال تھا کہ اعظم گڈھ والے یہ خبر سن کر ہم پر سبقت لے جانے کی کوشش کریں گے۔ لیکن نہ جانے کیوں وہ خاموش رہے اور کیا مجبوریاں اُن کے ایسا کرنے میں حائل رہیں۔

صد سالہ جشن ولادت کے فیصلہ کے بعد یہ خیال پیدا ہوا کہ اپنے کالج کے مجلہ ''البصیر'' کو اس سال علامہ شبلی کے لئے وقف کر کے ان کی یادگار کے طور پر جشن کے ساتھ ساتھ اس کا شبلی نمبر شائع کیا جائے۔ چنانچہ راقم الحروف نے اس سلسلے میں پاک و ہند کے ممتاز ادیبوں اور اہل قلم حضرات کو خطوط لکھے۔ بعض حضرات نے جواب مرحمت فرمایا لیکن بڑی بے اعتنائی سے۔ بعض حضرات نے جواب دینے کی زحمت بھی گوارہ نہیں فرمائی۔ البتہ جنہیں علامہ مرحوم سے حقیقی محبت اور عقیدت تھی انہوں نے اپنے اپنے مضامین بھیج کر ممنون فرمایا۔ اس طرح بڑی عجلت میں اپنی کم مائگی اور بے سر و سامانی کی حالت میں شبلی نمبر ترتیب دینے کی سعادت حاصل کر سکا اور ۱۵ دسمبر ۱۹۵۷ء کو جشن

ولادت کے موقع پر جب شبلی نمبر شائع ہوا تو نہ صرف پاکستان و ہندوستان بلکہ مغربی ممالک کے علمی حلقوں میں بھی اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا ۔ بیرونی ممالک سے تعریفی خطوط آئے اور جرائد نے بھی جی کھول کر داد و تحسین کا حق ادا کیا ۔ پاکستان کے ہر ادبی اور معیاری رسالے اور اخبار نے تبصرے شائع کئے ۔ علامہ شبلی پر جو لوگ کچھ کام کر چکے تھے اُن سب نے اس نمبر کو بنظر استحسان دیکھا اور اسے ایک کارنامہ قرار دیا ۔ جرائد میں تبصرے شائع ہوئے تو ہر طرف سے شبلی نمبر کی مانگ ہونے لگی ۔ ادارۂ ''البصیر'' نے دل کھول کر اس ضخیم نمبر کو بلا قیمت لوگوں کی خدمت میں پیش کیا ۔ چنانچہ جتنی کاپیاں چھپوائی تھیں ۔ وہ بہت جلد ختم ہوگئیں اور میرے لئے تمام لوگوں کی مانگ کا پورا کرنا مشکل ہو گیا ۔ اس لئے جناب پرنسپل صاحب کے مشورے سے اس نمبر کو بعض اضافوں کے ساتھ کتابی شکل میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا ۔ لیکن کاغذ کی قلت اور الیکشن کے کام کی زیادتی کے سبب یہ فیصلہ عملی صورت اختیار نہ کر سکا ۔ اُدھر مانگنے والوں کا مطالبہ بڑھتا رہا اور روزانہ خطوط آتے رہے ۔

پچھلے سال جولائی میں جب راقم الحروف کو اپنے پی ۔ ایچ ۔ ڈی کے مقالہ کے سلسلہ میں ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں اور لائبریریوں میں جانے کا اتفاق ہوا تو یہی ''شبلی نمبر'' میرے لئے ایک تعارفی دستاویز ثابت ہوا ۔ دھلی ، علی گڑھ ، بریلی ، لکھنؤ ، الہ آباد ، بنارس غرض جہاں بھی میں گیا لوگ اس نمبر کی وجہ سے مجھے اور اسلامیہ کالج چنیوٹ کو پہلے سے جانتے تھے اور اس خدمت کی وجہ سے وہ میری ہر طرح کی مدد کرنا اپنا اخلاق اور ادبی فرض سمجھتے تھے بعض حضرات نے اس موقعہ پر اس نمبر کی فرمائش کی لیکن میرا جواب نفی میں پا کر جلد از جلد اسے کتابی صورت میں شائع کرنے کا تقاضا کیا ۔ مجھے اب اس نمبر کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ ہوا ۔ چنانچہ میں نے یہ طے کر لیا کہ پاکستان واپس جا کر سب سے پہلے یہی کام

انجام دوں گا۔

میں نے لاہور پہنچتے ہی ظہیر صاحب (مالک اردو مرکز) سے تقاضا شروع کر دیا۔ چنیوٹ سے تقاضہ کے خطوط لکھے۔ جب بھی لاہور گیا سب سے پہلے ان سے اس کام کے بارے میں پوچھا۔ نمبر پریس میں کمپوز ہو رہا تھا کہ پریس والوں کے پاس بعض اور ضروری کام آ گئے اور یہ کام پھر رک گیا۔ لیکن دیر آید درست آید کے مصداق اب یہ نمبر کتابی شکل میں بڑی دیدہ زیب اور حسین و دلکش صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اس تاخیر کی وجہ سے جہاں قارئین کرام کو انتظار کی زحمت گوارا کرنا پڑی وہاں یہ بھی فائدہ ہوا کہ اس میں بعض قابل قدر اور مفید مضامین کا اضافہ ہو سکا خصوصاً استاذی المکرم جناب پروفیسر سید وقار عظیم صاحب و ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب کے مضامین کے اضافہ نے جہاں قارئین کے لئے استفادہ کا ایک نیا باب کھولا ہے وہاں وہ کتاب کی قدر و قیمت میں بھی اضافہ کا موجب ہوئے ہیں۔

عبیداللہ خاں

اسلامیہ کالج - چنیوٹ - مغربی پاکستان

۱۵ - اپریل ۶۱ء

ظہورِ قدسی

چمنستان دھر میں بارہا روح پرور بہاریں آچکی ھیں۔ چرخ نادرہ کار نے کبھی کبھی بزم عالم اس سر و سامان سے سجائی ھے کہ نگاھیں خیرہ ھو کر رہ گئی ھیں۔

لیکن آج کی تاریخ وہ تاریخ ھے، جس کے انتظار میں پیر کہن سال دھر نے کروڑوں برس صرف کر دئے۔ سیارگان فلک اسی دن کے شوق میں ازل سے چشم براہ تھے۔ چرخ کہن مدتہائے دراز سے اسی صبح جاں نواز کے لیے لیل و نہار کی کروٹیں بدل رہا تھا۔ کارکنان قضاء و قدر کی بزم آرائیاں، عناصر کی جدت طرازیاں، ماہ و خورشید کی فروغ انگیزیاں، ابر و باد کی تردستیاں، عالم قدس کے انفاس پاک، توحید ابراھیم، جمال یوسف، معجز طرازئی موسیٰ، جاں نوازئی مسیح، سب اسی لیے تھے کہ یہ متاع ھائے گراں ارز شاھنشاہ کونین (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دربار میں کام آئیں گے۔

آج کی صبح وھی صبح جاں نواز، وھی ساعت ھمایوں، وھی دور فرّخ فال ھے۔ ارباب سیر اپنے محدود پیرایۂ بیان میں لکھتے ھیں کہ "آج کی رات ایوان کسریٰ کے چودہ کنگرے گر گئے۔ آتش کدۂ فارس بجھ گیا۔ دریائے سادہ خشک ھوگیا۔" لیکن سچ یہ ھے کہ ایوان کسریٰ نہیں، بلکہ شان عجم، شوکت روم، اوج چین کے قصر ھائے فلک بوس گر پڑے۔ آتش فارس نہیں، بلکہ جحیم شر، آتش کدۂ کفر، آذر کدۂ گمرھی سرد ھو کر رہ گئے۔ صنم خانوں میں خاک اڑنے لگی۔ بت کدے خاک میں مل گئے۔ شیرازۂ مجوسیت بکھر گیا۔ نصرانیت کے اوراق خزاں دیدہ ایک ایک کر کے جھڑ گئے۔

توحید کا غلغلہ اٹھا۔ چمنستان سعادت میں بہار آ گئی۔ آفتاب ھدایت کی شعاعیں ھر طرف پھیل گئیں۔ اخلاق انسانی کا آئینہ پرتو قدس سے چمک اٹھا۔

یعنی یتیم عبداللہ ، جگر گوشۂ آمنہ ، شاہ حرم ، حکمران عرب ، فرمانروائے عالم ، شہنشاہ کونین ۔

شمسۂ نہ مسند هفت اختران
ختم رسل خاتم پیغمبران

احمدِ مرسل کہ خرد خاک اوست
هر دو جهان بستۂ فتراک اوست

امی او گویا بہ زبان فصیح
از الف آدم و میم مسیح

رسم ترنج است کہ در روزگار
پیش دهد میوه ، پس آرد بهار

عالم قدس سے عالم امکان میں تشریف فرمائے عزت و اجلال هؤا ۔
اللهم صلی علیٰ محمد و علی آلہ و اصحابہ وسلم ۔

☆

عکسِ تحریر علامہ شبلی

۱۰ جون
۱۹۱۱

ایک وہ دن تھا کہ لکھتے ہیں جو نگارِ حضور
اس نقط حضرتِ بوبکر تھے ہمراہ رکاب
آج وہ دن ہے کہ اسلام سے اٹھا ہے حجاب
برقِ شمشیر جو رہ رہ کے چمک جاتی ہے
چار جانب سے ہوا اٹھتی ہے کہ گھٹا شام تک
آسمان، نعرۂ تکبیر سے گونج اٹھتا تھا۔

چھپ گئے نکار ہیں کہ آیا دل خوف سے تکرار
ورنہ حامی تھا نہ خادم نہ کوئی کارگزار
ساتھ اک فوج گراں ہے کہ نہیں جس کا شمار
خیرہ ہو ہو کے چمک جاتی ہے ہر بار
ہو گیا صحنِ فضا نیلگوں خیرہ و تار
دامنِ عرش کو چھوتا تھا وہ رہ رہ کے غبار

(۹)



علامہ شبلی نعمانی رح

شبلی کے تصنیفی کام کی مجموعی قدر و قیمت

ڈاکٹر سید عبد اللہ

شبلی کے تصنیفی کام کی مجموعی قدر و قیمت کی تعیین ان کے کام کے مجموعی مدعا اور غرض و غایت کی تعیین کے بغیر ممکن نہیں۔ میاں بشیر احمد (مدیر ھمایوں) نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ھے کہ شبلی کا مدعا یہ تھا کہ ''مسلمانوں کے علم و ادب سے دنیا کو روشناس کرایا جائے۔'' وہ یہ بھی لکھتے ھیں کہ ''شبلی کی تصانیف میں ھم اصلی اسلام کی تصویر دیکھتے ھیں۔ اس کے تمدن میں، اس کے فلسفے میں، اس کے شعر و ادب میں'' (ھمایوں۔ مئی ۱۹۳۰ء، ص ۳۲۰)۔ ایک خیال یہ بھی ظاھر کیا گیا ھے کہ سر سید مرحوم کے لائحہ عمل کے دو اجزا تھے۔ اول یہ کہ مسلمانوں کو ان کی موجودہ ذلت کا احساس دلایا جائے۔ یہ کام حالی نے کیا۔ دوم یہ کہ ان کے سامنے ان کی گذشتہ عظمت کے واقعات دھرائے جائیں تا کہ ان میں ترقی کا جوش پیدا ھو۔ یہ فرض شبلی نے انجام دیا۔ (شبلی از مہدی ص ۱)

گذشتہ سطور میں جو کچھ بیان ھؤا بنیادی طور پر غلط نہیں مگر اس سے شبلی کے کارناموں کی صحیح اھمیت واضح نہیں ھوتی۔ ھمارے خیال میں شبلی کا اصل کارنامہ یہ ھے کہ انہوں نے بدلے ھوئے حالات میں جب کہ قوم مغرب سے مرعوب ھو کر شدید ذھنی غلامی میں مبتلا ھو چکی تھی ایک ایسا علمی لائحہ عمل پیش کیا جس میں ایک طرف قدیم و جدید کی خوشگوار آمیزش تھی اور دوسری طرف علوم اسلامیہ کے احیاء کے ذریعے ملک میں ایک علمی اور ذھنی انقلاب پیدا کرنا تھا۔ حقیقت یہ ھے کہ شبلی جب ''اسکات المعتدی'' (شبلی کی ابتدائی زمانے کی کتاب جو انہوں نے وھابیوں کے خلاف لکھی تھی) کی بھول بھلیاں سے آزاد ھو کر سر سید کے زیر اثر آئے تو انہیں یہ محسوس ھوا کہ علماء شدید

بے علمی اور بے خبری کے گرداب میں پھنسے ہوئے ہیں۔ البتہ اس تاریکی میں انہیں جدید تعلیم یافتہ گروہ کے ماحول میں کچھ روشنی نظر آئی۔ چنانچہ شروع شروع میں وہ علی گڑھ کی زندگی سے کچھ مرعوب بھی ہوئے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"مجھ کو اس بات کا فخر ہے کہ اس نئی زندگی کے پیدا کرنے میں میرا بھی حصہ ہے اور اس جوش مذہبی کا برانگیختہ کرنا میری قسمت میں بھی" (مکاتیب ج ۱۔ ص ۵۰)،—! مثنوی صبح امید شبلی کی ابتدائی نظموں میں سے ہے۔ اس میں بھی جدید تعلیم کے متعلق حسن ظن کا اظہار ہے۔ لیکن تھوڑی ہی مدت کے بعد شبلی کو یہ محسوس ہؤا کہ تعلیم جدید اعلیٰ کیریکٹر کی تربیت نہیں کر سکتی۔ علی گڑھ سے اپنے ایک دوست کو لکھتے ہیں "یہاں آ کر میرے تمام خیالات مضبوط ہو گئے۔ معلوم ہؤا کہ انگریزی دان فرقہ نہایت مہمل فرقہ ہے۔ مذہب کو جانے دو۔ خیالات کی وسعت، سچی آزادی، بلند ہمتی، ترقی کا جوش برائے نام نہیں۔ یہاں ان چیزوں کا نام تک نہیں آیا بس خالی کوٹ پتلون کی نمائش گاہ ہے—" (مکاتیب۔ ج ۱۔ ص ۵۴)۔ یہی نہیں بلکہ نئی تعلیم یافتہ جماعت میں ایک اور مہلک مرض "ذہنی غلامی" کا مرض تھا۔ جس میں مبتلا ہو کر یہ لوگ یورپ کی ہر ادا پر جان دیتے تھے۔

نکتۂ شرع بافسانہ برابر ننہی
یورپ ارگپ زند آں نیز مسلم باشد
(شبلی)

شبلی نے ان حالات میں ایک نئی زندگی، ایک نیا طرز فکر، ایک نیا نصب العین قوم کے سامنے رکھا۔ وہ تھا قدیم و جدید میں خوشگوار پیوند قائم کرنا—! اس ماحول میں کھڑے ہو کر شبلی نے سوال کیا۔ "اگر آج ہمارے اسلاف ہوتے تو ہماری ضرورتوں کو کیسے پورا کرتے؟" اس کا جواب خود شبلی کی زبان سے سنئے:

"دولت عباسیہ کے وجود کے ساتھ جب نئی ضرورتیں پیدا ہوئیں تو دفعتاً ایک انقلاب ہو گیا۔ پہلے علماء نے یونانی سے

ترجمہ کیا پھر دوسرے گروہ نے ان نمونوں کو سامنے رکھ کر اسلامی علوم کے سادہ ایوان پر مینا کاریاں اور نقش آرائیاں کیں۔''

ان باتوں کے ساتھ علوم قدیمہ کی غلامی نہیں کی بلکہ جو کچھ کیا آزاد و خود مختار بن کر ، جو غلطیاں دیکھیں ان کی اصلاح کی ، جو فضول حصہ تھا اس کو الگ کر دیا۔''

آج بھی بعینہ وھی حالت ہے۔ یورپ نے علوم و فنون کا قالب بدل دیا۔ اگر آج اسلاف ھوتے تو وہ علوم و فنون جدید کو پیش نظر رکھ کر وھی کرتے جو انہوں نے علوم قدیمہ کے ساتھ کیا۔ علم کلام کو فلسفہ جدیدہ کے مقابلے میں مرتب کرتے ، تاریخ اور واقعہ نگاری کا انداز بدلتے۔ مسائل جدیدہ کو تحقیق کی نگاہ سے دیکھتے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تمام علوم و فنون کے متعلق قدیم و حال کی تحقیقات کا موازنہ کرتے اور دونوں کے عیب و ہنر دکھا کر فیصلہ کرتے کہ کیا چیزیں قابل قبول ھیں اور نئی تحقیقات کو علوم قدیمہ کے ساتھ کیونکر پیوند دیا جا سکتا ہے یا ان کے نمونے پر علوم قدیمہ کی روش کیونکر بدل سکتی ہے؟''

یہ سچ ہے کہ آج قوم میں غزالی اور رازی نہیں لیکن ان کی تصنیفات ھمارے لئے چراغ راہ بن سکتی ھیں۔ ان کی روشنی میں ہم اس قدر معلوم کر سکتے ھیں کہ نئے راستے میں کیونکر قدم اٹھانا چاھیے ، اور قدیم و جدید راھیں کہاں جا کر ملیں گی؟''

ان تمام رجحانات کو سر سید کی تحریک ترقی کا رد عمل قرار دیا جا سکتا ہے۔ سر سید اصولاً مغرب کے افکار جدید کے مخلص معتقد تھے۔ شبلی ان علوم سے اتنا ھی استفادہ کرنا چاھتے تھے جتنا بنو عباس کے زمانے کے علماء نے یونانی علوم سے کیا تھا — شبلی ''پرانی روشنی'' کو دوبارہ ضوافگن دیکھنا چاھتے تھے۔ ''نئی روشنی'' میں بیٹھ رھنا ان کا نصب العین نہ تھا۔ شبلی جدت کے منکر نہ تھے مگر روایات ماضی

کے والہ و شیدا بھی تھے ۔ سر سید کا راستہ ان کے راستے سے جدا تھا ۔ شبلی نے پرانے علوم اور قدیم طرز فکر سے ازسر نو دلچسپی پیدا کی اور مغرب کی اندھی تقلید اور کورانہ پیروی کے خلاف سخت احتجاج کیا ۔ وہ نئی زندگی کے داعی ہوئے مگر ایسی زندگی کے جس کی بنیادیں اپنی روایات پر قائم ھیں — شبلی اپنی صدی میں روایات قدیم کے غالباً سب سے بڑے اور سب سے پرجوش مبلغ تھے ۔ ان کے بعد روایات ماضی کے تقریباً سب علمبرداروں نے ان کی پیروی کی ۔ ان میں اکبر اور اقبال بھی شامل ھیں — انہیں ایک لحاظ سے سر سید کی عین ضد کہا جا سکتا ھے ۔ نظریہ و تصور میں بھی اور عمل میں بھی ! مگر ، حاشا اس سے یہ مراد نہیں کہ شبلی علوم مغرب کے مخالف تھے ۔ وہ یورپ کے علوم و فنون کے بڑے مداح اور خوشہ چین تھے مگر اندھے مقلد نہ تھے ۔ انہوں نے ایک موقع پر لکھا :

” ایک طرف تو ھمارے مولوی مسلمانوں کے کافر بنانے میں مصروف ھیں اور اس کام میں وہ کوشش کرتے ھیں جو صحابہ کافروں کو مسلمان بنانے میں کیا کرتے تھے ۔ دوسری طرف یورپ کی علمی فیاضیوں کا بادل عالم پر آب حیات برسا رھا ھے ۔ دنیا کے تمام قوموں کے مردہ علوم و فنون ، تاریخ اور یادگاریں زمین کے طبقے الٹ الٹ کر نکالے جا رھے ھیں اور دنیا کی نمائش گاہ ان گم شدہ جواھرات سے اس طرح سجا دی گئی ھے کہ گویا پچھلا اسی سر و سامان سے دوبارہ سامنے آ گیا ھے ۔“

شبلی نے اسی فراخ دلی سے مغربی علوم سے (جہاں تک ان کے لئے ممکن تھا) استفادہ کیا ۔ وہ ۱۸۸۲ء میں اپنے بھائی مہدی کو علی گڑھ کالج میں داخل کرانے کے لئے لے گئے تھے ۔ وھاں سر سید سے ملاقات ہوئی — اس وقت سے لے کر علی گڑھ کے زمانہ قیام کے آخر تک انہوں نے نئی طرز فکر کو سمجھنے کی کوشش کی ۔ وھیں آرنلڈ (آنکہ رفیق است وھم استاد مرا) سے رابطہ پیدا ہؤا ۔ سید کے کتب خانے سے فائدہ آٹھایا ۔ گبن کی تاریخ کا اردو ترجمہ یہیں دیکھا ۔ روم و شام کے سفر میں شبلی جدید اثرات سے اور بھی متاثر ہوئے ۔ اس کے علاوہ مصر سے ان کے علمی

تعلقات ہمیشہ قائم رہے - جہاں یورپ کی عمدہ کتابوں کے ترجمے عربی میں کئے جا رہے تھے - شبلی نے مصر کی اس علمی لہر سے بڑا اثر قبول کیا۔ جہاں مفتی محمد عبدہ اور علامہ سید رشید رضا قدیم و جدید کے درمیان پیوند قائم کرنے میں اس طرح منہمک تھے جس طرح شبلی ہندوستان میں تھے - شبلی نے کارلائل کی کتاب " ہیرو ......" کا عربی ترجمہ مصر سے حاصل کیا اور پڑھا اور کہا " — اچھا ترجمہ کیا ہے - میرے کام کی چیز ہے -" ایلیڈ کا عربی ترجمہ جو مصر میں شائع ہوتا ہے شبلی کی نظر سے گزرتا ہے - فرید و جدی کے ماہوار علمی رسالے سے بھی وہ باقاعدہ فائدہ اٹھاتے رہے - ان سب اثرات کے ماتحت شبلی مصر کی علمی تحریکوں کے علاوہ مغربی علوم کی روح سے بھی آشنا ہوتے رہے -

مغربی ادب سے استفادہ کی ایک سبیل یہ بھی تھی کہ وہ اپنے دوستوں اور شاگردوں کے ذریعے مطالب کا خلاصہ حاصل کر لیتے تھے - ان لوگوں میں مولانا حمید الدین ، مہدی اور جنید (آن کے بھائی) شیخ عبدالقادر سرفراز ، مہدی حسن ، سید نواب علی ، عطیہ فیضی ، سید سلیمان ، مولانا عبدالماجد نمایاں حیثیت رکھتے ہیں -

ان سب باتوں کے باوجود ، شبلی مقلد نہ تھے - وہ علوم اسلامیہ کے ماہر تھے اور قدرت کی طرف سے مجتہدانہ صلاحیتیں لے کر آئے تھے - میری رائے میں ان کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے قدیم علوم سے دلچسپی پیدا کی اور روایات تاریخ کو نئے ماحول میں زندہ کرتے ہوئے ہندوستان میں ایک زندہ اور جان دار علمی تحریک کی بنیاد رکھی —— نئی قومی زندگی کے پیدا کرنے اور اس کو صحیح تاریخی بنیادوں پر قائم کرنے میں شبلی کا بہت بڑا حصہ ہے اور ندوۃ العلماء اس کا بڑا مظہر ہے - ان کی علمی روایات کو ان کے رفقا نے ان کے بعد بھی زندہ رکھا - چنانچہ دارالمصنفین آج بھی زندہ ہے اور اس کا علمی سرمایا ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہے گا — اور ہاں ان کا وہ عظیم اسلوب بیان بھی جو ان کے بلند مطالب کا متحمل ہو سکا ان کے بقا اور دوام کا ضامن رہے گا -

شبلی اپنے مقصد میں کہاں تک کامیاب ہوئے اس کا جواب شاید

متنازع فیه ہے ۔ شبلی علماء کو اپنے مسلک پر نہ لا سکے اوران میں سے بہت کم لوگ زمانے کی ان قوتوں کا ادراک کر سکے جو سوچنے اور سمجھنے کے نئے طریقوں کو مرغوب عام بنا رہی تھیں — شبلی علماء میں مقبول نہ ہو سکے ۔ باقی رہے جدید تعلیم یافتہ حضرات سو انہیں شبلی کی ماضی پرستی سے قدرتاً کچھ دلچسپی نہیں ہو سکتی ۔ تحریک خلافت کے عارضی وقفے کے سوا شبلی نامقبول ہی رہے ۔ البتہ آردو ادب میں انہوں نے وہ مقام حاصل کیا جس میں ان کی یکتائی کو ان سے کوئی چھین نہیں سکتا ۔

۱۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو میرا مضمون "شبلی فکر جدید سے کیونکر روشناس ہوئے" اورینٹل کالج میگزین ۔

شبلی ایک پین اسلامسٹ

شیخ عطاء اللہ ایم - اے

سید سلیمان ندوی مرحوم نے ''مولانا کی سیاست'' کے زیر عنوان چند فقروں میں مولانا کی ملکی اور بین الاسلامی سیاست کا خلاصہ پیش کر دیا ھے - اور دونوں صورتوں میں اسباب و نتائج ایک ساتھ واضح طور پر بیان فرما دئے ھیں - سید صاحب فرماتے ھیں :

''سیاسیات کا باب مولانا کے قلم کا موضوع نہ تھا - تاھم وہ سیاسیات کے ھمیشہ دلدادہ رھے لیکن ان کی سیاسیات کا یہ رتبہ بھی حقیقت میں ان کے کلامیات ھی کی وسعت کا ایک جزو تھا - یعنی اسلام، اسلامی تمدن، اسلامی تاریخ، اسلامی علوم و فنون سے جو شیفتگی تھی اس کا فطری اقتضا یہ ھونا چاھئے کہ ان کو اسلام کی حکومت عزیز ھو اور جی چاھتا ھو کہ وہ کتابوں میں جس کی تصویر دیکھتے رھتے ھیں اس کو وہ مجسم بھی دیکھ سکتے - دوسری طرف چمن اسلام کے پھولوں کو جن گستاخ ھاتھوں نے نوچ ڈالا ان کی طرف سے ان کو پورا انحراف ھو - یہی ان کی سیاست تھی - ایک طرف وہ یورپ کی علمی سرپرستی کے لئے سراپا سپاس تھے دوسری طرف یورپ کی دستبرد سے ھمہ تن فریاد - اسی جذبہ نے ھندوستانی سیاست کی ایک شکل ان کے سامنے پیش کی اور وہ یہ کہ ملک ھندو مسلمان کا متحدہ وطن ھے لیکن اسلامی سیاسیات میں وہ پورے پین اسلامی تھے -''

پین اسلامی جذبہ کا تقاضا یہی ھے کہ مسلمانوں کو اگر کہیں گزند پہنچے تو ایک کے تلوے کے کانٹے کی خلش دوسرے کے جگر میں محسوس ھو اور اس کے مداوا کی کوشش کی جائے - اگر مسلمانوں کو کہیں کوئی نعمت میسر آئے اور کفر کے مقابلہ میں سر بلندی

نصیب ہو تو ہمارے دل مسرت سے لبریز اور ہمارے سر شکرانہ میں سجدہ ریز ہو جائیں - غلام قوموں کے لئے ایسے جذبہ اتحاد اسلامی کی پرورش باعث و بال ہو جاتی ہے- غیر قومی حکمرانوں نے مسلمانوں کے سینوں سے اس مقدس آسمانی و روحانی جذبہ کو چھیل دینے میں اُن کے سینے چاک کر دئے - لیکن یہ جذبہ ان کے ارواح و اذہان میں اسلام نے کچھ اس طرح سمو دیا ہے کہ مسلمانوں کے دل و دماغ سے کوئی چھری اسے چھیل نہ سکی اور کوئی چھلنی اسے نکال نہیں سکی اور حقیقت میں یہی جذبہ کفر و اسلام کی جنگ ہے - دو تین صدیوں سے اغیار اسی کوشش میں ہیں لیکن یہ نشہ دماغوں سے نکلتا نہیں - غیروں نے اس نشہ کے آتارنے کے لئے مسلمانوں میں وطن و قومیت کے خوبصورت بت تراشے اور اور ہر حیلے بہانے مسلمانوں کو ان بتوں کی پوجا پر مسائل اور اُن کی کرامت کا قائل کرنا چاہا ہے - اور اس طرح جذبہ پین اسلامی کو نقصان پہنچانے کی سر توڑ کوشش کی اور ایک حد تک مسلمان کو مصری ، ترکی ، ہندی ، افغانی ، عربی ہونے پر مائل کر دیا ہے - لیکن اسلامی ممالک کی حالیہ سیاسی آزادیاں اور خود مختاریاں اور وہ جذبہ اتحاد جو منشاء اسلام اور وہ سیاسی قوت اور استحکام جو اسلامی ممالک کو اس اتحاد سے حاصل ہو سکتا ہے حالات کی موجودہ مساعدت عالم اسلام کے اتحاد و یگانگت اور اسلام کی عالمگیر اخوت کی ہمہ گیر تشکیل کے لئے گلا پھاڑ پھاڑ کر دعوت دے رہی ہے - وہ لوگ کس قدر خوش نصیب ہوں گے جو ممالک اسلامیہ کے سیاسی اور معاشی اتحاد کو عملی شکل میں دیکھنے کی توفیق پائیں گے- کراچی سے کابل اور انقرہ تک ریل کی تعمیر کا اہتمام ہو رہا ہے - اسلامی ممالک ایک دن ایک ہی شہر کے محلے بن کر رہ جائیں گے اور خدا نے چاہا تو وہ ایک دوسرے کی مدد کو حسب ضرورت اسی طرح پہنچیں گے جس طرح حقیقی بھائی ایک دوسرے کی مدد کو لپک کر پہنچتے ہیں - ان سطور میں مختصر طور پر مولانا شبلی مرحوم کے اُن جذبات و اعمال کا تذکرہ کیا جائے گا جن کی بنیاد جذبہ اتحاد اقوام اسلام تھا -

ترکوں سے محبت :

اسلامی دور حکومت اور مسلمانوں کی خلافت کی یادگار آن کے زمانہ میں ترکی تھی ۔ ترکوں سے مولانا کو حد درجہ محبت تھی ۔ مولانا نے ۱۸۷۶ء کی جنگ روم و روس میں ترکوں کی اعانت کے لئے چندہ کیا پھر جب خود ترکی کا سفر اختیار کیا تو سلطان المعظم کو ان الفاظ میں خطاب فرمایا :

تازگی بدروحنین از تو ہست　　زیب و طراز حرمین از تو ہست
جز توکہ ہست اے شہ انجم سپاہ　　آنکہ بود شرع نبی را پناہ
فرہ دین نبی از تو ہست　　بازوے اسلام قوی از تو ہست

سلطان المعظم نے عطائے تمغہ مجیدہ سے سر فراز فرمایا تو انہیں گویا ہفت اقلیم کی شہنشاہی مل گئی ۔

۱۸۹۶ء میں مولانا نے آزاد اخبار لکھنو میں مسلہ آرمینیا پر ترکوں کے خلاف الزامات کی پر زور تردید کی جب کہ تمام ہندوستان یورپ کی دروغ بیانیوں کو اپنے ہاں اخبارات میں نقل کرکے فروغ دینے کی کوشش کر رہا تھا ۔

۱۹۰۸ء میں جب نوجوان ترکوں کے زیر قیادت سلطان عبدالحمید نے دستوریت کا اعلان کیا تو وہ خوشی سے اپنے آپ سے باہر تھے ۔ ایک ایک نوجوان ترک اور انجمن اتحاد و ترقی کے ایک ایک جانباز کی تعریفیں کرتے تھے ۔ سلطان عبدالحمید خاں کی اس معاملہ فہمی کی مدح کرتے تھے کہ ”محمد علی شاہ کجکلاہ ایران کی طرح اپنے ملک کو خانہ جنگی میں نہیں برباد کر دیا ۔“

اس زمانے میں عربی اخبارات بکثرت پڑھتے ، خود لطف اندوز ہوتے اور دوسروں کو اپنے حظ پایان میں شریک کرتے ۔

جنگ طرابلس :

سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں ”جب ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے طرابلس

الغرب پر حملہ کیا تو اُن کے دل کو ٹھیس سی لگی ۔ اس زمانہ میں اُن کا رہ رہ کر اضطراب اور باتوں باتوں میں شعلہ نفسی مجھ کو اچھی طرح یاد ہے ۔ ہر ہفتہ جب مصر کے عربی اخبارات آتے تھے تو ماسوا سے بے خبر ہو جاتے تھے اور ترک بہادروں کی جانبازی اور شجاعت کے قصے مزے لے لے کر بیان کرتے ، انور بے ، عزیز بے ۔ مصری اور اور دوسرے نوجوان ترک افسر جو اٹلی کی ناکہ بندیوں کے باوجود اپنی جان کو ہتھیلی پر رکھ کر چھپ چھپ کر طرابلس پہنچ رہے تھے اُن کی اس جوانمردی کے قصوں کو دھرانے میں اس بڑھاپے میں بھی اُن میں جوانی کی اکڑ پیدا ہو جاتی تھی ۔"

ٹرکی نے اٹلی سے اس شرط پر صلح کر لی کہ ترک طرابلس کو خود مختار بنا دیں اور وہ جس طرح چاہے اٹلی سے نپٹ لے ۔ مولانا نے ایک رات آٹھ نو بجے چند اونچے درجے کے شاگردوں کو طلب فرمایا ۔ اس طلبی کی علت و کیفیت سید سلیمان مرحوم کی زبان سے سنئے :

ہم لوگ بہ تمام عجلت پہنچے تو دیکھا کہ خود چٹائی پر لیٹے ہیں ، سامنے لیمپ ہے اور چاروں طرف عربی اخبار پھیلے ہیں ارشاد ہؤا " بھئی سنا ۔ بڑا مزا ہؤا ۔ عربی اخبار آئے ہیں ۔ ان میں انور بے وغیرہ کا اعلان ہے کہ وہ ٹرکی کی خدمت سے استعفا دے کر طرابلس میں اپنی حکومت بنائیں گے اور آخیر وقت تک اٹلی کا مقابلہ کریں گے ۔ اس خبر سے مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ بے اختیار ہنسنے کو جی چاہتا تھا ۔ مگر اکیلے ہنسے نہیں بنتا تھا ۔ اس لئے تم لوگوں کو بلوایا ہے ۔ یہ کہہ کر صندوقچہ سے روپے نکالے اور آدمی بھیج کر بازار سے مٹھائی منگائی ۔ خوشی اور مسرت کا یہ جلسہ دیر تک قائم رہا ۔ حالانکہ مولانا عموماً نو بجے سو جانے کے ہمیشہ سے عادی تھے ۔"[۸]

جنگ بلقان :

" ۱۹۱۲ء میں ٹرکی پر نئی مصیبت آئی ۔ جس سے ہندوستان کے

مسلمانوں کے دلوں میں ناسور پڑ گئے۔ اور ان کی آہ و بقا سے زمین و آسمان لرز اٹھے ۔ مولانا شبلی مرحوم نے 'شہر آشوب اسلام' کے نام سے غم و حسرت سے بھری ایک ایسی نظم لکھی جس نے اس حادثہ پر مسلمانوں کے دامن کو آنسوؤں سے تر کر دیا ۔ اور آج بھی جو کوئی اس کو سنے گا اس کی آنکھوں سے اشک غم کے چند قطرے بے اختیار نکل آئیں گے ۔''

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشان کب تک
چراغ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک

قبائے سلطنت کے گر فلک نے کر دئے پرزے
فضائے آسمانی میں اڑیں گی دھجیاں کب تک

مراکش جا چکا فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریض سخت جاں کب تک

یہ سیلاب بلا بلقان سے جو بڑھتا آتا ہے
اسے روکے گا مظلوموں کی آہوں کا دھواں کب تک

یہ سب ہیں رقص بسمل کا تماشا دیکھنے والے
یہ سیر ان کو دکھائے گا شہید نیم جاں کب تک

یہ وہ ہیں نالۂ مظلوم کی لے جن کو بھاتی ہے
یہ راگ ان کو سنائے گا یتیم ناتواں کب تک

کوئی پوچھے کہ اے تہذیب انسانی کے استادو
یہ ظلم آرئیاں تا کے یہ حشر انگیزیاں کب تک

یہ جوش انگیزی طوفان بیداد و بلا تا کے
یہ لطف اندوزی ہنگامۂ آہ و فغاں کب تک

یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانا ہے
ہماری گردنوں پر ہوگا اس کا امتحاں کب تک

نگارستان خوں کی سیر گر تم نے نہیں دیکھی
تو ہم دکھلائیں تم کو زخمہائے خونچکاں کب تک

یہ مانا گرمیٔ محفل کے ساماں چاہئیں تم کو
دکھائیں ہم تمھیں ہنگامۂ آہ و فغاں کب تک

یہ مانا قصۂ غم سے تمھارا جی بہلتا ہے
سنائیں تم کو اپنے درد دل کی داستاں کب تک

یہ مانا تم کو شکوہ ہے فلک سے خشک سالی کا
ہم اپنے خون سے سینچیں تمھاری کھیتیاں کب تک

عروس بخت کی خاطر تمھیں درکار ہے افشاں
ہمارے ذرہ ہائے خاک ہوں گے زرفشاں کب تک

کہاں تک لو گے ہم سے انتقام فتح ایوبی
دکھاؤ گے ہمیں جنگ صلیبی کا سماں کب تک

سمجھ کر یہ کہ دھندلے سے نشان رفتگاں ہیں ہم
مٹاؤ گے ہمارا اس طرح نام و نشاں کب تک

زوال دولت عثماں زوال شرع و ملت ہے
عزیز و فکر فرزند و عیال و خانماں کب تک

خدا را تم یہ سمجھے بھی کہ یہ تیاریاں کیا ہیں
نہ سمجھے اب تو پھر سمجھو گے تم یہ چیستاں کب تک

پرستاران خاک کعبہ دنیا سے اگر اٹھے
تو پھر یہ احترام سجدہ گاہ قدسیاں کب تک

جو گونج اٹھے گا عالم شور ناقوس کلیسا سے
تو پھر یہ نغمۂ توحید و گلبانگ اذاں کب تک

بکھرتا جاتا ہے شیرازہ اوراق اسلامی
چلیں گی تند باد کفر کی یہ آندھیاں کب تک

کہیں اڑ کر نہ دامان حرم کو بھی یہ چھو آئے
غبار کفر کی یہ بے محابا شوخیاں کب تک

حرم کی سمت بھی صید افگنوں کی جب نگاهیں هیں
تو پھر سمجھو کہ مرغان حرم کا آشیاں کب تک

جو هجرت کر کے بھی جائیں تو شبلی اب کہاں جائیں
کہ اب امن و امان شام و نجد و قیرواں کب تک

یہ نظم لکھنؤ کے ایک جلسہ میں جو ٹرکی کے لئے چندہ فراهم کرنے کی غرض سے منعقد هؤا پڑھی گئی - مولانا خود روئے اور دوسروں کو تڑپایا -

هندی مسلمانوں نے کوشش کی کہ حکومت برطانیہ مسلمانان هند کے احساسات کے احترام میں بلقانی ریاستوں کی سیاسی امداد سے باز رهے - حاکموں پر ان درخواستوں اور التجاؤں کا بھلا کیا اثر هوتا - دل شاهین نسوزد بهر آں مرغے کہ در چنگ است - اس پر مولانا نے فرمایا :

وہ کہتے هیں کہ هم کو پاس هے احساس مسلم کا
مگر اس کا اثر جو کچھ کہ هے هندوستاں تک هے

مگر هم کیا کریں اس کو کہ عالم گیر یہ ملت
عراق و فارس و نجد و حجاز و قیرواں تک هے

بعض سرکار پرستوں نے اس وقت حکومت برطانیہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کہا کہ ترکوں کی حکومت سے همیں کچھ واسطہ نہیں - اس پر مولانا نے فرمایا :

منافق هیں جو یہ کہتے هیں هم ترکوں سے یکسو هیں
یہ وہ الفاظ هیں جن کی جہانگیری زباں تک هے

همارا جوش اسلامی انہیں باور نہیں آتا
یہ انداز تغافل جلوہ گاہ امتحاں تک هیں

پڑا سوتا هے کوئی گنبد خضرائے یثرب میں
کہ جس کے بندہ فرماں زمین و آسماں تک هیں

کوئی جا کر یہ کہہ دے هم گنہگاروں کی جانب سے
کہ اب مسلم کی هستی تیرے الطاف نہاں تک هے

عشق و اضطرار یا غلبہ حال :

مسلمانان ہند کی سرگرمیوں نے عملی صورت اختیار کی - ۱۹۱۲ء کو ایک طبی وفد ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی سرکردگی میں ٹرکی بھیجا گیا - جس میں علی گڑھ کے جانفروش طلباء کے نمایندے بھی تھے - مولانا ایسے وفد کے ارکان سے بھلا کیوں نہ ملتے - ذیل کا واقعہ اس انتہائے عشق کا مظہر ہے جو مجاہدین اسلام کے خدمت گزاروں سے مولانا کو ہو سکتا تھا -

" ڈاکٹر صاحب اس وقت بالکل نوجوان تھے اور مولانا بوڑھے - اس پر بھی یہ منظر آنکھوں نے دیکھا کہ ڈاکٹر انصاری صاحب لکھنؤ ہو کر روانگی کے لئے دلی جا رہے ہیں - لکھنؤ کے اور چند ممتاز لوگ بھی الوداع کہنے کو موجود ہیں - گاڑی روانہ ہونے کو ہے ، مولانا پلیٹ فارم پر کھڑے ہیں -

ڈاکٹر صاحب ڈبہ کے دروازے پر کھڑے الوداعی سلام کر رہے ہیں کہ اس ہمہ تن علامہ وقت کا وہ سر جو بڑے بڑے جباروں کے سامنے بھی نہیں جھکتا تھا دفعتاً ڈاکٹر انصاری کے بوٹ پر جھک گیا - آنسوؤں نے اس کے گرد و غبار کو دھویا اور لب نے اس کے بوسے لئے - اور گاڑی اسلامی غیرت و حمیت کے ان گہرہائے گراں مایہ کو لے کر آگے بڑھ گئی - "

جب ڈاکٹر انصاری ٹرکی سے واپس پہنچے تو مولانا استقبال کو موجود تھے - پھر اسی پابوسی کے لئے بڑھے - ڈاکٹر انصاری نے معذرت چاہی تو فرمایا کہ یہ تمہارے پاؤں نہیں اسلام کے مجسمۂ غربت کے پاؤں ہیں - پھر ایک طویل پردرد استقبالی نظم پڑھی جس میں فرمایا :

تمہارا ناز آٹھائیں اہل ملت جس قدر کم ہے
کہ تم نے غازیان دین کی کی ہے ناز برداری

تمہارے سامنے موتی کی لڑیاں پوت سے کم ہیں
کہ دیکھ آئے ہو تم ترکی یتیموں کی گہر باری

نہیں ہے سوز اسلامی کا گو نام و نشاں باقی
تمہارے دل میں ہیں کچھ درد کی چنگاریاں باقی

جنون جوش اسلامی کوئی سمجھا تو تم سمجھے
کہ تم نے لیلیٔ اسلام کے مجنوں بھی دیکھے ہیں

سہارا ہے اگر امید کا اب بھی کوئی باقی
تو تم نے وہ رموز قوت مکنوں بھی دیکھے ہیں

عجب کیا ہے کہ یہ بیڑا غرق ہو کر پھر اچھل آئے
کہ ہم نے انقلاب چرخ گردوں یوں بھی دیکھے ہیں

مذہبی اجتہاد اور مجاہدین کی خدمت :

اسی زمانہ یعنی ۱۹۱۲ء میں مولانا نے فتویٰ دیا کہ عید قربان پر قربانی کے بجائے ان ترکوں کی حفاظت اور اعانت کے لئے (جنہیں مولانا نے خطاب کر کے فرمایا تھا) :

اے ترک، اے مجسمۂ کبریائے حق
اے وہ کہ جس پہ عالم ہستی کو ناز ہے

پشت و پناہ ملت ختم الامم ہے تو
تو آج زور بازوئے شاہ حجاز ہے

قربانی پر خرچ کرنے والی رقمیں دے دیں :

پہلی جنگ عالمگیر کا آغاز اگست ۱۹۱۴ء میں ہوا۔ نومبر میں ترک بھی جرمنوں کے ساتھ ہو گئے اور انگریزوں کی مخالفت میں اتر آئے۔ مولانا کو اللہ تعالیٰ نے آئندہ دردناک واقعات کے دیکھنے سے محفوظ رکھا۔ مولانا نے ۱۹۱۲ء میں جنگ بلقان میں لکھا تھا :

'منافق ہیں جو یہ کہتے ہیں ہم ترکوں سے یکسو ہیں۔' میرے

ذہن میں یہ مصرع اسی طرح محفوظ ہے ۔ غالباً زمیندار میں پوری نظم شائع ہوئی تھی اور اس زمانے میں اور مدتوں بعد پڑھے لکھے مسلمانوں کی زبان پر رہی ۔

مولانا کو بھی جیسا کہ حسب ذیل جگر خراش واقعہ سے معلوم ہوگا بستر مرگ پر — بسے نا دیدنی ہا دیدہ ام من ۔ کہنا پڑا ہوگا ۔ لیکن ان سے آنے والے بدتر حالات و واقعات سے مولانا کو تقدیر الٰہی نے بچا لیا ۔ سید سلیمان مرحوم لکھتے ہیں :

" ہر شہر کے پرانے وفادار مسلمانوں کی طرح اعظم گڑھ کے چند وفاداروں نے بھی ترکوں سے برأت کا اعلان مناسب سمجھا ۔ اور اس کے لئے قیامت یہ کی کہ خود شبلی منزل کو جلسہ کا مقام بنایا گیا ۔ جس کی مولانا کو خبر نہ تھی ۔ عین وقت پر جب وہ دوسرے کمرے میں موت کے بستر پر پڑے تھے ان کے بچپن کے ایک بے تکلف دوست ان کے پاس گئے " کہ آپ رضا مندی دیں تو جلسہ آپ کی صدارت میں ہو ۔" مولانا سن کر بے چین ہو گئے ۔ ان کی طرف منہ کر کے فرمایا :

" بھائی صاحب میں تو اپنے کو اس قابل بھی نہیں سمجھتا کہ ترک اپنی جوتیوں میں میری کھال کا تسمہ بھی لگائیں ۔" اور سید سلیمان نے خوب کہا ہے " یہ اس پر جوش عالم کی بین الاقوامی سیاست کا آخیر فقرہ تھا ۔"

آج اتحاد ممالک اسلامی کے لئے حالات جمال الدین افغانی ، شبلی اور اقبال کے زمانوں سے زیادہ سازگار ہیں ۔ اور اس کی ضرورت بھی زیادہ شدید ہوتی جا رہی ہے ۔ پاکستان اس سلسلہ میں کچھ نہ کچھ کوشش کر رہا ہے اور یہاں ایسے خیال کے لوگوں کی کمی نہیں ۔ دستور پاکستان میں اسلامی ممالک کے درمیان رشتہ اتحاد و اخوت کا قیام مسلک حکومت کے طور پر داخل کر لیا گیا ہے ۔ لیکن ضرورت 'حدی را تیز تر می خواں چوں محمل را گراں بینی' کی ہے آج ریڈیو نے فاصلوں کو مٹا دیا ہے ۔ ہمیں چاہئے کہ تمام اسلامی ممالک میں اپنے آدمی بھیجیں جو

وہاں کے حالات ہماری زبان میں وہاں کے ریڈیو پر نشر کرتے رہیں اور ایک ہفتہ وار رسالہ جو اتحاد اسلامی کا علم بردار ہو ' اتحاد اسلام ' یا ' عالم اسلام ' کے نام سے کراچی سے آردو میں ، تہران سے فارسی میں، انقرہ سے ترکی میں ، مکہ معظمہ سے عربی میں ' بیک وقت شائع ہو اور دنیائے اسلام کے متعلق اس میں ہر قسم کی خبریں ہوں تاکہ مسلمان ایک دوسرے کے حالات سے با خبر ہو کر متحد ہو سکیں اور ترقی کے میدان میں ایک دوسرے کے دلی معاون ۔ کاش پاکستان میں موٹی موٹی تنخواہیں پانے والوں کو ان چھوٹی چھوٹی باتوں کے سمجھنے اور ان پر عمل کرنے کی توفیق میسر آئے ۔

مولانا شبلی مرحوم کی بین الاقوامی سیاست کو شمالی ہند میں ان کے شاگرد فدائے ملت مولوی ظفر علی خاں اور اقبال نے خوب فروغ دیا۔ ظفر علی خاں جنگ بلقان کے زمانہ میں خود ٹرکی پہنچے ۔ سلطان المعظم کی خدمت میں ایک فارسی قصیدہ میں مسلمانان عالم کے اتحاد و اخوت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا :

پیام الفت از دہلی بہ استنبول آوردم
مثال بوئے گل هستم که بر دوش صبا باشد

اور اقبال نے اتحاد اسلامی کی اہمیت کو واضح اور دشمنان اتحاد اسلامی کے وطن و قومیت منصوبوں کو اپنی ایک رباعی کی گولہ باری سے درہم برہم کر دیا ۔ یہی رباعی آج اس کے لوح مرقد پر کندہ ہے ۔

نه افغانیم و نے ترک و تتاریم
چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیز رنگ و بو برما حرام است
که ما پروردۂ یک نو بہاریم

ملک میں ایک وزارت اتحاد ممالک اسلامیہ کے قیام کی ضرورت روز بروز شدید ہوتی چلی جاتی ہے کوئی ہے جو وقت کی اس آواز پر لبیک کہے اور دنیا و آخرت کی سرخروئی خرید لے ۔

شبلی

ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی

مولانا شبلی نے مذہبی ماحول میں آنکھیں کھولیں - والدین چونکہ نئے اثرات سے محفوظ تھے اس لئے انہوں نے اپنی پہلی اولاد کو علم دین کے لئے وقف کیا - قرآن مجید اور فارسی کی تعلیم حکیم عبداللہ اور مولوی شکر اللہ سے حاصل کی - مگر مولانا کی حقیقی تعلیم اس وقت شروع ہوئی جب مولوی محمد فاروق صاحب چریا کوٹی جو فلسفہ ، منطق ، ہندسہ اور فارسی ادب کے ماہر تھے - مولانا کے والد کے قائم کردہ مدرسہ عربیہ میں مدرس اول مقرر ہوئے اور مولانا نے ان کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا -

مولانا شبلی کی تعلیم میں منطق کی علمی مشق کی جو کوشش مولانا فاروق صاحب نے فرمائی اس کا اثر یہ ہؤا کہ وہ نہ صرف تحریر و تقریر بلکہ ہر مدعیانہ گفتگو میں منطقی ترتیب استدلال اور اصول مناظرہ کو پیش نظر رکھتے تھے - چنانچہ یہ رنگ ان کی طبیعت میں رچ گیا اور آخر دم تک قائم رہا -

شبلی مذہبی آدمی تھے - چنانچہ ان کی ابتدائی تصانیف ''ظل الغمام فی مسئلۃ القراۃ خلف الامام '' اور '' اسکات المعتدی '' اس کی شاھد ھیں کہ اگر وہ علی گڑھ نہ آئے ہوتے تو ان کی تصانیف کا کیا رخ ھوتا ؟

راقم کا خیال ھے کہ مولانا کا یہ رنگ ھمیشہ قائم رھا - البتہ علی گڑھ کے قیام اور زمانہ کے مذاق کے اثر سے صرف اس کی شکل تبدیل ھو گئی ھے - اس خیال کی تائید اس سے بھی ھوتی ھے کہ اس زمانہ میں مذہبی بحث و مناظرہ کے تین میدان تھے - (۱) عیسائی - (۲) شیعہ - (۳) اھل حدیث - اگر غور سے دیکھا جائے تو الکلام ، علم الکلام ، الفاروق

اور سیرۃ النعمان، انہی تینوں مباحث کی بدلی ہوئی اور شائستہ شکلیں ہیں۔

الکلام	عیسائیوں کے جواب میں
الفاروق	شیعوں کے جواب میں
سیرۃ النعمان	اہل حدیث کے مقابلہ میں

علم الکلام :

اسلام کے عقائد نہایت سادہ اور صاف ہیں ۔ صحابہ کرام جو کچھ رسول اللہ سے سنتے تھے یا آپ کو جو عمل کرتے دیکھتے تھے اس کی صحت پر ایمان رکھتے تھے ۔ اور بے چون و چرا اس پر عمل کرتے تھے ۔ گو بعض صحابہ اسلامی عقائد اور تعلیمات پر عقلی حیثیت سے بھی غور کرتے تھے ۔ لیکن عقل کو ان کی صحت کا معیار نہ بنایا تھا ۔ جو چیز عقلی حیثیت سے سمجھ میں نہ آتی اس پر ایمان کے لئے قول رسول کافی تھا ۔ لیکن جتنا زمانہ گزرتا گیا ایمان کی یہ قوت کمزور پڑتی گئی ۔ خصوصاً عباسی دور میں جب یونان اور ایران کا فلسفہ اور ان کے علوم عربی زبان میں منتقل ہوئے ۔ اور دوسری قوموں سے مسلمانوں کا ربط و ضبط بڑھا تو قدرتاً ان کے عقائد و خیالات سے متاثر ہوئے ۔ عباسی دور میں مختلف قوموں اور فرقوں کو مذہبی بحث و مناظرہ کی عام آزادی تھی۔ اس کے اثر سے مسلمانوں کے عقائد میں پہلی سی مضبوطی نہ رہی ۔ اس لئے نئے نئے مسائل اور فرقے پیدا ہوئے ۔ اس کے علاوہ مفتوح قوموں نے جو تلوار سے مسلمانوں کا مقابلہ نہ کر سکتی تھیں ان پر ذہنی اور دماغی حملے شروع کر دئے ۔ ان اسباب نے ضعیف العقیدہ مسلمانوں کے عقائد میں رخنہ پیدا کر دیا ۔ گو اس وقت آسانی سے ممکن تھا کہ حکومت کے زور سے نکتہ چینوں کی زبانیں بند کر دی جاتیں ۔ لیکن علمائے اسلام نے اس سے زیادہ موثر اور کارگر طریقہ اختیار کیا ۔ یعنی علاج بالمثل کے طریقہ سے فلسفہ کے اعتراضات کا رد فلسفہ ھی کے ذریعہ سے کیا ۔ خصوصاً معتزلہ نے جن کے عقائد کی بنیاد عقل پر تھی ۔ اسلامی عقائد کی حفاظت میں فلسفہ کا سنگین حصار قائم کر دیا ۔ اور عقلیت کا سیلاب اس سے ٹکرا

کر بکھر گیا۔

"انہیں معرکوں کے کارنامے ہیں جو آج علم کلام کے نام سے مشہور ہیں۔"

نئے علم کلام کی ضرورت :

زمانہ کی رفتار اور انسان کی ذہنی و دماغی ترقی کے ساتھ ساتھ اہل زمانہ کا مذاق اور رجحان بھی بدلتا رھتا ھے۔ عباسیوں کے زمانہ میں فلسفۂ یونان کا زور تھا اور ہر چیز اسی کے معیار سے جانچی جاتی تھی۔ اب زمانہ بہت آگے بڑھ گیا ھے۔ دنیا کی ذہنی اور دماغی سطح بہت بلند ہوگئی ھے۔ یونان کے قیاسی وظنی فلسفہ کی جگہ جدید فلسفہ و علوم نے جن کی بنیاد تجربات پر ھے لے لی ھے۔ اعتراضات اور ان کے جوابات کی نوعیت بدل گئی ھے۔ پہلے صرف چند مذہبی عقائد تک اعتراضات محدود تھے۔ اب اس کی زد میں مذھب کے ساتھ تاریخ، تہذیب، معاشرت، غرض قوم و مذھب کا پورا نظام زندگی آ گیا ھے۔ جس کے جواب کے لئے ایک جدید علم کلام کی ضرورت تھی۔ مولانا شبلی نے اس ضرورت کو بھی پورا کیا ھے۔ شبلی کی حیثیتیں اور کارنامے گونا گوں ہیں۔ وہ ادیب، انشاء پرداز، شاعر، مورخ، ناقد، معلم، سوانح اور سیرت نگار ہی نہیں ایک بلند مرتبہ متکلم بھی ہیں۔

جدید علم کلام پر تصانیف :

مغربی علوم اور مغربی تہذیب کا حملہ ساری دنیائے اسلام پر یکساں تھا۔ اس لئے مصر و شام پر ترکی وغیرہ کے زمانہ شناس علماء نے بھی جدید علم کلام کی ضرورت محسوس کی۔ اور اس کے مختلف پہلوؤں پر کتابیں لکھیں۔ ہندوستان میں سب سے پہلے سر سید رح اس طرف متوجہ ہوئے انہوں نے اسلامی عقائد اور تعلیمات کی تطبیق، اصول فطرت (NATURE) سے کرنے کی کوشش کی۔ جس کا نمونہ ان کی تفسیر ھے۔

مولانا شبلی نے جس وقت علم کلام کی طرف توجہ کی اس وقت ان کے سامنے دو نمونے تھے۔ ایک قدیم علم کلام کا نمونہ جس پر قدماء کی بکثرت

کتابیں موجود تھیں (لیکن جدید علوم نے پرانے فلسفے، ان کے اعتراضات اوران کے جوابات اور طریقہ استدلال کو بالکل بیکار کر دیا تھا۔) دوسرا نمونہ سر سید رح کے علم کلام کا تھا (اس میں یہ طریقہ اختیار کیا گیا تھا کہ جہاں اسلامی عقائد تعلیمات اور جدید علوم و فنون میں کوئی تعرض ہو وہاں اسلامی تعلیمات کو جس طرح ممکن ہو ان کے موافق بنایا جائے یا ان کی صحت سے انکار کر دیا جائے)۔ یہ طریقہ بھی مناسب نہ تھا۔ اس لئے کہ اس سے اسلام کا چہرہ کسی حد تک مسخ ہو جاتا تھا۔ اس لئے مولانا شبلی نے ان دونوں کے درمیان ایک تیسری راہ اختیار کی اور نئے علم کلام کو بھی بالکل اسی اصول پر مرتب کرنا چاہا جس اصول پر انہوں نے فن تاریخ کا ایک جدید خاکہ تیار کیا تھا۔ یعنی انہوں نے نئے علم کلام کو مرتب تو موجودہ مذاق اور موجودہ ضرورت کے لحاظ سے کیا لیکن بزرگان سلف کی محنتوں کو بھی ضائع ہونے نہیں دیا۔ اور وہ اس راہ میں جو کام کر گئے تھے اس کو انہوں نے نئے انداز سے پیش کیا۔ اس سلسلے میں شبلی نے پہلے علم کلام کی تاریخ لکھی تاکہ معلوم ہو جائے کہ ہر عہد میں علم کلام کی نوعیت کیا تھی اور اس میں کیا کیا ترقیاں اور تغیرات ہوئے۔ ہر دور میں اعتراضوں کی نوعیت کیا تھی اور ائمہ اسلام نے اس کے رد کا کیا طریقہ اختیار کیا۔

قدیم علم کلام کی بھی دو جداگانہ قسمیں تھیں۔ اور ان دونوں کے مقاصد بالکل الگ الگ تھے۔ ایک علم کلام تو وہ تھا جو فلسفہ کے مقابلے کے لئے ایجاد ہؤا۔ امام غزالی کے زمانہ تک دونوں بالکل الگ الگ رہے۔ امام صاحب پہلے شخص ہیں جنہوں نے ان دونوں کو آپس میں ملا دیا۔ امام رازی نے اس کو ترقی دی لیکن متاخرین نے اس قدر خلط مبحث کر دیا کہ فلسفہ، کلام، اصول، عقائد سب گڈمڈ ہو گئے۔ شبلی سے پہلے علم کلام کا یہی انداز قائم تھا۔

شبلی کی تجویز:

مولانا شبلی پہلے شخص ہیں جنہوں نے ان دونوں کو ایک دوسرے

سے الگ کر کے عقلی علم کلام کے نمونے پر نئے علم کلام کو مرتب کیا ۔ اس سلسلے میں پہلا سوال جو ان کے دل میں پیدا ہؤا یہ تھا :

قرآن مجید میں جو کچھ مذکور ہے اس کو بالکل عقل کے موافق ثابت کیا جائے ۔ مگر یہ آسان کام نہ تھا ۔ قدیم زمانہ میں بھی عقلی علم کلام کے بانیوں میں ابو مسلم اصفہانی ، ابوبکر اصم ، ابوالقاسم غنمی وغیرہ نے بالکل عقلی اصول کے مطابق قرآن مجید کی تفسیریں لکھی تھیں۔ اور ان اعتراضات کی تردید کی تھی جو معقول و منقول میں تطبیق دیتے تھے۔ عام طور پر اگرچہ یہ لوگ معتزلی اور بد عقیدہ سمجھے جاتے تھے ۔ تاہم امام رازی نے ان کے اس قسم کے اقوال تفسیر کبیر میں درج کر دئے ہیں ۔ اور بعض موقعوں پر انہیں سراہا بھی ہے چونکہ مولانا کے نزدیک یہی مسائل امام رازی کے اصل خیالات اور علم کلام کی جان ہیں ۔ اس لئے انہوں نے علم کلام کی تاریخ میں ان کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر جمع کیا ہے ۔

عقلی اصول پر علم کلام مرتب کرنے سے ایک فائدہ یہ ہؤا کہ وہ مسائل جو علم کلام کے دائرے سے خارج سمجھے جاتے تھے اور جن کی بنا پر مخالفین اسلام قرآن مجید یا اسلام پر اعتراض کرتے تھے ان کی تنقید بھی علم کلام کا ایک ضروری جزو قرار پائی ۔ اصل یہ ہے کہ عقلی علم کلام کے مخاطب دراصل معترضین اسلام ہیں ۔ امام غزالی ، امام رازی اور معتزلہ نے اسی گروہ کو مخاطب کیا ہے ۔ اور خود شبلی کے نزدیک بھی یہی ان کے مخاطب تھے ۔

علامہ شبلی نے جدید علم کلام میں اسلام کے اصلی عقائد و مسائل کے اثبات پر جو دلیلیں قائم کی ہیں وہ عام متکلمین کے دلائل سے مختلف ہیں ۔ متاخرین متکلمین کا یہ انداز تھا کہ وہ مسائل پر استدلال کا وہ طریقہ اختیار کرتے تھے جو زیادہ سے زیادہ پیچیدہ ہوتا تھا اور جس میں قدم قدم پر مشکلیں پیش آتی تھیں ۔ مولانا شبلی فطرتاً سادگی سلاست اور صفائی پسند کرتے تھے ۔ اس لئے متاخرین کا یہ طریقہ انہیں پسند نہ تھا۔ کیونکہ جدید عہد میں جس میں شبلی تھے تحریر کی صفائی کی دلیل کی وضاحت اور سلجھا پن سب سے ضروری چیزیں سمجھیں جاتی تھیں ۔

شبلی اس نکتہ کی ضرورت اور اھمیت سے پوری طرح واقف تھے - چنانچہ فرماتے ھیں :

> ”سب سے بڑی چیز یہ ھے کہ دلائل و براھین ایسے صاف اور سادہ پیرایہ میں بیان کئے جائیں کہ سریع الفہم ھونے کے ساتھ دل میں اتر جائیں - قدیم طریقہ میں پیچ در پیچ مقدمات منطقی اصطلاحات اور نہایت دقیق خیالات سے کام لیا جاتا تھا - اس طریقہ سے مخالف مرعوب ھو کر چپ ھو جاتا ھے - لیکن اس کے دل میں یقین اور وجدان کی کیفیت نہیں پیدا ھوتی -“
> (الکلام نقش چہارم صفحہ ۶)

شبلی کا کام آسان نہ تھا - ھندوستان میں عربی کی درسی کتابیں تو مل جاتی تھیں لیکن قدماء کی اھم تصانیف یا تو ملتی نہ تھیں اور اگر خال خال کہیں تھیں بھی تو عام طور پر ان کا علم نہ تھا - پھر وھاں تک رسائی ناممکن تھی - اس لئے شبلی علی گڑھ آنے سے پہلے یورپ کی شائع کردہ عربی کتابوں کے مطالعہ سے قبل اس قسم کا کوئی کام شروع نہ کر سکے - لیکن علم الکلام لکھتے وقت متکلمین کی قدیم تصانیف کو پیش نظر رکھنا ضروری تھا - اس لئے کہ ان میں بکثرت قرآن مجید سے استدلال ھوتا تھا -

شبلی کے کلام کا نمونہ :

شبلی نے خدا کے اثبات پر قرآن مجید کے استدلال کے طرز پر یہ دلیل قائم کی ھے کہ عالم کامل اور بے نقص ھے - موزوں و مرتب ھے - ایسے اصول اور ضوابط کا پابند ھے جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتے - یہ دلیل کا صغریٰ ھے ، کبریٰ خود ظاھر ھے - یعنی جو چیز کامل ، مرتب اور مستمر النظام ھوگی وہ خود بخود پیدا نہیں ھوگی بلکہ کسی صاحب قدرت اور صاحب اختیار نے اس کو پیدا کیا ھوگا - اس استدلال میں عالم کے حدوث و قدم کی کوئی بحث پیش نہیں آتی بلکہ عالم کو قدیم تسلیم بھی کر لیا جائے تب بھی یہ دلیل صحیح ھوگی - اس بناء پر

انھوں نے ملاحدہ کے اعتراضات کے جواب میں یہ تسلیم کر لیا ھے کہ عالم اجزائے دیمقراطیسی سے بنا ھے ۔ عالم قدیم ھے ۔ مادہ کے اجزا متحرک ھیں ۔ حرکت مادہ کی ذاتیات میں سے ھے ۔ مختلف قوانین قدرت ھیں جن کے موافق اجزاء باھم ملتے ھیں ، ترکیب پاتے ھیں اور پھر ان میں خاص خاص قویٰ اور خواص پیدا ھوتے ھیں لیکن اس پر بھی کائنات کا عقدہ حل نہیں ھوتا بلکہ ایک ایسے وجود کی اب بھی ضرورت پڑتی ھے جو ان تمام قوانین میں باھم توافق ، تناسب ، ربط اور اتحاد پیدا کر دے اور یہی معنی قرآن مجید کی اس آیت کے ھیں :

ولہ اسلم من فی السموات والارض طوعاً و کرھاً	زمین اور آسمان میں جو کچھ ھے سب اسی کا کہنا مانتے ھیں ۔ بہ جبر یا بہ خوشی ۔

لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں کہ وہ مادہ کو غیر مخلوق مانتے تھے ۔ قرآن و حدیث سے جو کچھ ثابت ھے وہ صرف یہ ھے کہ عالم خدا کا مخلوق ھے ۔ لیکن اس کے قدیم یا حادث ھونے سے بحث نہیں کرتا ۔

اس بناء پر اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ مولانا مادہ کو حقیقتاً مانتے ھیں ۔ تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اس کو غیر مخلوق بھی مانتے ھیں ۔

اسلامی عقائد میں سب سے اھم عقیدہ نبوت کا اثبات ھے اور اشاعرہ نے اس کو معجزہ کی دلیل سے ثابت کیا ھے ۔ مولانا اگرچہ معجزات کے منکر نہیں تھے اور خود الکلام میں انھوں نے اس پر مفصل بحث کی ھے اور عقلاً معجزات کے وجود کو ثابت کیا ھے تاھم نبوت کے اثبات کا یہ طریقہ چونکہ گوناگوں اعتراضات کا مورد تھا اور بالخصوص بدیہات کے دور میں جب معجزہ کے قائل بہت کم لوگ رہ گئے تھے ۔ اس لئے امام غزالی ، امام رازی ، ابن رشد اور شاہ ولی اللہ کی تصریحات سے نبوت کے ثبوت کے لئے ایسے طریقے اختیار کئے ھیں جن کے بعد

معجزات کی ضرورت باقی نہیں رھتی - نبوت کے ثبوت کے بعد رسول اللہ کی نبوت کو خاص طور پر ثابت کیا ھے :

" نبوت کی حقیقت معلوم ھونے کے بعد آنحضرت کا نبی ثابت ھونا ایک مذھبی مسئلہ رہ جاتا ھے -" نبی کی حقیقت جیسا کہ اوپر بیان ھو چکا ھے اجزائے ذیل سے مرکب ھے :

(۱) خود کامل ھو -

(۲) دوسروں کو کامل کر سکتا ھو -

(۳) اس کے علوم و معارف اکتسابی نہ ھوں بلکہ منجانب اللہ ھوں -

یہ تمام باتیں جس کمال کے ساتھ آپ کی ذات مبارک میں موجود ھیں کیا ابتدائے آفرینش سے آج تک اس کی نظیر مل سکتی ھے -

ان الفاظ کی بناء پر کون کہہ سکتا ھے کہ مولانا نبوت کو ایک کسبی چیز سمجھتے ھیں - یہ وہ عقائد ھیں جو قدیم علوم کلام کتابوں میں بھی مذکور ھیں - اس سے معلوم ھؤا کہ ان مسائل پر ان سے پہلے غور و فکر ھو چکا تھا - تاھم شبلی کی اھمیت بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی - ان کا کارنامہ یہ ھے کہ آنھوں نے جدید طریقہ پر پیش کیا ھے - اور ان کے متعلق جو معلومات محققین کی کتابوں میں منتشر تھیں ان کو خاص ترتیب کے ساتھ جمع کر دیا ھے -

شبلی نے الکلام میں جن مسائل سے بحث کی ھے حسب ذیل ھیں :

(۱) حقوق انسانی -

(۲) وراثت -

(۳) عورتوں کے حقوق -

(۴) اسلام ترقی اور تمدن کا مانع نہیں موید ھے -

(۵) دین و دنیا کا باھمی تعلق ، تعدد ازدواج ، غلامی اور جہاد پر آنھوں نے کچھ نہیں لکھا - لوگوں کا خیال ھے کہ اس سلسلے میں وہ

سر سید اور ان کے بعض رفقاء کی تحریروں کو کافی سمجھتے تھے - لیکن اس کا کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا -

شبلی کی یہ تصنیف (الکلام) بعض نقائص کے باوجود اردو میں اپنی قسم کی پہلی تصنیف ہے - ان مسائل کو سر سید کے سوا اور کسی مصنف نے اس طریقہ سے پیش نہیں کیا - لیکن سر سید کی تصنیفات پر ایک تو مذہبی نقطۂ نظر سے اعتراضات ہیں ، دوسرے ان کی تحریر ایسی رنگین اور لوچدار نہیں جیسے الکلام کی ہے - تعجب تو یہ ہے کہ الکلام کے بعد بھی کوئی دوسری کتاب اس سے بہتر تو کیا اس پائے کی بھی لکھی نہ جا سکی - شبلی کی تصنیف فرید و جدی کی کتاب سے ماخوذ سہی لیکن اس کے بعد بھی دنیا کے مختلف حصوں میں لوگوں نے ان مسائل کی تائید میں سوچا اور سمجھا ہوگا لیکن قدیم و جدید کسی طبقہ میں کوئی ایسا مصنف پیدا نہیں ہؤا جو خود اجتہاد نہ کر سکتا تو کم از کم کسی دوسرے ہی کے خیالات کو اپنا کر اپنی زبان میں ادا کر دیتا - شبلی نے جو کچھ کیا اس کا اعتراف نہ کرنا بڑی ناشکری ہے -

---

الکلام نقش چہارم صفحہ ۱۳۰ -

شبلی کی سیاسی شاعری

وقار عظیم

سیاست کی سر زمین بڑی خار زار اور سخت سنگلاخ ہے ۔ آدمی اس سر زمین میں قدم رکھے اور اس کا گریباں چاک اور دامن تار تار نہ ہو تو سمجھئے کہ ایک معجزہ ہے ۔ یہی حال سیاست کے شاطروں کا بھی ہے اور اس کے تماشائیوں کا ۔ سیاست کے تماشائی بھی اس کی عشوہ گری سے محفوظ نہیں رہتے ۔ یہی وجہ ہے کہ ادیب اور شاعر اس کوچے میں قدم رکھتے گبھراتے ہیں ، لیکن جب دیکھتے ہیں کہ سیاست کے تیر و سناں سے زندگی کا سینہ چھلنی ہو رہا ہے تو ان سے رہا نہیں جاتا ۔ وہ زخم خوردہ سینے پر مرہم بھی رکھتے ہیں اور تیر وسناں کے نشتروں کو کند کرنے کی تدبیریں بھی سجھاتے ہیں ۔ لیکن حق یہ ہے کہ ان دونوں مقصدوں میں کامیابی کسی کسی کو ہوتی ہے ۔ اکبر ، شبلی اور ظفر علی خاں بننا آسان نہیں ۔

اکبر ، شبلی اور ظفر علی خاں کی شاعری کا وہ حصہ جسے ہم سیاسی کہتے ہیں ، ہندوستان کی قومی زندگی کے ایک بڑے اہم دور کی خارجی اور داخلی کیفیت کا ترجمان ہے ۔ ان تینوں شاعروں نے البتہ اپنے اپنے مخصوص مزاج اور ماحول کے اعتبار سے جن موضوعات کو اپنے لئے خاص کیا ہے اور اسی مزاج اور ماحول کے فرق کی بنا پر اظہار کا جو اسلوب اور لہجہ اختیار کیا ہے اس نے تینوں کی سیاسی شاعری میں انفرادیت بھی پیدا کی ہے اور امتیاز بھی ۔

اکبر الہ آبادی نے اپنی سیاسی شاعری کو صرف ہندوستان تک محدود رکھا ہے ، لیکن ان کی وسیع النظری اور دور بینی سے ملکی سیاست کا کوئی رخ پوشیدہ نہیں رہا ، اور جو رخ ان کی نظر کے سامنے آیا اس کے متعلق ایسی گہری اور دو ر رس بات کہی کہ شاید اور کی

زبان سے اس طرح ادا نہ ہوتی ۔ اُن کے اسلوب کی بلاغت اور اُن کے کنائے کی لطافت و نزاکت جتنے وسیع مفہوم کا احاطہ کرتی ہے وہ سیدھی سادی روز مرہ میں ممکن نہیں ۔ وہ کوئی بات زور اور جوش سے نہیں کہتے ۔ اکبر کے بر خلاف ظفر علی خاں کی نظر ہندوستان پر بھی ہے اور ہندوستان کے باہر بھی اور اپنے عہد کی ملکی و غیر ملکی سیاست کا شاید ہی کوئی پہلو ایسا ہو جسے اُنھوں نے موضوع سخن نہ بنایا ہو اور یہ سب کچھ ایسے زور اور جوش کے ساتھ کہا گیا ہے کہ بجلی کی کڑک طوفانوں کی گمک اور زلزلوں کی دھمک اُس کے آگے ہیچ ہے ۔

شبلی کا اُسلوب ان دونوں سے مختلف بھی ہے اور مماثل بھی ۔ شبلی نے اپنی سیاسی نظر کو صرف ہند کی سر زمین تک محدود و مقید نہیں رکھا ، اُنھوں نے ہندوستان کی سیاست کے علاوہ دنیائے اسلام کے بعض اہم واقعات پر بھی نظمیں لکھی ہیں اور اُسلوب میں کہیں اُس جوش و خروش سے کام لیا ہے جو ظفر علی خاں کا امتیاز ہے کہیں اُس دھیمے پن کو اپنایا ہے جو اکبر کے طرز کی خصوصیت ہے ، لیکن شبلی کا کمال یہ ہے کہ وہ حسب محل اپنے بیان کی لے کو کبھی دھیما اور کبھی تیز کرکے اُس میں ایک ڈرامائی کیفیت پیدا کرتے ہیں اور یہ کیفیت کم و بیش اُن کی ہر نظم میں ہے ۔

اکبر نے ہندوستان سے باہر کے جس موضوع پر قلم اُٹھایا ہے وہ طرابلس و بلقان کی جنگ ہے ۔ بیسویں صدی کے شروع میں دنیائے اسلام کی یہ جنگ حقیقت میں ایک ملک کے مسلمانوں کی نہیں بلکہ ساری دنیا کے مسلمانوں کی جنگ تھی اور دنیا کا ہر مسلمان سمجھتا تھا کہ اس جنگ میں ترکی کی جیت پوری دنیائے اسلام کی جیت اور ترکی کی ہار پوری دنیائے اسلام کی ہار ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ جنگ بلقان چھڑی تو ہندوستان کے مسلمانوں نے یہ محسوس کیا کہ دشمن نے اُن کی سر زمین پر حملہ کیا ہے ۔ ترکوں کے زخم کو ہر ہندی مسلمان اپنے دل کا زخم سمجھتا اور اُس پر مرہم رکھنے کے لئے بے قرار نظر آتا تھا ۔ اس زمانے میں مولانا شبلی نے کئی نظمیں لکھیں جن میں اس جنگ کے مختلف پہلوؤں کو ایک

مؤرخ ، ایک صاحب بصیرت سیاست داں اور ایک درد مَند مسلمان کی نظر سے دیکھا اور انھیں ایک شاعر کی طرح لفظوں کا لباس پہنایا -

کلیات شبلی میں اس موضوع سے متعلق ۶ نظمیں ھیں - ۳ نظمیں تو حقیقت میں مختصر قطعات ھیں - ان میں سے ایک میں شبلی نے ترکوں کو فتح ایڈریانوپل پر مبارک باد دی ھے - پانچ شعروں کے اس مختصر قطعے میں مسلمانوں کا یہ نقطۂ نظر اور جذبہ سامنے آتا ھے کہ ترکوں کی فتح و ظفر کے ساتھ ساری دنیائے اسلام کی فتح و ظفر وابستہ ھے - قطعہ یہ ھے ؎

اے ترک ! اے مجسمۂ کبریائے حق
اے وہ کہ جس پہ عالم ھستی کو ناز ھے
پشت و پناہ ملت خیرالامم ھے تو
تو آج زور بازوئے شاہ حجاز ھے
رنگیں ھے تیری تیغ سے ھر صفحۂ وجود
مغرب ترا ھی عرصہ گہ ترک تاز ھے
تو نے دکھا دیا کہ تری تیغ جاں فشاں
اب بھی فنائے دشمن ھستی کا راز ھے
رنگیں جو ھے مرقع عام کا ھر ورق
شمشیر تیری خامۂ رنگیں طراز ھے

اس قطعے کا دوسرا شعر اس عالم احساس کا ترجماں ھے جس کی روح شبلی کی ان نظموں میں جاری و ساری ھے - باقی شعروں پر شبلی کے شاعرانہ مزاج کا عکس صاف نظر آ رھا ھے - دوسرا قطعہ ’’ ھستیٔ علم کی رھائی ‘‘ چھ شعروں کا ھے اور برطانیہ کے اس دعوے کی تردید ھے کہ وہ اسلام کا دوست ھے - اس تردید میں بھی شبلی نے ملت اسلامی کے عالمگیر رشتۂ اخوت کی طرف اشارہ کر کے ترکی کے مسئلے کو سب مسلمانوں کا مسئلہ اور بلقان کی جنگ کو سب مسلمانوں کی جنگ کہا ھے - اس قطعے کے ابتدائی دو شعر یہ ھیں :

وہ کہتے ہیں کہ ہم کو پاس ہے احساس مسلم کا
مگر اس کا اثر جو کچھ ہے بس ہندوستاں تک ہے

مگر ہم کیا کریں اس کو کہ عالمگیریٔ ملت
عراق و فارس و نجد و حجاز و قیرواں تک ہے

چوتھے شعر میں جذبے کے خلوص اور جوش نے جو آمد پیدا کی ہے وہ بڑی موثر اور دل دوز ہے ؏

ہمارا جوش اسلامی انہیں باور نہیں آتا
یہ انداز تغافل جلوہ گاہ امتحاں تک ہے

تیسرا قطعہ بھی چھ شعر کا ہے اور اس میں ایک شخص کی پردہ دری کی گئی ہے جس نے ایک گمنام وفادار کے نام سے مسلمانوں کے عام خیالات کی مخالفت کی تھی - یہ قطعہ سیدھا سادا ہے اور شبلی کی شاعری کی عام خصوصیات اس میں بھی موجود ہیں -

لیکن حقیقت میں شاعر کے دل کا درد ان کی طویل تر نظموں میں ابھرتا ہے اور وہاں وہ اپنے دل کی بات کھل کر اور آزادی سے کہتے ہیں - ان تین نظموں میں پہلی نظم "شہر آشوب اسلام" ہے ، جسے شاعر نے ہنگامۂ طرابلس و بلقان ، کا ضمنی عنوان دیا ہے - شاعر نے نظم کو خیال کی رو کے لحاظ سے پانچ ٹکڑوں میں تقسیم کیا ہے - پہلے ٹکڑے میں (جسے بند میں نے دانستہ نہیں کیا) چھ شعر ہیں جن میں شاعر نے اپنے جذبے کو دھیمے دھیمے جوش کے ساتھ ایسے صاف اور سلجھے ہوئے لفظوں میں بیان کیا ہے جن میں جا بجا شاعرانہ روایت کی رنگینی نے لطف بھی پیدا کیا ہے اور تاثیر بھی - شعروں میں شروع سے آخر تک ایسی روانی ہے کہ پڑھنے اور سننے والا اس کی رو میں بہتا اور شاعر کا ہم نوا بنتا ہے اور نظم کے اگلے حصوں کے لئے اس کے دل میں ایک ایسا شوق پیدا ہوتا ہے جس کی حدیں بے تابی سے ملتی ہیں - نظم کے ان تمہیدی شعروں کا وہ جوش جس میں اعتدال بھی ہے اور نرمی بھی شبلی کے طرز شاعری کی وہ خصوصیت ہے جو انہیں دوسرے سیاسی شاعروں سے

الگ کرتی ہے لیجئے اب وہ چھ شعر سنئے:

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک
چراغ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک

قبائے سلطنت کے گر فلک نے کر دئے پرزے
فضائے آسمانی میں اڑیں گی دھجیاں کب تک

مراکش جا چکا، فارس گیا، اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریض سخت جاں کب تک

یہ سیلاب بلا بلقان سے جو بڑھتا آتا ہے
اسے روکے گا مظلوموں کی آہوں کا دھواں کب تک

یہ سب ہیں رقص بسمل کا تماشا دیکھنے والے
یہ سیر ان کو دکھائے گا شہید نیم جاں کب تک

یہ وہ ہیں نالۂ مظلوم کی لے جن کو بھاتی ہے
یہ راگ ان کو سنائے گا یتیم ناتواں کب تک

ان شعروں میں الفاظ کی درو بست، ان کی صوتی اہمیت اور آہنگ اور ان کی معنوی نزاکتوں سے جوکام لیا گیا ہے اس سے قطع نظر ہر شعر کے ساتھ خیال کی رفتار اور احساس اور جذبے کی گرمی میں جو اضافہ ہؤا ہے اس سے شاعر اور اس کے مخاطب کے درمیان ایک جذباتی ربط قائم ہو جاتا ہے اور وہ بھی شاعر کی ظالم و مظلوم کے درمیان امتیاز کر کے ایک کی طرف محبت اور دل سوزی کا تحفہ لے کر بڑھتا ہے اور دوسرے پر قہر و نفرت کی نظر ڈالتا ہے۔ آخری تین شعروں میں محض الفاظ کے موزوں استعمال سے شاعر اپنے اس مقصد میں جس طرح کامیاب ہؤا ہے اسے محض اتفاق نہیں کہا جا سکتا۔ یہ یقیناً اس کی شاعرانہ بصیرت کا کرشمہ ہے۔ آخری تین شعروں میں یہ 'سیلاب بلا' یہ 'سب ہیں' اور یہ 'وہ ہیں' کے ٹکڑوں سے ظلم و جبر کے جن قافلہ سالاروں کی طرف اشارہ ہے، اگلے ٹکڑے (یا بند) میں شاعر ان سے براہ راست مخاطب ہوتا ہے اور اپنے قاری کی پوری ہم نوائی کے یقین اور سہارے پر اپنے

مخلصانہ جوش کو ذرا اور ڈھیل دیتا ہے۔ اگلا بند اس طرح شروع ہوتا ہے ء

کوئی پوچھے کہ اے تہذیب انسانی کے استادو!
یہ ظلم آرائیاں تا کے یہ حشر انگیزیاں کب تک

یہ جوش انگیزیٔ طوفان بیداد و بلا تا کے؟
یہ لطف اندوزیٔ ہنگامۂ آہ و فغاں کب تک

تہذیب انسانی کے استادو! میں طنز کی جو تیزی و تلخی، اور آنے والے تین مصرعوں میں استفہام کی جو عبرت خیز اور عبرت انگیز بے باکی ہے اور پھر آخری دو مصرعوں میں لفظوں کے رواں دواں قافلے کو عطف و اضافت کے رشتے میں جوڑ کر جس طرح جذبے میں ترتیب و تنظیم پیدا کی گئی ہے اس سے نظم میں ابھار اور اٹھان کی وہ کیفیت پیدا ہو گئی ہے جس کے بغیر کوئی خیال پوری طرح موثر نہیں بنتا۔ تاثیر کے اس ڈرامائی حربے سے فائدہ اٹھا کر شاعر پورے جوش سے لیکن جچے تلے قدموں کے ساتھ آگے بڑھتا ہے اور بالکل ایک ہی لہجے میں ایک ہی لے اور آہنگ کے ساتھ پے درپے کئی سوال کر ڈالتا ہے ء

یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے
ہماری گردنوں پر ہوگا اس کا امتحاں کب تک؟

نگارستان خوں کی سیر گر تم نے نہیں دیکھی
تو ہم دکھلائیں تم کو زخم ہائے خوں چکاں کب تک؟

یہ مانا گرمیٔ محفل کے ساماں چاہئیں تم کو
دکھائیں ہم تمہیں ہنگامۂ آہ و فغاں کب تک؟

یہ مانا قصۂ غم سے تمہارا جی بہلتا ہے
سنائیں تم کو اپنے درد دل کی داستاں کب تک؟

یہ مانا تم کو شکوہ ہے فلک سے خشک سالی کا
ہم اپنے خون سے سینچیں تمہاری کھیتیاں کب تک

عروس بخت کی خاطر تمہیں درکار ہے افشاں
ہمارے ذرہ ہائے خاک ہوں گے زرفشاں کب تک؟

نظم کے ان چھ شعروں میں ''تہذیب انسانی کے اُستادوں'' کے سامنے اُن کی عشوہ گری کی جو پردہ دری جس تلخی و تندی سے، لیکن جس حقیقت پسندانہ انداز میں کی گئی ہے اُس کے آگے ''ظلم و جبر'' کی زبان کے لئے خاموشی و بے زبانی کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ ظالم خاموش ہے، لیکن اُس کی خاموشی احساس جرم یا پشیمانی کے سبب نہیں محض مصلحت بینی کا کرشمہ ہے، اور مظلوم کے غم میں اُن کی وکالت کرنے اور اس کی آہوں کے دھویں میں اپنی آہوں کی چنگاریاں شامل کرنے والا شاعر جب طنز کے تیر و نشتر کی بوچھار کر چکتا ہے تو اُس کی حقیقت بیں اور حقیقت شناس نظر ماضی کے دھندلکوں میں جھانکتی اور غم کے احساس سے نڈھال ہو کر لہجے کی طغیانی میں ہمواری پیدا کر لیتی ہے اور بات اس طرح ختم ہوتی ہے۔

کہاں تک لو گے ہم سے انتقام فتح ایوبی
دکھاؤ گے ہمیں جنگ صلیبی کا سماں کب تک
سمجھ کر یہ کہ دھندلے سے نشان رفتگاں ہیں ہم
مٹاؤ گے ہمارا اس طرح نام و نشاں کب تک؟

شبلی شاعر ہیں اور شاعر کے دل درد مند کے ساتھ ساتھ خدا نے زبان گویا بھی عطا کی ہے اس لئے جو دل پر گزرتی ہے اُسے بے تکلفی اور بے باکی سے، لیکن شاعرانہ حد بندیوں میں رہ کر موثر انداز میں کہہ گزرتے ہیں، لیکن اُن کی نظر مؤرخ کی نظر ہے اور مؤرخ کو جب حال میں کچھ نظر آتا ہے تو وہ اسے ماضی کا عکس سمجھتا اور پھر ماضی اور حال کے اس تصور سے مستقبل کا نقش بناتا ہے اور پھر مستقبل کی یہ جھلک دکھا کر اپنے مخاطب کو ایسے راستے پر لانے کی کوشش کرتا ہے جو اُس کے نزدیک سیدھا اور سچا ہے اور جس پر چلے بغیر آدمی منزل مقصود پر نہیں پہنچ سکتا۔ چنانچہ نظم کے باقی حصوں میں اُن کا تخاطب مسلمانوں سے ہے۔ ان شعروں میں وہ مسلمانوں کو آنے والے خطروں سے آگاہ کرتے ہیں جن سے بے خبر رہنے اور جن کی طرف سے آنکھیں

بند کر لینے کا نتیجہ سوائے تباہی و بربادی کے کچھ نہیں - یہاں بھی بات پہلے بڑے نرم اور دھیمے انداز اور مشفقانہ لہجے میں شروع ہوتی ہے ؎

زوال دولت عثماں زوال شرع و ملت ہے
عزیزو! فکر فرزند و عیال و خاں و ماں کب تک

خدا را تم یہ سمجھے بھی کہ یہ طیاریاں کیا ہیں
نہ سمجھے اب تو پھر سمجھو گے تم یہ چیستاں کب تک

ان دو شعروں کے بعد حسب معمول رفتار ذرا اور تیز ہو جاتی ہے کہ اس کے بغیر بات موثر نہیں بنتی اور اس وقت پھر اُن سب حربوں سے کام لیا جاتا ہے جنہیں شبلی نے اپنے اسلوب اظہار کا وسیلہ بنایا ہے — طنز کے نشتر ، شاعرانہ اشاروں اور کنایوں کی معنویت ، الفاظ کی صوتی اور معنوی اہمیت ، ترکیبوں کی موزوں ترتیب و درو بست ، اور حسب ضرورت لہجے کا آتار چڑھاؤ - آخر کے چھ شعروں میں سے صرف دو سن لیجئے ؎

کہیں اُڑ کر نہ دامان حرم کو بھی یہ چھو آئے
غبار کفر کی یہ بے محابا شوخیاں کب تک

حرم کی سمت بھی صید افگنوں کی جب نگاہیں ہیں
تو پھر سمجھو کہ مرغان حرم کے آشیاں کب تک

جنگ بلقان کے بعض دوسرے پہلوؤں سے تعلق رکھنے والی اگلی دو نظموں میں بھی شبلی کا انداز فکر اور انداز بیان کہ یہ دونوں چیزیں اُن کے مخلصانہ جذبے اور اُن کے درد مندانہ احساس کی تخلیق ہیں اس طرح سامنے آتا ہے جیسے ”شہر آشوب اسلام“ میں - پہلی نظم جس کا عنوان ”خیر مقدم ڈاکٹر انصاری“ ہے اس وقت لکھی گئی تھی (اور بمبئی کے ایک جلسے میں پڑھی گئی تھی) جب ہندوستانی طبی وفد بلقان سے واپس آیا تھا - نظم کے پہلے بند کی ابتدا اس شعر سے ہوتی ہے کہ :

ادا کرتے ہیں ہم شکر جناب حضرت باری
کہ آئے خیریت سے ممبران وفد انصاری

نظم کے اس بند میں (جس میں ۱۳ شعر ہیں) ممبران وفد کی خدمت گزاری ، غم خواری اور اسلامی دردمندی کی تعریف کی ہے اور اُنہوں نے اس موقع پر ہنسی خوشی جو جو تکلیفیں جھیلیں اُنہیں اُن کے سچے جذبۂ اسلامی کا اثر بتایا ہے اور اسے ایسی سعادت بتایا ہے جو کسی کو خواب میں بھی نصیب نہیں ہو سکتی ۔ اس بند میں سب باتیں بڑے محبت بھرے اور مشفقانہ انداز میں کہی گئی ہیں ۔ بند کا لہجہ شروع سے آخر تک دھیما اور نرم ہے اور اس میں خیال کے اظہار کے لئے جابجا شاعرانہ رعایتوں سے کام لیا گیا ہے ۔ ان سب اشعار میں جو چیز حرف حرف پر چھائی ہوئی نظر آتی ہے وہ شاعر کا خلوص ہے ۔ یہ بند اس شعر پر ختم ہوتا ہے ء

نہیں ہے سوز اسلامی کا گو نام و نشاں باقی
تمہارے دل میں ہیں کچھ درد کی چنگاریاں باقی

اور اس شعر کے بعد دوسرا بند اسی جوش و خروش کےساتھ شروع ہوتا ہے جو شبلی کے جوش اسلامی نے اُن کی سب نظموں میں کہیں نہ کہیں ضرور پیدا کر دیا ہے ۔ نظم کے پہلے بند میں رفتار کا جو دھیما پن تھا وہ دوسرے بند میں اک بارگی تیز ہو جاتا ہے اور جب وہ تیز ہوتا ہے تو بیان کی صاف گوئی اور بے باکی ، طنز کی نشتر زنی اور تغزل کی اثر انگیزی پڑھنے والوں کو اپنی رو میں بہاتی چلی جاتی ہے ۔ اس بند کا پہلا شعر یہ ہے ء

مسلمانوں کے تم نے طالع واژوں بھی دیکھے ہیں
نئے سب انقلاب گردش گردوں بھی دیکھے ہیں

اور بیچ بیچ میں اس طرح کے شعر آتے ہیں :

یتیموں کے سنے ہیں نالہ ہائے جاں گزا تم نے
زنان بے نوا کے چہرۂ محزوں بھی دیکھے ہیں

گھروں کو لوٹنے کے بعد زندوں کو جلا دینا
بلاد مغربی کے یہ نئے قانوں بھی دیکھے ہیں

نگار آرائیاں دیکھی ہیں چشم گوہر افشاں کی
شہیدان وفا کے عارض گلگوں بھی دیکھے ہیں

تمھیں سے کچھ پتہ ملتا ہے شیدایان ملت کا
کہ تم نے شاید اسلام کے مفتوں بھی دیکھے ہیں

جنون جوش اسلامی کوئی سمجھا تو تم سمجھے
کہ تم نے لیلیٰ اسلام کے مجنوں بھی دیکھے ہیں

اور نظم آمید کی اس لے پر تمام ہوتی ہے ء

عجب کیا ہے یہ بیڑا غرق ہو کر پھر اچھل آئے
کہ ہم نے انقلاب چرخ گردوں یوں بھی دیکھے ہیں

دوسری نظم سر آغا خاں کا خطاب (ترکوں سے) اس موقع پر لکھی گئی تھی جب جنگ بلقان کے زمانے میں سر آغا خاں نے ترکوں کو یہ مشورہ دیا کہ وہ یورپ چھوڑ کر ایشیا چلے جائیں نظم کے دو بندوں میں سے پہلا بند فارسی میں ہے اور دوسرا آردو میں اور طنز کی تیزی و تلخی کا بڑا اچھا نمونہ ہے ۔ بند میں شروع سے آخر تک ایسی روانی اور شعروں میں ایسا تسلسل ہے کہ ان میں سے ایک کو بھی الگ نہیں کیا جا سکتا ۔ نظم پہلے شعر سے جس لہجے میں شروع ہوتی ہے وہ برابر آبھرتا اور ترقی کرتا رہتا ہے اور بالآخر بڑے ڈرامائی انداز میں حافظ شیرازی کے ایک شعر پر اس طرح ختم ہوتا ہے جیسے لسان الغیب نے یہ شعر اسی موقع کے لئے کہا تھا ۔ بند کا شاعرانہ لطف اور اس کے خیال کی تاثیر سب شعر پڑھے اور سنے بغیر پوری طرح سامنے نہیں آتی اس لئے یہ شعر شروع سے آخر تک سن لیجئے ء

ترک سے حضرت آغا نے یہ ارشاد کیا
کیوں ہو بے فائدہ یورپ میں گرفتار الم ؟

ایشیا میں اگر آجاؤ تو پھر تا بہ ابد
پاؤں پھیلا کے بڑے چین سے سوؤ گے چہ غم ؟

نظر آجائے گی بے کاری آلات جدید
جب کہ تم وادیٔ تاتار میں رکھو گے قدم

ریل کی یا تار کی پھر ہوگی نہ حاجت تم کو
ڈاک پہنچانے کو آجائیں گے مرغان حرم

خود ہی کہہ دو گے کہ بے کار ہیں سب تیر و تفنگ
نظر آئے گا جو تیر افگنوں کا عالم

سلک بحری کی ادا دل سے اتر جائے گی
دیکھ لو گے جو کمندوں کا وہ پیچ اور وہ خم

فائدہ کیا ہے کہ تم ریل کا احسان اٹھاؤ
آپ کا اسپ سبک سیر ہے کس بات میں کم ؟

آپ صحرا میں چلائیں گے جو خشکی کا جہاز
پھر نہ کچھ بھاپ کی حاجت ہے ، نہ طوفان کا غم

لطف جو بانگ جرس میں ہے وہ سیٹی میں نہیں
زین کو کہہ نہیں سکتا کوئی هم پایۂ بم

لمپ کی شعلہ فشانی میں کہاں وہ انداز ؟
شمع کی بزم طرازی کا جو کچھ ہے عالم

فیصلہ بیٹھ کے چوپال میں کر دے گا جو پنچ
ہوگا یورپ کے قوانین سے بڑھ کر محکم

اور مانا بھی کہ فردوس بریں ہے یورپ
حضرت. خواجۂ شیراز یہ کرتے ہیں رقم

پدرم روضۂ رضواں بد و گندم بفروخت
نا خلف باشم اگر من بہ جوے نفروشم

جنگ بلقان پر شبلی نے جتنی نظمیں لکھی ہیں ان میں طنز کی شوخی ، تغزل کی رنگینی ، الفاظ کی موزونیٔ ترتیب ، لہجے کا آتار چڑھاؤ اور خلوص سے پیدا ہونے والی بے خوفی ، بے باکی اور صاف گوئی ہر جگہ

موجود ہے لیکن یہ تمام اوصاف اُن نظموں میں زیادہ نکھرے ہوئے انداز اور زیادہ موثر اسلوب سے نمایاں ہوتے ہیں جو شبلی نے مسلم لیگ کی سیاست پر لکھی ہیں۔ طنز شبلی کے اظہار خیال کا عام حربہ ہے جس میں مناسب موقعوں پر اُن کے تغزل سے زیادہ تیزی اور تاثیر ملی ہے لیگ کی نظموں میں اپنا پورا وار کرتا ہے۔ اس موضوع پر کلیات نظم شبلی میں جتنی نظمیں ہیں اُن کے جستہ جستہ حصے ملاحظہ فرمائیے:

ایک نظم کے ابتدائی چند شعروں میں لیگ کے عظمت و جبروت کے ذکر کے بعد یہ کہا گیا ہے کہ اُس پر گورنمنٹ کی نگاہ عنایت بھی ہے اور رئیسوں کی نظر لطف بھی، اُس میں زہاد بھی ہیں اور رندان مے آشام بھی۔ وہ مرجع خاص بھی ہے اور قبلہ گہ عوام بھی۔ اس کے بعد یہ شعر آتا ہے:

جن مہمات میں درکار ہے ایثار نفوس
اُن میں طرز عمل بوسہ بہ پیغام بھی ہے

اور پھر یہ کہ:

مختصر اس کے فضائل کوئی پوچھے تو یہ ہیں
محسن قوم بھی ہے، خادم حکام بھی ہے

گیارہ شعروں کے ایک بند کے بعد چھ شعروں کا ایک بند آتا ہے جس میں لیگ کے آفس کی مدح سرائی ہے جس کے ''سامان درست'' میں ''ورق سادہ'' اور ''کلک خوش اندام'' قرینے سے سجی ہوئی میزیں، احکام کا دفتر پارینہ اور سند یافتہ اسسٹنٹوں اور خدام کا ایک حلقہ سب کچھ موجود ہے لیکن ؏

یہ تو سب کچھ ہے مگر ایک گزارش ہے حضور
گرچہ یہ سؤ ادب بھی ہے اور ابرام بھی ہے
مجھ سے آہستہ مرے کان میں ارشاد ہو یہ
''سال بھر حضرت والا کو کوئی کام بھی ہے''

طنز کا یہی انداز شبلی نے اگلی نظم میں بھی اختیار کیا ہے۔ اس

نظم کا عنوان بھی ''مسلم لیگ'' ہے لیکن اسے شروع ایک واقعہ کے انداز میں کیا گیا ہے ۔ نظم اس شعر سے شروع ہوتی ہے :

جناب لیگ سے میں نے کہا کہ : ''اے حضرت!''
کبھی تو جا کے ہمارا بھی ماجرا کہیے

اس کے بعد کا شعر یہ ہے :

کلیم طور پہ کرتے تھے عرض قوم کا حال
تو آپ شملہ پہ کچھ حال قوم کا کہیے

ان شعروں کے بعد جتنے شعر آتے ہیں ان میں پہلے ملے جلے شاعرانہ اور طنزیہ انداز میں اور پھر ذرا کھلے کھلے لفظوں میں عدالتوں کی پریشانیوں ، پولیس کی دراز دستیوں ، کاشتکاروں کی الم ناک اور غم فزا کیفیتوں ، اشاعت علم کے راستے میں حائل ہوتے والی قیدوں کا ذکر کرتے ہوئے خود ''ستم ناخدا'' کی طرف اشارہ کیا ہے اور بالآخر نظم کو ان طنزیہ اشعار پر ختم کیا ہے :

برادران وطن کہہ رہے ہیں کیا کیا کچھ
کبھی تو آپ بھی افسانۂ جفا کہئے

کبھی تو دو قدم کی بھی کیجئے جرأت
جو بات بات پہ ہر بار مرحبا کہئے

نہ ہو سکے تو اشاروں میں کیجئے اظہار
وگرنہ لطف تو یہ ہے کہ برملا کہئے

جناب لیگ نے سب کچھ یہ سن کے فرمایا
''مجھے تو خو ہے کہ جو کچھ کہو بجا کہئے''

ان اشعار میں طنز کے ساتھ جو ہلکی سی شوخی ہے وہ بظاہر اکبر الہ آبادی کے رنگ خاص کا اثر ہے ۔ وہی ہلکی ہلکی چٹکیاں ، حقائق کے بیان میں وہی بے تکلفی اور بے ساختگی اور بیان کی وہی روانی جو پڑھنے والے کے قلب و ذہن کو اپنی رو میں بہاتی چلی جاتی ہے ۔

لیگ کی سیاست پر اس کے بعد بھی کئی نظمیں ہیں اور اُن کے عنوان یہ ہیں:

''لیگ کی دائم المرضی کی علت اصل'' ۔ لیگ ، ''مع سوٹ ابل''۔ ''سوٹ ابل سلف گورنمنٹ'' ''مسلم لیگ'' ۔ ''خطاب به رائٹ آنریبل سید امیر علی'' ۔ ''مسلم لیگ'' ۔

مسلم لیگ کی ابتدائی سیاست کی بنیاد حکومت وقت سے اظہار وفاداری کے خیال پر تھی ۔ لیکن عام رجحانات سے متاثر ہو کر اُس نے بھی خود مختار حکومت کا مطالبہ اپنے مقصد میں شامل کر لیا ، لیکن اس کے ساتھ لفظ ''سوٹ ایبل'' کی شرط بھی لگائی ۔ اس پر ایک خاص طبقے کی طرف سے بڑی لعن طعن ہوئی ۔ مولانا شبلی اسی گروہ کے هم نوا هیں اور حق یه هے که ''هم نوائی'' کا حق بڑے موثر انداز میں ادا کیا هے ۔ لیگ نے حق طلبی کی جرأت کی تو مولانا نے اُسے ''قابل مدح و ثنا'' سمجھا اور اپنی نظم لیگ (مع سوٹ ابل) میں لیگ سے مخاطب ہو کر اُس سے سلف گورنمنٹ کے مقاصد کے حصول کی طرف قدم بڑھانے کو کہا اور اس سلسلے میں آسے لندن میں امتحانات سول سروس کی قید ، سی ساله پیمایش ارضی کے رواج ، اعلیٰ مناصب پر انگریزوں کے تقرر اور صیغۂ فوج کے کثیر مصارف جیسے مسائل کی طرف متوجه کیا اور یه سب باتیں بڑے منطقی اور مدلل انداز میں اور بڑے سنجیدہ لہجے میں بیان کیں لیکن اس سنجیدہ لہجے کی ته میں طنز کی جو تلخی چھپی ہوئی تھی وہ نظم کے اخیر میں بڑے ڈرامائی انداز میں یوں ظاہر ہوئی :

لیگ نے سن کے یه سب ، مجھ سے باهسته کہا
آپ سمجھے بھی که اس لفظ کا کیا تھا محمل ؟

هم نے گو سلف گورنمنٹ کی خواهش کی تھی
شرط یه بھی تو لگا دی تھی که هو ''سوٹ ایبل''

آپ جو کہتے هیں وہ هے حد ادراک سے دور
هم کو اس خواب پریشاں میں نه کیجیے شامل

یہ وہ باتیں ہیں جو مخصوص ہیں یورپ کے لئے
آپ طے پہلے غلامی کی تو کر لیں منزل

اس سے اگلی نظم کے آخری شعر میں یہ طنز بن کر یوں سامنے آتی ہے -

آزادیٔ خیال پہ تم کو ہے گر غرور
تو لیگ کو بھی شان غلامی پہ ناز ہے

لیکن اس طرح کا غصہ شبلی نے اپنے خلوص احساس کے باوجود صرف کہیں کہیں دکھایا ہے - اُن کے دل میں جو پیچ و تاب پیدا ہوتا ہے وہ کبھی طنز سے زیادہ تیز صورت اختیار نہیں کرتا اور ہر جگہ اُس کی صورت نئی اور کسی نہ کسی لحاظ سے پر لطف ہوتی ہے - چنانچہ ایک اور نظم میں لیگ کی اسی روش کو بڑے دھیمے لہجے میں ، بڑے حسن تدبیر اور اہتمام کے ساتھ کہ جس میں خیال آہستہ آہستہ اُبھر کر ایک ڈرامائی نقطے تک پہنچتا ہے ، بڑی بے تکلفی اور بے ساختگی سے بیان کیا ہے - اس نظم کا پہلا شعر یہ ہے -

لیگ کو جب نظر آیا کہ چلی ہاتھ سے قوم
اک نیا روپ بھرا اُس نے بہ انداز دگر

اس شعر سے شروع ہونے والا بند سات شعروں کے بعد ختم ہوجاتا ہے اور اگلا بند اس شعر سے شروع ہوتا ہے -

واقعی قید ''مناسب'' ہے بجا اور موزوں
آپ اس قید کو کس کام میں لائیں گے مگر ؟

اس تمہید کے بعد لیگ کی روش کی پردہ کشائی میں ۱۴ شعر نظم ہوئے ہیں اور اُن میں کہا گیا ہے کہ آپ ہمیشہ کسی نہ کسی دام میں مبتلا رہتے ہیں - یہ دام اصل میں تعلیم غلامی کا بچھایا ہؤا ہے ، اس لئے آپ کا اس بھول بھلیاں سے نکلنا دشوار ہے -

یہ سب کچھ کہہ کر نظم کو ان دو شعروں پر ، جنھیں نظم کے باقی اشعار سے الگ کرکے لکھا گیا ہے ، ختم کیا ہے -

اس قدر سرد مزاج اور پھر اس پر تبرید
خوف یہ ہے کہ پہنچ جائے نہ فالج کا اثر

آپ کچھ گرم دوائیں جو گوارا فرمائیں
ہم دعا گو یہ سمجھتے ہیں کہ ہوگا بہتر

مسلم لیگ کے علاوہ ایک دو نظموں میں "احرار" سے بھی خطاب کیا ہے - ان میں سے ایک نظم کے صرف تین شعر سن لیجئے -

بت کدے آپ نے ڈھائے بہت اچھا ، لیکن
شرط یہ ہے کہ حرم کی بھی تو رکھئے بنیاد

آبلہ قابل نشتر تھا ، یہ مانا ، لیکن
دیکھئے یہ کہ کہیں زخم میں آئے نہ فساد

یہ تو خاص رنگ شبلی ہے - لیکن اسی نظم کے آخری شعر میں رنگ اکبر کی جھلک بھی نمایاں ہے -

بھاپ پر زور ہے لیکن کوئی انجن بھی تو ہو
کام کیا آئے گا نشتر جو نہ ہوگا فصاد

ہندوستان کی قومی زندگی میں ایک اور مسئلہ جس نے سیاسی صورت اختیار کر لی اور جس پر مسلمانوں کی آنکھوں کے ساتھ اُن کے دل بھی روئے "مسجد کانپور کا ھنگامہ" تھا ، جس میں ایک انگریز کی ناعاقبت اندیشی نہتے مسلمانوں پر گولیاں بن کر برسی اور بڑوں کے ساتھ ننھے ننھے بچے بھی صف شہدا میں شامل ہوئے - یہ واقعہ مولانا شبلی کی سیاسی شاعری کا تیسرا موضوع ہے - اور اس موضوع کے مختلف پہلوؤں پر ۸ - ۹ دو بیتی قطعات کےعلاوہ سات شعر سے لے کر ۱۶ شعر تک کی پانچ نظمیں اُن کے مجموعے میں شامل ہیں اور انہیں پڑھ کر جہاں ایک طرف واقعہ کی پوری تصویر اور اُس کے تمام رخ پڑھنے والے کی نظر کے سامنے آجاتے ہیں وہاں دوسری طرف وہ مولانا شبلی کے جذبہ کے اس خلوص اور شدت سے متاثر ہوتا ہے جس نے تلخ طنز کی صورت اختیار کی ہے اور کبھی شاعرانہ رمزو کنائے کی - لیکن واقعات کی حقیقت آمیز مصوری ، احساس کی طنز آمیز

تلخی اور جذبے کی شاعرانہ پیش کش میں ہر جگہ درد کی وہ کسک موجود ہے جو موثر اور دل نشین شعر کا خاصہ ہے ۔ ان نظموں میں سے پہلی کا عنوان ہے " ہم کشتگان معرکۂ کانپور ہیں " اس نظم کا پہلا شعر ہے :

کل مجھ کو چند لاشۂ بے جاں نظر پڑے
دیکھا قریب جا کے تو زخموں سے چور ہیں

اس کے بعد کے سات شعروں میں بڑے موثر ، جذباتی اور شاعرانہ انداز میں یہ بتایا گیا ہے کہ یہ بےجان لاشے خورد سال بچوں ، نشۂ شباب میں سرمست نوجوانوں اور کہنہ سال دل دادگان فنا کے ہیں ۔ اور نظم اس شعر پر ختم ہوئی ہے :

پوچھا جو میں نے کون ہو تم ؟ آئی یہ صدا
" ہم کشتگان معرکۂ کان پور ہیں "

اگلی نظم " علمائے زندانی " جذبے کی شدت ، شاعری کے جوش اور بیان کی صفائی سے معمور ہے ۔ اس سات شعر کی نظم کے درمیان میں یہ چار شعر آتے ہیں :

پہنائی جا رہی ہیں علمان دیں کو زنجیریں
یہ زیور " سید سجاد " عالی کی وراثت ہے

یہی دس بیس اگر ہیں کشتگان خنجر اندازی
تو مجھ کو سستیٔ بازوئے قاتل کی شکایت ہے

شہیدان وفا کے قطرۂ خوں کام آئیں گے
عروس مسجد زیبا کو افشاں کی ضرورت ہے

عجب کیا ہے جو نوخیزوں نے سب سے پہلے جانیں دیں
کہ یہ بچے ہیں ان کو جلد سو جانے کی عادت ہے

نظم کے ان شعروں میں جو صفائی ، روانی ، بے ساختگی ، بے باکی ، طنز ، شاعرانہ توجیہہ کی جو لطافت اور بیان کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ جذبے کا جو خلوص و صداقت ہے وہ درد بن کر ٹپکتا ہے ۔ اگلی نظم

''آپ ظالم نہیں زنہار پہ ہم ہیں مظلوم'' میں ان شاعرانہ اوصاف کا جوش اور بھی زیادہ ہے - نظم کے تیور پہلے ہی شعر سے ظاہر ہیں -

ہم غریبوں کو نہ پہلے تھا نہ اب ہے انکار
کہ ہر اک شہر میں ہے آپ کے انصاف کی دھوم

طنز کے ان نشتروں کے کچوکے اس کے بعد تیز سے تیز تر ہوتے رہتے ہیں - بے باک طعنہ زنی کی لے برابر اونچی ہوتی رہتی ہے اور بالآخر اس شعر پر ختم ہوتی ہے -

واقعہ یہ ہے غرض، کوئی نہ مانے نہ سہی
آپ ظالم نہیں زنہار، پہ ہم ہیں مظلوم

اس موضوع پر نسبتاً سب سے لمبی نظم ''شرائط صلح'' ہے - جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے کہ اس موقعے پر حکومت نے صلح پر آمادگی ظاہر کی، لیکن بے قصور شہیدوں پر گولیاں چلانے اور مسجد کے شہید کرنے کے سلسلے میں طرح طرح کی تاویلیں اور توجیہیں پیش کیں - شبلی نے اس موقع پر جس بے باکی اور بے خوفی سے مسلمانوں کے احساسات کی ترجمانی کی اور اُن کے جذبے کو جس انداز سے شعر کا لباس پہنایا اُس میں آزادی کے اُس خواب کے نقوش صاف جھلک رہے ہیں جس کی تعبیر آج ہماری زندگی ہے - نظم کے آخری چند شعر سن لیجئے -

اور بھی برہمیٔ طبع کا سامان ہے یہ
فتنۂ عام کے دبنے کی یہ تدبیر نہیں

فتح اس طرح کیا کرتے ہیں اقلیم قلوب
تیر ترکش میں نہیں، ہاتھ میں شمشیر نہیں

اور ہی کچھ ہے گرفتاریٔ دل کی تدبیر
سختیٔ طوق و گراں باریٔ زنجیر نہیں

جبر سے برہمیٔ عام کا رکنا ہے محال
یعنی اس خواب پریشاں کی یہ تعبیر نہیں

داد خواہوں سے ہز آنر نے جو ارشاد کیا
کہ ”یہ حکم ازلی قابل تغئیر نہیں“

حسن ظن کے جو گرفتار تھے یہ بول اٹھے
اس مرقع میں بھی انصاف کی تصویر نہیں

ہم اسیران محبت سے یہی ہے جو سلوک
پھر نہ کہیئے گا کہ فتراک میں نخچیر نہیں

”پھر نہ کہیئے گا کہ فتراک میں نخچیر نہیں“ میں بظاہر ایک خاص واقعہ سے متاثر ہونے والے شاعر کی طنز آمیز دھمکی ہے، لیکن حقیقت میں ایک آنے والے دور کی زندگی کی پیش بینی اور پیش گوئی ہے اور پیش بینی اور پیش گوئی کی یہ شان صرف اس وقت پیدا ہوتی ہے جب شاعر کا دل احساس کے نور کی چمک اور جذبے کے شعلے کی لپک کو سمو کر زبان کے حوالے کرے - شبلی کی سیاسی شاعری کا کوئی حصہ احساس کے اس نور اور جذبے کے اس شعلے کی گرمی سے خالی نہیں اور اسی لئے آسے ایک خاص دور کی سیاسی زندگی کی ”نوائے حق“ کہا جا سکتا ہے، جو لوگوں کو فریب کے طلسم سے محفوظ رکھنے اور صراط مستقیم کی طرف لانے کی خدمت انجام دیتی ہے یہ آواز ایک صاحب بصیرت مورخ کی بھی ہے، ایک حق پسند سیاسی مبصر کی بھی اور ایک بے باک شاعر کی بھی، جس نے تاریخ اور سیاست کے حقائق کہ شاعری کے سانچوں میں ڈھالا ہے اور شاعر کو مصلحت کی راہ چھوڑ کر حق گوئی کا مسلک اختیار کرنے کی تعلیم دی ہے کہ یہی مسلک حقیقت میں شاعری اور پیغمبری کو ایک ھی منزل مقصود کی طرف لے جاتا ہے اور شاعر کی زبان سے ایسی باتیں بھی نکل جاتی ھیں جن میں پیغمبرانہ شان ہوتی ہے - شبلی کی سیاسی شاعری میں جابجا اس پیغمبرانہ شان کی جھلک نمایاں ہے -

شبلی کی تنقید نگاری

ڈاکٹر عبادت بریلوی

شبلی اردو کے ممتاز نقاد ہیں ۔ انہوں نے اردو میں تنقید کی داغ بیل ڈالی ۔ ان کے ساتھ آزاد اور حالی بھی اس سلسلے میں پیش پیش رہے اور اردو میں تنقید کے علم برداروں کی حیثیت سے ان کا مرتبہ بھی اپنی اپنی جگہ مسلم ہے ۔ شبلی کی تنقید کا انداز ان دونوں نقادوں سے مختلف ہے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ وہ اپنی ایک مخصوص انفرادیت رکھتی ہے اور اس نے اردو تنقید کو ایک نئے انداز سے آشنا کیا ہے ۔ آزاد کے پاس ایک اسلوب تھا ان کی تنقید اسی اسلوب کے سہارے آگے بڑھتی ہے ۔ اس میں سارا کھیل انداز نگارش کا ہے ۔ ان کے فقرے بڑے پرلطف ہوتے ہیں اور ان کی بدولت بعض تنقیدی حقائق کی نقاب کشائی ہوتی ہے ۔ لیکن ان کا مزاج تجرباتی نہیں ہے ۔ اسی لئے ان کی تنقید میں بھی تجرباتی انداز نہیں ملتا ۔ حالی ایک تجزیاتی مزاج رکھتے تھے ۔ اسی لئے ان کی تنقید میں بڑا ذہن ملتا ہے ۔ وہ موضوع کے کسی پہلو کو تشنہ نہیں چھوڑتے ۔ دودھ کا دودھ اور پانی کاپانی الگ کر دیتے ہیں ان کی تنقید معاملہ فہمی کی بہت اچھی مثال ہے ۔ اس میں بڑی بصیرت کا احساس ہوتا ہے ۔ لیکن حالی کی تنقید میں اسلوب اور انداز نگارش کا حسن نسبتاً کم ہے ۔ وہ حکیمانہ ہے ۔ اس میں اسلوب کی دل کشی نہیں ہے ۔ بات یہ ہے کہ حالی کی تنقید تمام تر حقائق کی تلاش اور ان کے تجزئے سے عبارت ہے ۔ اسی لئے اس میں بصیرت کا حسن تو ہے لیکن وہ بذات خود حسین نہیں ہے ۔ شبلی کی تنقید میں ایک اسلوب تو ملتا ہے لیکن وہ صرف اسلوب تک محدود نہیں ہے ۔ وہ حالی کی تنقید کی طرح تجزیاتی بھی نہیں ہے ۔ لیکن اس میں بصیرت کا حسن اور حسن کی بصیرت کا امتزاج ملتا ہے ۔ اور یہی اس کی سب سے بڑی خوبی ہے ۔ شبلی نرے

نقاد نہیں ھیں ان کی شخصیت میں شاعری کا رنگ بھی رچا ھؤا ھے ۔ اسی لئے اس میں وہ دلکشی نظر آتی ھے جس کا ھیولا جذبے اور تخئیل کے باھمی امتزاج سے تیار ھوتا ھے ۔ شبلی جذبے کے پرستار اور تخئیل کے علمبردار ھیں ۔ اس صورت حال نے انہیں رومانی مزاج بنا دیا ھے ۔ ان کی اس رومانیت سے تنقید بھی متاثر ھوتی ھے اور اس میں شبہ نہیں کہ ان کے یہاں جگہ جگہ رومانی تنقید کی جھلکیاں نظر آتی ھیں ۔ وہ اُردو کے پہلے رومانی نقاد ھیں ۔ اور اُردو تنقید کو رومانی رنگ و آھنگ سے آشنا کرنے کا سہرا انہیں کے سر ھے ۔

اُردو ادب میں شبلی کی کئی حیثیتیں ھیں ۔ وہ بیک وقت ایک عالم، ایک مؤرخ ایک سوانح نگار، ایک ماھر زبان و لسان، ایک شاعر اور ایک نقاد تھے ۔ غرض ان کی شخصپت خاصی پہلو دار، وسیع اور ھمہ گیر تھی اور اس کے اثرات ان کی تنقید میں بھی نظر آتے ھیں ۔ وہ عالمانہ ھے ۔ اس میں ایک تاریخی شعور بھی ملتا ھے ۔ انفرادی اور اجتماعی نفسیات کی جھلکیاں بھی اس میں موجود ھیں ۔ اس میں زبان و لسان کے مختلف پہلوؤں کی طرف توجہ بھی نظر آتی ھے اور اس میں ایک شاعرانہ زاویہ نظر بھی اپنی جھلکیاں دکھاتا ھے ۔ انہیں اثرات کی بدولت ان کی تنقید بھی خاصی پہلو دار، وسیع اور ھمہ گیر بن گئی ھے ۔ اس جلوے میں مختلف علوم انسانی کا جلوۂ صد رنگ نظر آتا ھے ۔ شبلی فلسفی نہیں تھے ۔ اس لئے اس میں فلسفیانہ مزاج تو نہیں ملتا ۔ البتہ مختلف علوم کے سہارے زندگی کے حقائق کی تلاش و جستجو ان کے مزاج کی بنیادی خصوصیت تھی ۔ چنانچہ یہ خصوصیت ان کی تنقید میں بھی نمایاں ھے ۔ تنقید نقاد کے مزاج اور اُفتاد طبع کا عکس ھوتی ھے ۔ شبلی کی تنقید بھی ان کے مزاج اور اُفتاد طبع کا عکس ھے ۔ ان کا مزاج علم، عقل اور جذبے کا مرکب ھے ۔ اسی لئے ان سب کا متوازن امتزاج ان کی تنقید میں بھی نمایاں ھے ۔ اس میں علمیت ھے ۔ گہرا تاریخی اور معاشرتی شعور ھے ۔ وہ ایک تہذیبی روایت کے پس منظر میں اُبھرتی ھے ۔ اس میں انسانی زندگی کے جذباتی نظام کا بڑا دخل نظر آتا ھے ۔ زبان و لسان کے اسرار و رموز اس میں ضرور

کھلتے ھیں اور زندگی کے ذوقی اور جمالیاتی پہلوؤں کا خیال اس میں آبھرا ھؤا دکھائی دیتا ھے ۔ غرض وہ خاصی وسیع ، ھمہ گیر اور پہلودار ھے اور یہ ھی اس کی وہ خصوصیت ھے جو ایک نقاد کی حیثیت سے شبلی کی انفرادیت کو نمایاں کرتی ھے ۔

یہ حقیقت ھے کہ شبلی گہرا تنقیدی شعور رکھتے تھے ۔ اس تنقیدی شعور کو ان کے مخصوص انفرادی اور اجتماعی حالات نے پیدا کیا تھا ۔ انہیں زندگی سے دلچسپی تھی ۔ انہوں نے اس کو قریب سے دیکھا تھا ۔ وہ زندگی کو بسر کرنے اور برتنے کی خواھش رکھتے تھے ۔ اس صورت حال نے اس کے نشیب و فراز کو ان کے سامنے بےنقاب کر دیا تھا ۔ ان کی طبیعت میں انفعالیت نہیں تھی ۔ وہ زندگی سے بیزار نہیں تھے ۔ یہی وجہ ھے کہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کو انہوں نے نظر انداز نہیں کیا ۔ ان کے یہاں زندگی کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے اور ان کے نشیب و فراز کو جاننے کی خواھش تھی ۔ اسی لئے وہ اس اعتبار سے خاصے باشعور نظر آتے ھیں ۔ انہوں نے مختلف علوم کو حاصل کرنے میں خاصے انہاک کا اظہار کیا تھا ۔ اور ان میں سے بیشتر میں مہارت حاصل کی تھی ۔ وہ مذھب کے بہت بڑے عالم تھے اور مذھب کے اجتماعی پہلو کو انہوں نے بخوبی سمجھا تھا ۔ انہیں تاریخ اور تہذیب سے دلچسپی تھی ۔ اور وہ اس کے مدوجزر سے پوری طرح واقفیت رکھتے تھے ۔ انہیں ادب و شعر سے خاص لگاؤ تھا اور ان کی اصلیت اور حقیقت ان پر روشن تھی ۔ عربی اور فارسی ادبیات کا انہوں نے خاص طور پر مطالعہ کیا تھا اور ان کی روح سے وہ آشنا تھے ۔ مغربی ادبیات سے بھی وہ ناواقف نہیں تھے ۔ انگریزی اور فرانسیسی سے انہوں نے دلچسپی لی تھی ۔ ان حالات نے ان کے تنقیدی شعور پر جلا کی اور ادب و شعر کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے کے خیالات ان کے یہاں پیدا ھوئے ۔ اس کے علاوہ شبلی کے سماجی اور اجتماعی ماحول نے بھی ان کے اس تنقیدی شعور کی نشو و نما میں خاصہ حصہ لیا ھے ۔ ان کا زمانہ ھندوستانی مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں نشاۃ الثانیہ کا زمانہ ھے ۔ اس زمانے میں مسلمانوں کو سر سید کی

قیادت نصیب ہوئی - سرسید نے ان کی دینی ، علمی ، تعلیمی ، معاشرتی اور تہذیبی اعتبار سے ایک نئی زندگی سے ہم کنار کرنے کی کوشش کی تھی - چنانچہ مسلمانوں نے اپنے آپ کو بدلا - اس میں اس تنقیدی شعور کا بڑا ھاتھ ہے - جو سر سید کی تحریک نے اس زمانے کے مسلمانوں میں عام کیا ، شبلی اس ماحول سے متاثر تھے - سرسید سے انہوں نے اختلاف بھی کیا ہے - وہ انگریزوں کے بہت بڑے مخالف تھے - لیکن اس کے باوجود سر سید کی تحریک نے مسلمانوں کی زندگی میں جس نشاۃ الثانیہ کی داغ بیل ڈالی تھی اس کا شبلی پر اثر تھا - مغربی تہذیب کے زیر اثر جو خیالات عام ہو رہے تھے ان سے شبلی کو بظاہر کوئی تعلق نہیں تھا - لیکن جو فضا ان خیالات نے قائم کی تھی اس سے شبلی متاثرہوئے بغیرنہ رہ سکے - غرض ان تمام حالات نے شبلی کو ایک اعلیٰ درجے کے تنقیدی شعور سے آشنا کیا - ان کی تنقید اسی شعور کی پیدا وار ہے اوراس تنقیدی شعور کے مختلف محرکات کی جھلک ان کی تنقید میں بھی نظر آتی ہے -

شبلی نے تنقید کے نظری اور عملی دونوں پہلوؤں کی طرف توجہ کی ہے ان کا خاص میدان شاعری کی تنقید ہے - انہوں نے شاعری کے اصولوں پر بھی بحث کی ہے - اصناف سخن کے اصول بھی وضع کئے ہیں اور شاعروں پر عملی تنقید بھی کی ہے - اس لحاظ سے ان کی تصنیف شعرالعجم خصوصیت کے ساتھ اہمیت رکھتی ہے - شعرالعجم کی پانچ جلدیں ہیں - ان میں چوتھی جلد نظریاتی اور اصولی تنقید سے متعلق ہے اور اس میں شاعری کے مختلف پہلوؤں پر بصیرت افروز تنقیدی بحث اور اصناف سخن کا تنقیدی تجزیہ ہے - بقیہ جلدوں میں مختلف فارسی شعرا اور فارسی شاعری کے مختلف رجحانات کا تنقیدی جائزہ ہے - غرض اس کتاب میں نظری اور عملی تنقید کے بہت اچھے نمونے موجود ہیں اور اس کو سامنے رکھا جائے تو شبلی کے انداز تنقید کا صحیح اندازہ ہو جاتا ہے - شعرالعجم کے علاوہ تنقیدی اعتبار سے ان کی ایک اور اہم تصنیف ''موازنہ انیس و دبیر'' ہے - اس میں مرثیہ نگاری کے فن پر اصولی بحث ہے اور ساتھ میں انیس و دبیر کے مرثیوں کا تقابلی مطالعہ ہے - اس سلسلے

میں انہوں نے انہیں کے کلام کو خاص طور پر اپنے پیش نظر رکھا ھے۔ اور اس کی مختلف خصوصیات کو واضح کرنے کی کوشش کی ھے ۔ اس بحث کا اندازاگرچہ تشریحی اور توضیحی زیادہ ھے لیکن اس میں جگہ جگہ اعلیٰ درجہ کی تنقید بھی ملتی ھے ۔ ایک اور اہم بات اس کتاب میں یہ ھے کہ اس میں شبلی نے فصاحت و بلاغت اور اس کے مختلف پہلوؤں پر اصولی اور نظریاتی بحث بھی کی ھے ۔ اس بحث میں بھی ان کا تنقیدی شعور کام کرتا ھؤا نظر آتا ھے ۔ بہر حال یہ کتاب بھی تنقیدی اعتبار سے اھمیت رکھتی ھے ۔

شعر العجم کی چوتھی جلد میں شبلی نے اصول شعر کو واضح کیا ھے اور اس کے مختلف پہلوؤں پر تنقیدی زاویۂ نظر سے روشنی ڈالی ھے ۔ اس سے ان کے نظریات تنقید کا پوری طرح اندازہ ہوتا ھے اور شاعری کی حقیقت اور ماھیت کے بارے میں جو خیالات انہوں نے قائم کئے ھیں ان کی وضاحت ھوتی ھے ۔ ان خیالات و نظریات کی روشنی میں انہوں نے فارسی شاعری کی تاریخ و تمدن کا جائزہ بھی لیا ھے اور اس کے مختلف پہلوؤں پر تنقیدی بحث بھی کی ھے ۔ شاعری کو وہ ذوقی اور وجدانی چیز سمجھتے ھیں اس لئے ان کے خیال میں شاعری کی جامع اور مانع تعریف نہیں ھو سکتی ۔ چنانچہ مختلف طریقوں سے مثالیں دے کو اس کی حقیقت کو واضح کرتے ھیں ۔ لکھتے ھیں — ''شاعر چونکہ وجدانی اور ذوقی چیز ھے اس لئے اس کی جامع تعریف چند الفاظ میں نہیں کی جا سکتی ۔ اس بنا پر مختلف طریقوں سے ان کی حقیقت کا سمجھانا زیادہ مفید ھوگا تاکہ آن سب کے مجموعے سے شاعری کا صحیح نقشہ پیش نظر ھو جائے ۔'' چنانچہ انہوں نے مختلف مثالیں دے کر شاعری کی اھمیت واضح کی ھے ۔ ان کے نزدیک شاعری منبع ادراک نہیں بلکہ احساس ھے ۔ احساس سوچنے اور غور کرنے کا نام نہیں وہ اس سے ایک مختلف قوت ھے جو ھر انسان میں پائی جاتی ھے انسان متاثر ھونے کی صلاحیت رکھتا ھے ۔ مختلف واقعات اس پر اثر کرتے ھیں ۔ اور اس طرح اس پر مختلف کیفیات طاری ھوتی ھیں ۔ شبلی لکھتے ھیں — ''کہ جب اسے کوئی موثر واقعہ

پیش آتا ہے تو وہ متاثر ہو جاتا ہے۔ غم کی حالت میں صدمہ ہوتا ہے۔ خوشی میں سرور ہوتا ہے۔ حیرت انگیز بات پر تعجب ہوتا ہے۔ یہی قوت جس کو احساس، انفعال یا فیلنگ سے تعبیر کرسکتے ہیں، شاعری کا دوسرا نام ہے۔ یعنی یہی احساس جب الفاظ کا جامہ پہن لیتا ہے تو شعر بن جاتا ہے۔'' ان کا یہ خیال صحیح ہے۔ کیونکہ احساس کے بغیر شاعری کوئی معنی نہیں رکھتی۔ یہ احساس جب شدید ہو جاتا ہے تو فطری اور اضطراری طور پر انسان کی زبان سے موزوں الفاظ نکلتے ہیں۔ اسی کا نام شعر ہے۔ اس میں شاعر کی شعوری کوشش کو دخل نہیں ہوتا۔ یہ کم و بیش ایک ایسی کیفیت ہے جو شیر کو گونجنے ہاتھی کو چگھاڑنے کوئل کو کوکنے مور کو ناچنے اور سانپ کو لہرانے پر مجبور کرتی ہے۔ انسان چونکہ حیوان ناطق ہے اس لئے اپنی کیفیات کو الفاظ کے سانچے میں ڈھال دیتا ہے۔ اس بحث کے بعد شبلی اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ''جو جذبات الفاظ کے ذریعہ سے ادا ہوں وہ شعر ہیں؛ اور چونکہ یہ الفاظ سامعین کے جذبات پر بھی اثر کرتے ہیں یعنی سننے والوں پر بھی وہی اثر طاری ہوتا ہے جو صاحب جذبہ کے دل پر طاری ہوتا ہے۔ اس لئے شعر کی تعریف یوں بھی کرسکتے ہیں کہ جو کلام انسانی جذبات کو برانگیختہ اور ان کو تحریک میں لائے وہ شعر ہے۔'' اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شبلی شاعری میں جذبات کی اہمیت کے قائل ہیں۔ جذبات کے بغیر شاعری کا وجود نہیں ہوتا۔ وہ جذبات سے پیدا ہوتی ہے اور اس کا کام جذبات میں تحریک پیدا کرنا اور ان کو ابھارنا ہے۔ لیکن اس کا مطلب ہیجان اور ہنگامہ پیدا کرنا نہیں ہے بلکہ جذبات میں زندگی اور جولانی کا پیدا کرنا ہے۔

شبلی کے خیال میں تمام عالم ایک شعر ہے۔ زندگی میں شاعری بکھری پڑی ہے۔ جہاں زندگی ہے وہاں شاعری موجود ہے اور جہاں شاعری ہے وہاں زندگی موجود ہے۔ ایک یورپین مصنف کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں کہ ''ہر چیز جو دل پر استعجاب یا حیرت یا جوش یا اور کسی قسم کا اثر پیدا کرتی ہے، شعر ہے۔ اس بنا پر فلک نیلگوں،

نجم درخشاں ، نسیم سحر ، گلگونۂ شفق ، تبسم گل ، خرام صبا ، نالۂ بلبل ویرانیٔ دشت ، شادابیٔ چمن غرض تمام عالم شعر ہے ۔'' غرض ساری زندگی میں یہ شعریت پائی جاتی ہے ۔ مناظر بھی اپنے دامن میں شعریت رکھتے ہیں اور جس طرح ان کا اثر ہوتا ہے شاعری بھی اسی طرح انسان کے دل پر اپنا اثر کرتی ہے ۔ یوں اور چیزیں بھی دلوں کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں مثلاً موسیقی ، مصوری ، صنعت گری کا بھی ناطر خواہ اثر ہوتا ہے ۔ لیکن شاعری میں متاثر کرنے کی صلاحیت سب سے زیادہ ہے ۔ اس کے حدود بھی وسیع ہیں ۔ شبلی نے لکھا ہے ۔ ''جو چیزیں دل پر اثر کرتی ہیں بہت سی ہیں ۔ مثلاً موسیقی ، مصوری ، صنعت گری وغیرہ لیکن شاعری کی اثر انگیزی کی حد سب سے زیادہ ہے ۔ موسیقی صرف قوت سامعہ کو محضوظ کرسکتی ہے سامعہ نہ ہو تو وہ کچھ کام نہیں کرسکتی ۔ تصویر سے متاثر ہونے کے لئے بینائی شرط ہے ۔ لیکن شاعری تمام حواس پر اثر ڈال سکتی ہے ۔ باصرہ ، ذائقہ ، شامسہ ، لامسہ سب اس سے لطف اٹھاتے ہیں ۔ فرض کرو شراب آنکھوں کے سامنے نہیں ہے اس لئے آنکھ اس وقت اس سے حظ نہیں اٹھا سکتی لیکن جب ایک شاعر اس کو آتش سیال سے تعبیر کرتا ہے تو ان الفاظ سے ایک موثر منظر آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے ۔ اس طرح جب بوسے کو شاعرانہ انداز میں تنگ شکر کہہ دیتے ہیں تو کان و زبان کو مزہ محسوس ہوتا ہے ۔'' اس سے صاف ظاہر ہے کہ شبلی کے نزدیک شاعری تمام فنون لطیفہ میں بلند اور برتر حیثیت رکھتی ہے ۔ اس کا تعلق حواس سے ہے اور بیک وقت انسان کے تمام حواس کو متاثر کرنا اس کا بنیادی مقصد ہے ۔ اسی لئے انسانی زندگی میں اس کا اتنا عمل دخل نظر آتا ہے اور وہ دوسرے فنون لطیفہ کے مقابلہ میں اس سے نسبتاً زیادہ دلچسپی لیتے ہیں ۔ وہ انہیں زیادہ لطف دیتی ہے ۔ اس سے انہیں زیادہ مزہ ملتا ہے کیونکہ وہ ایک سر خوشی بن کر حواس پر چھا جاتی ہے ۔

شاعری کا تعلق جذبات سے ہے ۔ وہ انسانی جذبات میں ایک ارتعاش سا پیدا کرتی اور انہیں تحریک میں لاتی ہے ۔ اس کو پڑھ کر یا سن کر

رنج خوشی یا جوش کا اثر پیدا ہوتا ہے۔ اسی لئے وہ سائنس اور دوسرے علوم و فنون سے ممتاز ہے۔

شاعری کا تعلق جذبات سے ہے اور سائنس کا یقین سے۔ سائنس استدلال سے کام لیتا ہے اور شاعری محرکات استعمال کرتی ہے۔ سائنس عقل کے سامنے کوئی عملی مسئلہ پیش کرتا ہے۔ لیکن شاعری احساسات کو دلکش منظر دکھاتی ہے۔ کیونکہ اس کی نوعیت تمام تر داخلی ہے۔ اس میں دل کی باتیں بیان ہوتی ہیں۔ شاعر اندرونی جذبات اور احساسات کی نیزنگیوں کا ماہر بلکہ تجربہ کار ہوتا ہے۔ یہ بات مورخ اور خطیب میں نہیں ہوتی۔ اسی لئے شاعری تاریخ اور خطابت سے اتنی مختلف نظر آتی ہے۔ تاریخ میں واقعات کی صداقت کو پیش کیا جاتا ہے۔ خطابت کا مقصد لوگوں سے خطاب کرنا اور انہیں کسی بات پر آکسانا ہوتا ہے۔ لیکن شاعری ان باتوں سے کوئی سروکار نہیں رکھتی۔ وہ تو صرف جذبات کی ترجمانی کرتی ہے۔ دل میں جو احساسات کی لہریں اٹھتی ہیں انہیں الفاظ کے سانچے میں ڈھال دینا شاعری کا مقصد ہے۔ اس سلسلے میں شبلی نے صاف صاف لکھا ہے کہ " اصلی شاعری وہی ہے جس کو سامعین سے کچھ غرض نہ ہو۔" اس کا مطلب یہ ہی ہے کہ شاعر عوام کو سامنے رکھ کر شاعری نہیں کرتا۔ اس کی مخصوص کیفیات اسے شعر کی تخلیق کے لئے مجبور کرتی ہیں۔ وہ شبلی کے خیال میں تنہا نشینی اور مطالعہ نفس کا نتیجہ ہے۔ شبلی کے ان خیالات میں بڑی صداقت پائی جاتی ہے۔ شاعری کا اثر تو عوام پر ہوتا ہے وہ اس سے اثر بھی قبول کرتے ہیں لیکن شاعر اس لئے شاعری نہیں کرتا کہ وہ عوام پر اثر کرے، اور وہ اس کی شاعری سے اثر قبول کریں۔ اس کے پیش نظر تو اپنی داخلی کیفیات کا جمالیاتی اظہار ہوتا ہے۔ اور یہی شاعری کی اصل روح ہے۔

اس جمالیاتی اظہار کے مختلف عناصر ہیں۔ ان عناصر ہی سے شاعری کی تشکیل ہوتی ہے۔ شبلی نے لکھا ہے کہ " ایک عمدہ شعر میں بہت سی باتیں پائی جاتی ہیں۔ اس میں وزن ہوتا ہے محاکات ہوتے ہیں یعنی کسی چیز یا کسی حالت کی تصویر کھینچی جاتی ہے۔ خیال بندی ہوتی

ہے ۔ الفاظ سادہ اور شیریں ہوتے ہیں ۔ بندش صاف ہوتی ہے ۔ طرز ادا میں جدت ہوتی ہے ۔" لیکن " حقیقت یہ ہے کہ شاعری دراصل دو چیزوں کا نام ہے ۔ محاکات اور تخئیل ۔ ان میں سے ایک بات بھی پائی جائے تو شعر شعر کہلانے کا مستحق ہوگا۔ باقی اور اوصاف یعنی سلاست، صفائی حسن بندش وغیرہ وغیرہ شعر کے اجزائے اصلی نہیں بلکہ عوارضی اور مستحسنات ہیں ۔" اس سے صاف ظاہر ہے کہ شبلی کی نظر شعر و شاعری کے بنیادی عناصر تک پہنچتی ہے ۔ اور وہ فروعی باتوں کے بجائے انہیں بنیادی عناصر کو اہمیت دیتے ہیں ۔

محاکات کی تعریف کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے " محاکات کے معنی کسی چیز یا کسی حالت کا اس طرح ادا کرنا ہے کہ اس شے کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے ۔" لیکن تصویر اور محرکات میں فرق ہے آن کے خیال میں کا اصل کمال یہ ہے کہ اصل کے مطابق ہو اور اگر مصور اس امر میں کامیاب ہوگیا تو اس کو کامل فن کا خطاب مل سکتا ہے ۔ لیکن شاعر کو اکثر موقعوں پر دو مشکل مرحلوں کا سامنا ہوتا ہے ۔ یعنی نہ اصل کی پوری تصویر کھینچ سکتا ہے ۔ کیونکہ بعض جگہ اس قسم کی پوری مطابقت ، احساسات کو برانگیختہ نہیں کر سکتی ۔ نہ اصل سے زیادہ دور ہو سکتا ہے ورنہ اس پر اعتراض ہوگا کہ صحیح تصویر نہیں کھینچی ۔ اس موقع پر اُس کو تخیل سے کام لینا پڑتا ہے ۔ وہ ایسی تصویر کھینچتا ہے جو اصل سے آب و تاب اور حسن و جمال میں بڑھ جاتی ہے ۔ لیکن وہ قوت تخئیل سے سامعین پر یہ اثر ڈالتا ہے کہ یہ وہی چیز ہے ۔ لوگوں نے اس کو امعانی نظر سے نہیں دیکھا تھا ۔ اس لئے اس کا حسن پوری طرح نمایاں نہیں ہوتا ۔" غرض شاعر مصور سے زیادہ کمال رکھتا ہے وہ اپنی تخئیل کی مدد سے ایسی تصویروں کی تخلیق کرتا ہے جو اصل سے زیادہ حقیقت سے بھرپور اور خوبصورت ہوتی ہیں ۔ یہی محاکات ہے ۔ اور جب شاعری میں یہ صورت حال پیدا ہوتی ہے تو محاکات شباب پر پہنچ جاتی ہے ۔ اعلیٰ شاعری کا یہی مقصد ہے کہ وہ حقیقت کی ترجمانی کرے اور اس ترجمانی

میں محاکات اپنے شباب پر نظر آئے۔

شبلی نے اس سلسلے میں تخئیل پر بھی بہت اچھی بحث کی ھے۔ ان کے خیال میں ''تخئیل دراصل قوت اختراع کا نام ھے۔ عام لوگوں کے نزدیک منطق اور فلسفہ کا موجد صاحب تخئیل نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ اگر خود کسی فلسفہ داں کو اس لقب سے خطاب کیا جائے تو اس کو عار آئے گا۔ لیکن حقیقت یہ ھے کہ فلسفہ اور شاعری میں قوت تخئیل کی یکساں ضرورت ھے۔ یہی قوت تخیل ھے جو ایک طرف فلسفہ میں ایجاد اور اکتشاف مسائل کا کام دیتی ھے اور دوسری طرف شاعری میں شاعرانہ مضامین پیدا کرتی ھے۔'' ظاھر ھے کہ یہ تخئیل کا وھی تصور ھے جو بڑے بڑے نقادوں نے پیش کیا ھے۔ اس بات پر وہ سب کے سب متفق ھیں کہ تخئیل انسان کی ایک عجیب و غریب صلاحیت ھے جو زندگی اور اس کے حقائق کو سمجھنے میں معاون ھوتی ھے۔ اسی لئے شاعری میں یہ قوت حقائق کو سمجھنے میں معاون ھوتی ھے۔ اس لئے شاعری میں یہ قوت حقائق کو واضح کرتی ھے۔ یہی شاعری کے موضوعات اور مضامین ھوتے ھیں۔ دوسرے وہ ان حقائق کو جمالیاتی انداز میں پیش کرتا ھے تاکہ اس کا خاطر خواہ اثر ھو۔ اس کو شبلی نے جذبات انسانی کی تحریک سے تعبیر کیا ھے۔ یہ تحریک فلسفہ اور سائنس سے نہیں ھوتی۔ وہ تو صرف کسی علمی مسئلے کو حل کر دیتے ھیں۔ اس موضوع پر بحث کرتے ھوئے انہوں نے لکھا ھے۔ ''فلسفہ اور سائنس میں قوت تخئیل کا استعمال اس غرض سے ھوتا ھے کہ ایک علمی مسئلے کو حل کر دیا جائے۔ لیکن شاعری میں تخئیل سے کام لیا جاتا ھے کہ جذبات انسانی کو تحریک ھو۔ فلسفی کو صرف ان موجودات سے غرض ھے جو واقع میں موجود ھیں۔ بخلاف اس کے شاعر ان موجودات سے بھی کام لیتا ھے جو مطلق موجود نہیں۔ فلسفے کے دربار میں ھما، سیمرغ، گاؤزمیں، تخت سلیمان کی مطلق قدر نہیں۔ لیکن یہ چیزیں ایوان شاعری کے نقش و نگا رھیں۔ فلسفی کی زبان سے اگر سیمرغ زریں کا لفظ نکل جائے تو ھر طرف سے ثبوت کا مطالعہ ھو گا لیکن شاعر اس قسم کی فرضی مخلوقات سے اپنا عالم خیال

آباد کرتا ہے ۔ اور کوئی اس سے ثبوت کا طالب نہیں ہوتا ۔ کیونکہ فلاسفر کی طرح وہ کسی مسئلہ کی تعلیم کا دعویٰ نہیں کرتا بلکہ وہ ہم کو صرف خوش کرنا چاہتا ہے اور بے شبہ وہ اس میں کامیاب ہوتا ہے ۔" غرض اس طرح فلسفہ اور سائنس کو سامنے رکھ کر شبلی نے تخئیل پر بہت اچھی بحث کی ہے ۔ اور اس طرح شاعری میں اس کی اہمیت کو واضح کیا ہے ۔ اس بحث سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ تخئیل شاعری کا ایک بڑا ہی اہم عنصر ہے ۔ اس کے بغیر شاعری کو شاعری کی صورت اختیار کرنا نصیب نہیں ہوتا ۔ تخئیل ھی کی بدولت شاعری وہ ایک مخصوص صورت اختیار کرتی ہے جس میں تاثر کا سحر ہوتا ہے ۔ یہی اس کی سب بڑی خوبی ہے ۔ اگر اس میں تاثر کا سحر نہ ہو تو وہ بے مقصد اور بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے ۔

اس تخئیل اور محاکات کا چولی دامن کا ساتھ ہے ۔ تخئیل کے بغیر محاکات کا وجود نہیں ہو سکتا ۔ لیکن شبلی کے یہاں یہ محاکات درحقیقت ایک جمالیاتی اظہار ہے ۔ جس میں تاثر کا یہ سحر پایا جاتا ہے ۔ اس لئے محاکات کے تحت وہ ان تمام باتوں کو شامل کرتے ہیں جن سے شاعری کی تشکیل ہوتی ہے اور جن کی بدولت اس میں تاثر کا یہ سحر پیدا ہوتا ہے ۔ شبلی کے خیال میں محاکات کی تکمیل کئی چیزوں سے ہوتی ہے ۔ اس میں سب سے پہلے شعر کا وزن اور آہنگ ہے ۔ شاعرانہ خیال بذات خود اپنا ایک وزن اور آہنگ رکھتا ہے ۔ اور اس کے جمالیاتی اظہار کو بھی اس وزن و آہنگ کے ساتھ ایک مناسبت ہوتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ معنی اور خیال کا عکس صورت اور فن میں جھلکتا ہے شبلی لکھتے ہیں ۔ "محاکات جب موزوں کلام کے ذریعہ سے کی جائے تو سب سے پہلے وزن کا تناسب شرط ہے ۔ یہ ظاہر ہے کہ درد ، غم ، رنج ، خوش ، غضب ہر ایک کے اظہار کا لہجہ اور آواز مختلف ہے ۔ اس لئے جس جذبے کی محاکات مقصود ہو شعر کا وزن بھی اس کے مناسب ہونا چاہئے تاکہ اس جذبہ کی پوری حالت ادا ہو سکے ۔ دوسری چیز جو محاکات کے اثر کو دوبالا کرتی ہے ایسی باتوں کی ترجمانی ہے جو بذات خود لطیف

اور دلاویز ہوں تاکہ ان کا اثر گہرا اور ہمہ گیر ہو ۔ تیسری چیز الفاظ کا موضوع کی مناسبت کے ساتھ استعمال ہے ۔ تاکہ جس چیز کی محاکاتی تصویر پیش کی جائے وہ زیادہ اجاگر ہو اور موثر بن جائے ۔ چوتھی چیز طرز ادا اور لہجے کا خیال ضروری ہے تاکہ جس ماحول کی تصویر کھینچی جا رہی ہے وہ اصل سے قریب ہو اور خاطر خواہ اثر کرسکے ۔''

محاکات یا جمالیاتی اظہار کے لئے کائنات کی ہر چیز کا بغور مطالعہ بھی ضروری ہے کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو شاعر غلط باتیں کرسکتا ہے ۔ شبلی نے لکھا ہے ۔ ''محاکات کے کمال کے لئے عالم کائنات کی ہر قسم کی چیزوں کا مطالعہ کرنا ضروری ہے ۔ شاعر کبھی لڑائیوں اور معرکوں کا حال لکھتا ہے ۔ کبھی قوموں کے اخلاق و عادات کی تصویر کھینچتا ہے ۔ کبھی جذبات انسانی کا عالم دکھاتا ہے ۔ کبھی شاہی درباروں کا جاہ و حشم بیان کرتا ہے ۔ کبھی ٹوٹے پھوٹے جھونپڑوں کی سیر کراتا ہے ۔ اس عالم میں اگر اس نے عالم کائنات کا مطالعہ نہ کیا اور ایک ایک چیز کی خصوصیات اور قابل انتخاب باتوں کو دقت آفرینی سے نہ دیکھا تو وہ ان مرحلوں کو کیونکر طے کر سکتا ہے ۔'' اس لئے انہوں نے جزئیات کے مطالعے تک پر زور دیا ہے ۔ شاعر اس جزئیات کو مختلف طریقوں سے پیش کرتا ہے ۔ ضروری نہیں کہ وہ ایک ایک چیز کی تفصیل بیان کرے ۔ اشاروں اور کنایوں میں وہ ایسی باتیں کہہ جاتا ہے جن میں سے تفصیلی جزئیات آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے لیکن یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک جزئیات پر اس کی نظر نہ ہو ۔ اگر جزئیات پر اس کی نظر ہوتی ہے تو وہ اس کے بیان پر قدرت رکھتا ہے اور کبھی اشاروں کنایوں میں کبھی مخالف اور متضاد پہلوؤں کو ابھار کر، کبھی تشبیہہ اور استعارے کے ذریعے، کبھی مبہم طریقے سے وہ کچھ ایسی صورتیں پیدا کرتا ہے کہ جو کچھ اس نے دیکھا اور محسوس کیا ہے اس کی ہو بہو تصویر سامنے آ جاتی ہے ۔ اس تصویر میں تخیئل کا رنگ بہت گہرا ہوتا ہے ۔ اسی سے اس میں جان پیدا ہوتی ہے ۔ کیونکہ محاکات کا کام تو بیان کرنا ہے ۔ اس بیان میں ترتیب اور تناسب کو

تخئیل ھی پیدا کرتی ھے ۔ اور ترتیب اور ایسی تناسب میں شاعری کا حسن ھے ۔ ظاھر ھے کہ یہ تخئیل کا مرھون منت ھے ۔

شعر و شاعری کی اھمیت کو واضح کرتے ھوئے شبلی نے تشبیہہ و استعارہ پر بھی بڑی خیال انگیز بحث کی ھے ۔ آن کے خیال میں ”یہ چیزیں شاعری بلکہ عام زبان آوری کے خط و خال ھیں جن کے بغیر انشا پردازی کا کمال قائم نہیں رہ سکتا ۔ ایک عامی سے عامی بھی جب جوش یا غیظ و غضب سے لبریز ھو جاتا ھے تو جو کچھ اس کی زبان سے نکلتا ھے استعارات کا قالب بن کر نکلتا ھے ۔ غم و رنج کی حالت میں انشا پردازی اور تکلف کا کس کو خیال ھو سکتا ھے لیکن اس حالت میں بے اختیار استعارات زبان سے ادا ھوتے ھیں ۔“ اس کا ملطب یہ ھی ھے کہ استعارے کا وجود فطری طور پر ھوتا ھے اور شاعری میں اس کو شاعر کی وہ ذھنی کیفیت پیدا کرتی ھے جس سے وہ شاعری کرتے وقت دو چار ھوتا ھے ۔ اس میں اس کی شعوری کوشش شامل نہیں ھوتی ۔ تشبیہہ اور استعارہ کا حسن ان کی جدت اور ندرت میں ھے اور اس کا انحصار تمام تر شاعرانہ خیال کی جدت اور ندرت پر ھے ۔ یہ جدت اور ندرت اسی جدت اور آپچ کی پیداوار ھے جو شاعری کے لئے ضروی ھے ۔ اسی کو نیا اسلوب اور نیا انداز کہتے ھیں ۔ نئے اسلوب اور نئے انداز کے بغیر شاعری میں دلکشی پیدا نہیں ھو سکتی ۔

اس انداز اور اسلوب کی تشکیل و تعمیر میں الفاظ بڑا کام کرتے ھیں ۔ کیونکہ الفاظ کا حسن ھی شاعری کو دلکش بناتا ھے ۔ حسن الفاظ کے بغیر اچھی او دلکش شاعری کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ۔ شبلی نے اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ھوئے سب سے پہلے ابن رشیق کی کتاب العمدہ کے باب فی اللفظ والمعنی کا خلاصہ پیش کیا ھے ۔ اس باب کا بنیادی خیال یہ ھے کہ لفظ جسم ھے اور مضموں روح ۔ دونوں میں جسم اور روح کا تعلق ھے ۔ اگر ایک میں کمزوری ھوتی ھے تو دوسرا بھی کمزور معلوم ھوتا ھے ۔ اس مثال سے یہ بات واضح ھے کہ موضوع اور لفظ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ھم آھنگ ھیں ۔ لیکن اھل فن

میں سے بعض لفظ کو مضمون پر اور بعض مضمون کو لفظ پر ترجیح دیتے ہیں۔ شبلی نے خود اس سلسلے میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ شاعری یا انشا پردازی کا مدار زیادہ تر الفاظ ہی پر ہے۔ گلستاں میں جو مضامین اور خیالات ہیں ایسے اچھوتے اور نادر نہیں لیکن الفاظ کی وضاحت اور ترتیب و تناسب نے ان میں سحر پیدا کر دیا ہے انہیں مضامین اور خیالات کو معمولی الفاظ میں ادا کیا جائے تو سارا اثر جاتا رہے گا۔" لیکن آگے چل کر یہ بھی لکھا ہے کہ "اس تقریر کا یہ مطلب نہیں کہ شاعر کو صرف الفاظ سے غرض رکھنی چاہئے اور معنی سے بالکل بے پروا ہوجانا چاہئے۔ بلکہ مقصود یہ ہے کہ مضمون کتنا ہی بلند اور نازک ہو لیکن اگر الفاظ مناسب نہیں ہیں تو شعر میں کچھ تاثیر پیدا نہ ہو سکے گی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ شبلی موضوع اور الفاظ دونوں کو اہمیت دیتے ہیں۔ لیکن ان دونوں کی مناسبت اور ہم آہنگی ان کے نزدیک ضروری ہے۔ مثلاً ان کے خیال میں محبت کے نازک اور لطیف خیالات و جذبات صرف نازک اور لطیف الفاظ ہی میں صحیح طور پر ادا ہو سکتے ہیں۔ ان کے لئے پر شوکت متین اور بلند الفاظ کا استعمال مناسب نہیں۔ شاعر اس کا شعور رکھتا ہے۔ اسی لئے اس کے لطیف جذبات لطیف الفاظ کے سانچے میں ڈھلتے ہیں۔ غزل کے لئے قصیدے کے الفاظ اور قصیدے کے لئے غزل کے الفاظ استعمال نہیں کئے جا سکتے۔ کیونکہ اس طرح مطلب تو شاید ادا ہو جائے لیکن شاعری میں متاثر کرنے اور دلوں میں جگہ بنانے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ شاعر سب سے پہلے ان باتوں کا خیال رکھتا ہے۔ الفاظ کی صوتی اہمیت اس پر واضح ہوتی ہے۔ معنی کے لحاظ سے الفاظ جو اثر کرتے ہیں وہ اس کا شعور رکھتا ہے فصیح اور مانوس الفاظ کے استعمال پر اسے قدرت حاصل ہوتی ہے اور وہ اس کی اہمیت کو سمجھتا ہے۔ اس سلسلے میں اسے کوئی بڑی کاوش نہیں کرنی پڑتی بلکہ ان باتوں کا جز بن جاتا ہے اور اسے سادگی ادا اور جدت ادا سے کام لینے اور شعر کے مختلف اجزا کو ترتیب دینے میں کوئی خاص دشواری پیش نہیں آتی۔

شبلی نے اس کے علاوہ شاعری میں واقفیت اور مبالغے کے موضوع

پر بھی بعض بڑی ھی بصیرت افروز باتیں کی ھیں - پہلے تو انہوں نے اس اختلاف کا ذکر کیا ھے جو واقفیت اور مبالغے کے علمبرداروں میں ھے اور پھر اس نتیجے پر پہنچے ھیں کہ ''شعر کی دو قسمیں ھیں تخئیلی اور غیر تخئیلی - تخئیلی میں واقع سے غرض نہیں ھوتی بلکہ زیادہ تر یہ مطمعِ نظر ھوتا ھے کہ قوت تخئیل کی قدر پرزور اور وسیع ھے - اس بنا پر اس قسم کی شاعری میں مبالغے سے کام لیا جائے تو بدنما نہیں لیکن وھاں بھی سامعین کی طبیعت پر استعجاب کا جو اثر پیدا ھوتا ھے وہ مبالغے کی وجہ سے نہیں بلکہ قوت تخیل کی بنا پر ھوتا ھے - لیکن اور اقسام شاعری مثلاً فلسفیانہ، اخلاق، تاریخی، عشقیہ، نیچرل ان میں مبالغہ بالکل لغو چیز ھے - اس لئے اگر شعر میں مبالغہ جائز بھی ھو تو صرف شعر کی ایک خاص نوع (تخئیل) میں ھوگا - اس سے عام خوبی نہیں ثابت ھوسکتی -'' اس بیان سے صاف ظاھر ھوتا ھے کہ شبلی شاعری میں اصلیت اور واقفیت کو ضروری خیال کرتے ھیں - کیونکہ زندگی اور خصوصاً داخلی اور جذباتی زندگی کی اصلیت اور واقعیت سے بھرپور ترجمانی ھی اس کا مقصد ھے - لکھتے ھیں ''شاعری سے اگر صرف تفریح خاطر مقصود ھو تو مبالغہ کام آ سکتا ھے لیکن وہ شاعری جو ایک طاقت ھے، جو قوموں کو زیر و زبر کر سکتی ھے، جو ملک میں ھلچل ڈال سکتی ھے، جس سے عرب قبائل میں آگ لگا دیتے تھے، وہ واقعیت اور اصلیت سے خالی ھو تو کچھ کام نہیں کرسکتی - جاھلیت میں ایک شعر ایک معمولی آدمی کو تمام عرب میں روشناس کر دیتا تھا - بخلاف اس کے ایران کے شعرا نے جن ممدوحوں کی تعریف میں دفتر کے دفتر سیاہ کر دیئے ان کا نام بھی کوئی نہیں جانتا - اس کی یہی وجہ ھے کہ شعرائے جاھلیت کے کلام میں واقعیت ھوتی تھی - اس لئے اس کا واقعی اثر ھوتا تھا - ایرانی شعرا باتوں کے طوطا مینا بناتے تھے جس سے دم بھر کی تفریح ھوسکتی تھی باقی ھیچ -'' اس سے یہ نتیجہ نکلتا ھے کہ باتوں کے طوطا مینا بنانا شاعری کا مقصد نہیں ھے - وہ صرف خیالی باتیں نہیں کرتی - اس میں محض مبالغہ ھی نہیں ھوتا - وہ تو حقیقت اور واقعیت کی ترجمانی کرتی ھے - اس کا مقصد تو اصلیت کو پیش کرنا

ھوتا ھے ۔ وہ قوموں کو زیر و زبر کر سکتی ھے۔ ملکوں میں ھلچل ڈال سکتی ھے ۔ اور اس طرح اس کے ھاتھوں زندگی میں ایک انقلاب برپا ھو سکتا ھے ۔

غرض شاعری ایک موثر چیز ھے ۔ وہ دلوں کو لبھاتی ھے اور جو اس پر چھا جاتی ھے ۔ اس کے اثرات کے نقوش دل و دماغ پر بڑے گہرے ھوتے ھیں۔ اس کے موثر ھونے کے اسباب بھی شبلی نے واضح کئے ھیں۔ ارسطو نے اپنی کتاب میں نقالی کا جو نظریہ پیش کیا ھے اس کی وضاحت کرتے ھوئے وہ لکھتے ھیں کہ ''ارسطو نے جو وجوہ بیان کئے ھیں گو بجائے خود صحیح ھیں لیکن شعر کی تاثیر انہیں باتوں (یعنی نقل اور موسیقیت) پر موقوف نہیں جن کی وجہ سے وہ دلوں کو متاثر کرتا ھے ۔'' اور پھر آگے چل کر اس خیال کا اظہار کیا ھے کہ ''شاعری کو جذبات سے تعلق ھے اس لئے تاثیر اس کا عنصر ھے ۔ شاعری ھر قسم کے جذبات کو برانگیختہ کرتی ھے ۔ اس لئے رنج ، خوشی ، جوش ، استعجاب ، حیرت میں جو اثر ھے شعر میں بھی وھی اثر ھوتا ھے ۔ مصورانہ شاعری اس لئے دل پر اثر کرتی ھے کہ جو مناظر اثر انگیز ھیں شاعری ان کو پیش نظر کر دیتی ھے ۔ بادِ سحر کے جھونکے ، آبِ رواں کی رفتار ، پھولوں کی شگفتگی ، غنچوں کا تبسم ، سبزے کی لہلہاھٹ ، خوشبوؤں کی لپٹ ، بادل کی پھوار ، بجلی کی چمک یہ منظر آنکھوں کے سامنے ھو تو دل پر وجد کی کیفیت طاری ھو جائے گی ۔ شاعری ان منظر کو بعینہ پیش کر دیتی ھے اس لئے اس کی تاثیر سے کیونکر انکار ھو سکتا ھے ۔ شاعری صرف محسوسات کی تصویر نہیں کھینچتی بلکہ جذبات اور احساسات کو بھی پیش نظر کر دیتی ھے ۔ اکثر ھم خود اپنے نازک اور پوشیدہ جذبات سے واقف نہیں ھوتے یا ھوتے ھیں تو صرف ایک دھندلا دھندلا سا نقش نظر آتا ھے ۔ شاعری ان پس پردہ چیزوں کو پیش نظر کر دیتی ھے ۔ دھندلی چیزیں چمک اٹھتی ھیں مٹا ھؤا نقش اجاگر ھو جاتا ھے ۔ کھوئی ھوئی چیز ھاتھ آجاتی ھے ۔ خود ھماری روحانی تصویر جو کسی آئینے کے ذریعے سے ھم نہیں دیکھ سکتے شعر ھم کو دکھا دیتا ھے ۔'' ان چند

جملوں میں شبلی نے شعر کی تاثیر کے موضوع پر بڑی ہی پتے کی باتیں کی ہیں ۔ شاعری میں جذبات کی اہمیت مسلم ہے ۔ انسانی زندگی میں جذبات کی اہمیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا ۔ شاعری ان جذبات کی ترجمانی کرتی ہے ۔ انہیں جذبات سے اس کا ہیولا تیار ہوتا ہے ۔ انسان کی جذباتی زندگی سیدھی اور سپاٹ نہیں ہوتی ۔ وہ تہہ در تہہ ہوتی ہے ۔ صرف شاعری ہی زندگی کی اس کیفیت کو پیش کر سکتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ جو کچھ انسان کے دل میں ہوتا ہے اس کی جھلک آسے شاعری میں نظر آتی ہے ۔ چنانچہ وہ اس سے متاثر ہوتا ہے ۔ ساتھ ہی وہ اس کے ذوق جمال کی تسکین کا باعث بھی بنتی ہے ۔ اس میں اس کے موثر ہونے کا راز ہے ۔

شاعری چونکہ مؤثر ہوتی ہے اس لئے شبلی نے آسے ایک قوت بتایا ہے ۔ ان کے خیال میں اس قوت سے بڑے بڑے کام کئے جا سکتے ہیں ۔ بشرطیکہ اس کا استعمال صحیح طور سے کیا جائے ۔ اس سے زندگی بسر کرنے کی خواہش بیدار ہو سکتی ہے ۔ اقدار خیر کے فروغ کے لئے افراد کو آکسایا جا سکتا ہے ۔ شریفانہ اخلاق پیدا کیا جا سکتا ہے ۔ فلسفیانہ حقائق ذہن نشین کئے جا سکتے ہیں ۔ غرض شاعری زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کرتی ہے اور اس کا اثر بہت گہرا اور دیرپا ہوتا ہے اس لئے اس کی عظمت ہر زمانے میں محسوس کی گئی ہے ۔

یہ تنقیدی نظریات ہیں جو شبلی نے شعرالعجم میں پیش کئے ہیں ۔ اور ان میں سے ہر ایک پر بڑی بصیرت افروز اور خیال انگیز بحث کی ہے اس بحث میں ایک متوازن انداز اور ایک مربوط کیفیت ہے ۔ اس سلسلے میں انہوں نے جو بات کہی ہے وہ مدلل ہے ۔ اس میں شروع سے آخر تک ایک منطقی انداز بھی پایا جاتا ہے ۔ ان خیالات کی وضاحت انہوں عربی اور فارسی شاعری کی مثالوں سے کی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی یہ بحث مشکل خشک اور بے مزہ نہیں ہے ۔ اس سے شعر و شاعری کے بعض پیچیدہ مسائل کی گتھیاں سلجھتی ہیں اور پڑھنے والے کو روشنی کا احساس ہوتا ہے ۔ آن کے ان خیالات اور نظریات میں وسیع مطالعے کا بڑا ہاتھ ہے ۔ عربی اور فارسی تنقید کو انہوں نے خاص طور پر اپنے پیش نظر رکھا

ہے - عربی کے توسط سے وہ یونانی تنقید سے بھی آشنا ہوئے ہیں - اور تنقید کے اثرات بھی ان کے خیالات و نظریات میں جگہ جگہ نظر آتے ہیں - کہیں کہیں مغربی اثرات کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے - لیکن ان اثرات کے باوجود شبلی کی انفرادیت ان میں ہر جگہ نمایاں ہے - یہ ان کی شخصیت اور مزاج کی پیداوار ہیں - اس میں ان کے زمانے کی بدلتی ہوئی صورت حال کا بڑا ہاتھ ہے - جذباتی زندگی کا احساس اور عمرانی حالات کا شعور اُن میں ہر جگہ موجود ہے اور ان میں جو گہرائی اور گیرائی پائی جاتی ہے وہ اسی احساس و شعور کا نتیجہ ہے -

نظریاتی اور اصولی تنقید کے ساتھ ساتھ شبلی کے یہاں عملی تنقید کے بھی بہت اچھے نمونے ملتے ہیں اور اس لحاظ سے شعرالعجم اُن کی ایک اہم کتاب ہے - اس کتاب میں جہاں انہوں نے مختلف شعرا کا تذکرہ کیا ہے وہاں ان کے کلام کی خصوصیات بھی واضح کی ہیں - ان تحریروں سے ان کی عملی تنقید کا اندازہ ہو جاتا ہے - کسی تنقیدی خیال کا اظہار کرتے ہوئے وہ ان اصولوں کا ضرور خیال رکھتے ہیں جن کو انہوں نے شاعری کے لئے ضروری قرار دیا ہے - مثال کے طور پر ان کے نزدیک شاعری زمانے کا ساتھ دیتی ہے - اسی لئے اس میں نئے نئے مضامین پیدا ہوتے ہیں - چنانچہ شاعروں کے تذکرے میں ان کی نظر انہیں نئے مضامین کی جستجو کرتی ہے - ردوکی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس نے "کثرت سے نئے نئے مضامین پیدا کئے ہیں -" شاعری میں واقعیت ان کے نزدیک ضروری ہے - چنانچہ رودکی ہی کے تذکرے میں لکھتے ہیں کہ "اس میں متانت اور واقفیت پائی جاتی ہے -" اس طرح فرخی کے بارے میں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ "اس نے واقعہ نگاری کو بہت ترقی دی - ان کے خیال میں شاعری کی ضروری شرط اسلوب بیان کی جدت اور دل آویزی ہے - سنائی کے کلام میں انہیں یہ خصوصیت نہیں ملتی چنانچہ لکھتے ہیں " تشبیب اور قصائد میں انہوں نے کوئی جدت پیدا نہیں کی - لیکن پختگی، برجستگی اور صفائی میں ان کا کلام تمام معاصرین سے ممتاز ہے -" شعرالعجم کی جلد میں اس قسم کے تنقیدی فقروں سے

بھری پڑی ھیں - مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ان کی یہ عملی تنقید تجزیاتی نہیں ھے - اس میں تشریحی پہلو غالب نظر آتا ھے - لیکن اس تشریح میں شبلی کی نظر اس تنقیدی حقیقت تک پہنچ جاتی ھے جو کسی شاعر کے کلام میں موجود ھے - عملی تنقید سے یہی شبلی کا مقصد ھے - ظاھر ھے کہ شعر العجم بنیادی طور پر ایک تنقیدی کتاب نہیں ھے - وہ تو فارسی شاعری کی تاریخ ھے - اگر وہ خالص تنقیدی کتاب ھوتی تو تنقیدی پہلو اس میں نسبتاً زیادہ نمایاں ھوتا - پھر بھی جو کچھ انہوں نے فارسی شاعری کی اصناف اور فارسی کے مختلف شعرا کے بارے میں لکھا ھے اس میں تنقیدی اعتبار سے بصیرت افرور باتیں ملتی ھیں - ھر چند کہ ان کی یہ باتیں اشاروں کی صورت میں ھیں - کہیں کہیں ان میں تاثراتی رنگ بھی پایا جاتا ھے - لیکن اس سے ان کی تنقیدی اھمیت میں فرق نہیں آتا بلکہ ان کے یہ اشارے اور تاثراتی فقرے تو تنقیدی اعقبار سے زیردہ بصیرت افروز اور خیال انگیز نظر آتے ھیں -

غرض شبلی کی تنقیدی اھمیث سے انکار نہیں کیا جا سکتا - آردو تنقیدی روایت میں ان کی تنقید نگاری اپنا ممتاز مقام رکھتی ھے - آنہوں نے اس زمانے میں تنقید کی طرف توجہ کی جب اس میں تنقیہ کی روایت عام نہیں تھی - ان کا زمانہ تنقیدی اعتبار سے اھم زمانہ ھے - حالی اور آزاد نے اس زمانے میں تنقید کا ماحول پیدا کیا ھے - شبلی کی تنقیدی تحریر میں بھی اس میں برابر کی شریک رھی ھیں - انہوں نے نظریاتی اور عملی دونوں اعتبار سے آردو تنقید میں اضافہ کیا ھے - ان کی تنقید تجزیاتی نہیں ھے - اسی لئے آس میں گھرائی کم ھے - لیکن تشریحی اور تاثراتی انداز میں انہوں نے جن خیالات کا اظہار کیا ھے ، ان میں تنقید کا ایک ایسا نیا اسلوب پایا جاتا ھے جس سے آردو تنقید اب تک ناآشنا تھی -

علی گڑھ سے ایک خط

خان بہادر ڈاکٹر شیخ محمد عبداللہ

عبداللہ لاج میرس روڈ
علی گڑھ
۲۹-۱۰-۵۷

مائی ڈیر عطا اللہ اسلام علیکم ورحمتہ اللہ

مولانا شبلی مرحوم و مغفور کے متعلق میں نے اپنی یاد کے متعلق جو نوٹ آپ کو لکھ کر بھیجا تھا اس میں مولوی سلیمان ندوی مرحوم کے خیالات کا بھی حوالہ دیا ہے جو وہ سر سید کے متعلق رکھتے تھے - آج شیخ محمد اکرام صاحب کا ایک مضمون اخبار ''علیگ'' میں چھپا ہے جس کی ایک کاپی آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں ۔ اس کو آپ ملاحظہ فرما لیجئے یہ آپ کے خیالات کی تائید ہے آخر میں ایک نوٹ کا میں بھی اضافہ کرنا چاہتا ہوں جو سر سید رح کی وصیت کے موافق میں نے متعدد مرتبہ اپنے مضامین اور اپنی تقریروں میں بیان کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ سر سید کی آخیر زندگی میں اُن کے وصال سے قریب دو سال قبل مجھ سے بعض اشخاص نے کہا کہ آپ اکثر سرسید سے ملنے جاتے ہیں اُن سے دریافت کر لیجئے کہ اُن کی سیاسی پالیسی ایمانداری پر مبنی ہے یا انگریزوں کی خوشامد پر '' اس کے بعد ایک روز میں خاص اس غرض سے اُن کے پاس گیا تاکہ میں اس معاملے میں ان سے کچھ دریافت کر لوں ۔

چنانچہ جب میں سرسید کی خدمت میں پہنچا تو متعدد آدمی وہاں بیٹھے تھے ۔ میں نے عرض کیا کہ میں آج ایک خاص معاملے میں آپ کے خیالات سے واقفیت حاصل کرنا چاہتا ہوں ۔ لیکن بالکل تنہائی میں کوئی دوسرا نہ ہو ۔ سرسید نے اُن اصحاب سے جو وہاں موجود تھے

فرمایا کہ آپ صاحبان تھوڑی دیر کے لئے دوسرے کمرے میں بیٹھ جائیے تاکہ ان کی خواہش کے مطابق ان کو موقع مل جائے کہ یہ جو کچھ دریافت کرنا چاہتے ہیں وہ کریں ۔ اس پر دیگر احباب وہاں سے چلے گئے اور سر سید اکیلے رہ گئے ۔ سر سید نے فرمایا کہ اب کہئے کیا کہتے ہیں ۔ میں نے عرض کیا کہ لوگوں کی زبان سے آپ کے سیاسی خیالات کے متعلق جو باتیں سنی ہیں اُن کے بارے میں کچھ دریافت کرنے کے لئے حاضر ہؤا ہوں ۔ بہت نوازش ہوگی کہ آپ مجھے اپنے سیاسی خیالات کے بارے میں بتائیں کہ کانگرس سے مخالفت آپ کی ذاتی رائے ہے یا انگریزوں کے خوش کرنے کے لئے آپ مخالفت کر رہے ہیں ۔ سر سید نے فرمایا کہ ”زندہ باش تم نے اس معاملے کو میرے سامنے پیش کیا ورنہ اور لوگ تو پیٹھ پیچھے میری برائی سن لیتے ہیں لیکن مجھ سے آ کر نہیں پوچھتے کہ تمہارے کیا خیالات ہیں ۔ میں بھی سن رہا ہوں کہ لوگوں کے یہ خیالات ہیں کہ انگریزوں کی خوشامد کی وجہ سے میں کانگریس کی مخالفت کر رہا ہوں لیکن میں اگر اخبارات میں کچھ لکھوں تو مخالفین ایک بحث و مناظرے کا پیرایہ اختیار کریں گے اور تو تو میں میں تک نوبت پہنچ جائے گی ۔ میں نے تم کو اپنی سچی رائے اور دلی خیالات کا امین قرار دے دیا ہے ۔ اب یا میرے بعد جب کوئی میری نسبت یہ کہے کہ میں انگریزوں کو خوش کرنے کے لئے کانگریس کی مخالفت کر رہا ہوں تو تم اس کی شہادت دینا کہ یہ رائے غلط ہے ۔ کانگریس سے جو میری مخالفت ہے وہ میرے سچے خیالات پر مبنی ہے نہ کہ کسی کی خوشامد پر“ میں کانگریس کے نظریہ سے اس لئے اختلاف رکھتا ہوں کہ انگریزوں کے بعد اکثریت کی حکومت مسلمانوں کے لئے سم قاتل ثابت ہوگی ۔ یہ مخالفت ہندوؤں کی مخالفت نہیں ہے بلکہ ہر اُس شخص سے مخالفت ہے جو اکثریت اور اقلیت کے اصول پر ہندوستان جیسے ملک میں ملکی انتظام کا حامی ہے ۔

میں اپنی آنکھ سے دیکھ رہا ہوں کہ مسلمانوں کی ہر چیز سے مخالفت ہے تو میں اُس کا ساتھ کس طرح دے سکتا ہوں ۔ آگے چل کر

جو کچھ ہونا ہوگا وہ ہو جائے گا لیکن اس وقت کانگریس کا ساتھ دینا مسلمانوں کے گلے پر چھری پھیرنا ہے - یہ ممکن ہے کہ ہندوستان میں کسی وقت اتحاد خیال اور اتحاد عمل ہو جائے اور ایک پارلیمنٹ کی حکومت ہندوستان میں قائم ہوجائے تو اس سے بہتر کوئی بات نہ ہوگی لیکن موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے یہ اُمید بالکل موہوم معلوم ہوتی ہے -

آپ شیخ محمد اکرام صاحب کے ساتھ میرا یہ نوٹ بھی اپنے مضمون میں اضافہ کر سکتے ہیں - میں سر سید کی رائے کا امین ہوں جو میں نے آپ کے سامنے پیش کی ہے آپ اس کا پرچار کیجئے تو آپ کو ثواب ہوگا - اُمید ہے آپ بخیریت ہوں گے میں بفضلہ تعالیٰ خیریت سے ہوں والسلام -

آپ کا مخلص
عبداللہ
(خان بہادر ڈاکٹر شیخ عبداللہ ایڈوکیٹ)

سر سید کا مذہب

سر سید کے مذہب کے بارے میں مولوی صاحبان کے جو خیالات رہے ہیں وہ دنیا میں کوئی نئی بات نہیں ہے - ہر مذہب کے ریفارمروں کا یہی طریقہ رہا ہے کہ وہ جس بات کو اہل مذہب کے لئے ضروری سمجھتے تھے انہوں نے اس کا وعظ کیا اور اس کی تبلیغ کی - لیکن مذہب کے پرانے علماء اور پیشواؤں نے ہر ریفارمر کو اذیت پہنچائی اور بعضوں کو جان سے بھی مار ڈالا اور اس کا سب سے پہلا نمونہ حکیم سقراط کا ہے - سقراط نے آکر وعظ کیا کہ جو کچھ تم مذہب کے متعلق لوگوں کو بتا رہے ہو وہ غلط ہے - انہوں نے اپنا تو کوئی خاص طریقہ یا مذہب نہیں پیش کیا تھا بلکہ قدیم مذہب کی خامیاں لوگوں پر ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہے - آخر کو پرانے خیالات کے لوگوں نے ان پر مذہبی اور قومی پنچایت کے سامنے مقدمہ دائر کیا کہ یہ نوجوانوں کے دلوں پر ہمارے مسلم طریقوں کے خلاف اثر پیدا کرنے کی کوشش

کر رہے ہیں پنچایت بھی پرانے لوگوں کے ہاتھ میں تھی اس لئے پنچایت نے حکم دیا کہ ان کو زہر کا پیالہ پلا کر جان سے مار دیا جائے۔ چنانچہ سقراط کو ایک زہریلی بوٹی کا رس نکال کر پیالے میں ڈال کر جلادوں کے ذریعہ سے زہر کا پیالہ پینے پر مجبور کیا۔ وہ زہر کا پیالہ پی کر ہمیشہ کے لئے سو گئے۔ دوسرا واقعہ حضرت ابراہیم کا ہے کہ ان کے زمانے میں نمرود بادشاہ نے خدائی کا دعویٰ کیا لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کو تسلیم نہیں کیا اور وہ اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ تیسرا بڑا واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ہے ان واقعات کے علاوہ بیسیوں واقعات یہود میں اور مسلمانوں میں ہیں کہ انہوں نے اصلاح کا پرچار کرنے میں اپنی جانیں قربان کیں۔ یورپ میں عیسائی مذہب نے تو اس مذہبی اختلاف کی وجہ سے ہزاروں جانیں لیں۔ لوگوں کو زندہ جلایا اور لوہے کے وزنی ٹکڑے باندھ باندھ کر تالابوں دریاؤں اور سمندروں میں لوگوں کو پھینکا اور وہ ڈوب کر مر گئے۔ اسلام میں سب سے بڑا واقعہ شمس تبریز کا ہے اور بھی متعدد نہایت تکلیف دہ واقعات ہیں۔ اب سر سید کا جو واقعہ ہے ہماری آنکھوں نے دیکھا ہے۔ سر سید نے نہ کسی نئے مذہب کی تبلیغ کی اور نہ کوئی کتاب پیش کی لیکن اس پر بھی مولویوں نے اُن کے خلاف طوفان برپا کر دیا۔ کفر کے فتوے دئے دلخراش مضامین لکھے۔ سر سید کے چھوٹے سے فوٹو پر گز بھر کی داڑھی لگا اس کے اوپر لکھا کہ ''شیطان الرجیم'' لیکن بڑے جید علماء نے کفر کے فتوؤں پر دستخط نہیں کئے۔ حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ بانی مدرسہ دیو بند سے علماء نے کہا کہ سر سید کے خلاف کفر کے فتوے پر آپ بھی دستخط کر دیجئے۔ انہوں نے فرمایا کہ میں تحقیقات کر لوں کہ آیا وہ کافر ہیں بھی یا نہیں چنانچہ حضرت مولانا محمد قاسم مرحوم مغفور نے تین سوالات لکھ کر سر سید کے پاس بھیجے وہ مع جوابات کے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:

(۱) سوال۔ خدا پر آپ کا کیا عقیدہ ہے؟

جواب۔ خداوند تعالیٰ ازلی ابدی مالک وصانع تمام کائنات کا ہے۔

(۲) سوال - محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق آپ کا کیا عقیدہ ہے؟

جواب - بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر -

(۳) سوال - قیامت کے متعلق آپ کا کیا عقیدہ ہے ؟

جواب - قیامت برحق ہے -

اس کے بعد مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ نے ان لوگوں سے کہا (جن لوگوں نے سر سید کے خلاف فتوے پر مولانا سے دستخط کرانا چاہتے تھے) کہ تم اس شخص کے خلاف دستخط کرانا چاہتے ہو جو پکا مسلمان ہے -

میری اپنی ذاتی ایمانی شہادت ہے کہ میں نے سر سید کو مسجد میں مسلمانوں کے ساتھ نماز پڑھتا ہؤا دیکھا - کالج کے طالب علم سالانہ محفل میلاد منعقد کرتے تھے اس میں سر سید آ کر بیٹھتے تھے اور آخیر تک بیٹھے رہتے تھے - سلام کے موقع پر سب کے ساتھ کھڑے ہو جاتے تھے اور سب کے ساتھ بلند آواز سے سلام پڑھتے تھے - میں یہ بھی شہادت دیتا ہوں کہ جب ان کا وصال ہؤا تو جنازے کی نماز میں کالج کے طلباء اور علی گڑھ شہر کے بہت سے لوگ آ کر شریک ہوئے - ایک شخص جلدی سے ہمارے ایک عالم مولوی الطاف علی کے پاس آئے مولوی الطاف علی صاحب ہمارے اسکول میں معلم تھے) اور ان سے دریافت کیا کہ سر سید پر کفر کا فتویٰ لگا ہؤا ہے ان کے جنازے کی نماز حرام ہے - آپ نماز میں شریک ہوں گے یا نہیں اور مجھے کیا رائے دیتے ہیں - مولوی الطاف علی صاحب نے فرمایا کہ سر سید نہایت پکے مسلمان تھے اور شاہ غلام علی دھلوی کے مرید تھے - ان کے جنازے کی نماز پڑھنا ہر مسلمان پر واجب ہے - جس شخص نے سوال کیا تھا اس نے کہا کہ اگر سر سید ''شاہ غلام علی دھلوی کے مرید تھے تو میں ضرور نماز میں شریک ہوں گا'' اور وہ فوراً صف میں کھڑا ہوگیا اور نماز جنازہ ادا کی -

مولانا محمد شبلی نعمانی

محمد حبیب اللہ خان

مولوی شبلی صاحب (اُس زمانہ میں وہ اسی نام سے علی گڑھ میں مشہور تھے - آج کل تو ہر کس و ناکس اپنے آپ کو مولانا کے معزز لقب سے ملقب کرتا ہے حتیٰ کہ عربی مدارس کے طلبہ میزان منشعب پڑھنے کے بعد ہی مولانا ہو جاتے ہیں لیکن علی گڑھ میں تو مولانا مفتی محمد لطف اللہ صاحب رح جیسے متبحر عالم بھی صرف مولوی لطف اللہ صاحب کہلاتے تھے) یکم فروری ۱۸۸۳ء میں مولوی فیض الحسن صاحب (سہارن پوری) مشہور ادیب عربی کی سفارش پر اسسٹنٹ پروفیسر عربی مقرر ہو کر علی گڑھ آئے - تقریباً تین سال بعد جب مولوی محمد اکبر صاحب (کاندھلوی) منیجر و پروفیسر عربی کا انتقال ہوگیا تو مولوی شبلی صاحب مستقل عربی پروفیسر ہوگئے - مولوی شبلی شروع میں شہر میں رہے بعد میں سر سید نے اپنی کوٹھی کے احاطے میں ایک چھوٹی بنگلیا مولانا کو بلا کرایہ دے دی -

مولوی صاحب کے جوہر قابلیت کو سر سید نے شروع سے پر کھ لیا تھا اور اب جبکہ وہ سر سید کے قریب رہنے لگے تھے ان کی آمدورفت بھی موصوف کی خدمت میں بہت کثرت سے ہوئی - مجھ میں یہ قابلیت نہیں کہ مولوی صاحب کے تبحر علمی کی بابت کچھ لب کشائی کر سکوں یا ان کی بلند پایہ تصانیف کی بابت کچھ عرض کروں - وہ تو علی گڑھ کے چند سالہ قیام کے بعد ہی تمام ملک میں مشہور ہو گئے تھے - اور سفر شام و روم کے بعد تو ان کی شہرت بلاد اسلامیہ میں پہنچ چکی تھی - یہاں میں ان کے چند اوصاف کی طرف مختصر اشارہ کروں گا -

میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ علمی حیثیت سے وہ فارسی میں زیادہ ممتاز تھے یا عربی میں - بہر حال جو کچھ بھی وہ پڑھاتے تھے اُس سے عربی

اور فارسی دونوں قسم کے طالب علم مطمئن ہو جاتے تھے اور طلباء میں یہ عام خواہش تھی کہ ان کی کلاس مولوی شبلی ہی کے سپرد ہو۔ لیکن بیک صاحب پرنسپل بلحاظ ضرورت ان دونوں عالموں میں یعنی مولانا شبلی اور مولوی عباس حسین صاحب میں پلہ برابر رکھتے تھے۔ مولوی شبلی کو خدا نے لحن داؤدی سے بھی کچھ حصہ بخش دیا تھا۔ جس کی وجہ سے طلبا ان سے زیادہ گرویدہ رہتے تھے اور مولوی صاحب بھی طلبہ کی اس خواہش کو بہت خوشی کے ساتھ پورا کر دیتے تھے۔ مولانا فارسی قصائد وغیرہ نہایت دلکش لہجہ میں خود پڑھتے تھے۔ اس کے بعد ضروری نکات بیان کر دیتے تھے۔ جس سے طلبہ کے ذہن میں نفس مضمون محفوظ ہو جاتا تھا۔ مولانا اس بات کی البتہ احتیاط فرماتے تھے کہ جس وقت وہ لحن کے ساتھ کچھ پڑھیں تو کمرے کے کواڑ پوری طرح سے بند کر دئے جائیں تاکہ ان کی آواز پرنسپل تک نہ پہنچے۔ لیکن یہ احتیاط مولوی صاحب کی صرف کالج کے تعلیمی اوقات میں تھی ورنہ کالج کے بڑے بڑے جلسوں اور یونین کی ریڈنگس میں وہ نہایت بلند اور خوش آہنگ لہجہ میں نظمیں پڑھا کرتے تھے کہ جس سے ہر درجہ اور مرتبہ کے لوگ نہایت محظوظ ہوتے تھے۔ نماز، خطبے اور تلاوت قرآن مجید میں بھی ان کی دلکش آواز سامعین اور نمازیوں کو ہمہ تن گوش بنا دیتی تھی۔ غرضیکہ مولانا کے اور اوصاف چھوڑ کر یہی ایک ایسا وصف تھا کہ جس سے وہ طلبہ میں بہت ہردلعزیز ہو گئے تھے۔ علاوہ بریں ان کی گفتگو عام جلسوں میں بہت ہی دلچسپ ہوتی تھی لیکن کلاس میں لحن داؤدی کا نتیجہ فی الجملہ اچھا نہ ہؤا۔ بعض نوخیز اور شوخ طلبہ ادب و وقار استاد قائم نہ رکھ سکے۔ یہاں پر ایک خاص واقعہ کا ذکر کرتا ہوں۔

مولوی صاحب سفر روم و شام سے واپس آئے تو انہوں نے کالج کے ایک جلسے میں اپنے مخصوص و دلکش لہجہ میں وہ نظم سنائی جو موصوف نے قسطنطنیہ میں سلطان عبد الحمید خان کا جلوس دیکھ کر اور اس سے متاثر ہو کر لکھی تھی۔ یہ نظم واقعی بہت اعلیٰ پایۂ کی اور دلاویز

تھی - اس جلسہ کے تھوڑے دن بعد یونین میں ایک ریڈنگ ہونے کو تھی جس کا اہتمام مولوی مظہرالحق کاندھلوی وائس پریذیڈنٹ کے ذمہ تھا - مظہرالحق کے ہم جماعت حامد علی خان فتح گڑھی (جن کو بررڈنگ ہاؤس میں منشی ستائیس کہہ کر پکارا جاتا تھا) موجود تھے - جب مولوی صاحب سے عرض کیا گیا کہ آپ اس ریڈنگ میں اپنی وہی نظم جس کا اوپر اشارہ ہے پڑھیں قو معلوم نہیں کہ مولانا اس وقت کس خیال میں تھے انہوں نے جواب دیا کہ میں سفر روم کی وجہ سے زیر بار ہوگیا ہوں اگر پچاس روپے کا انتظام کرو تو میں نظم پڑھوں گا - حامد علی خان میں تمسخر کا پہلو ہمیشہ غالب اور نمایاں رہتا تھا انہوں نے بلا تامل مظہر الحق کو مخاطب کرکے کہا کہ بھائی مظہر! (مظہرالحق کو زیادہ تر بورڈنگ ہاؤس میں بھائی بھشو Bhushoo کہتے تھے اور جو ان کا زیادہ ادب کرتے تھے وہ بھائی مظہر کہتے تھے) ساٹھ روپے کا چندہ کرو - پچاس روپے مولوی صاحب کی نذر کرنا اور سیتارام کو بھی بلا لو دس روپے اس کو دے دینا (اس زمانہ میں سیتا رام ساکن متھرا مشہور ہار مونیم بجانے والا تھا) اس طرح یہ جلسہ بہت کامیاب ہو جائے گا - مولوی صاحب کو حامد علی خان کے اس جملے سے ناگواری پیدا ہوئی اس وقت انہوں نے کلاس میں کچھ نہ کہا لیکن پرنسپل صاحب سے شکایت کی کہ حامد علی خان نے میرے ساتھ گستاخی کی - حامد علی خان کی طلبی پرنسپل صاحب کے سامنے ہوئی اور انہوں نے جو گفتگو کی تھی اس کا اقرار کیا مگر اس کے ساتھ یہ بھی کہا کہ ہمارے کلب میں سول اسٹیشن لیڈیاں اور جنٹلمین پیانو بجایا کرتے ہیں اس میں کیا ہرج ہوا کہ ایک مشہور ہارمونیم بجانے والا اپنا کمال اس ریڈنگ میں دکھلا سکے - اس جواب کے بعد بھی گو کہ مسٹر بیک نے کچھ تبسم کیا لیکن ڈسپلن قائم کرنے کے لئے پانچ روپے حامد علی پر جرمانہ کیا اور یہ بھی حکم دیا وہ مولوی سے تحریری معافی مانگیں - چنانچہ حامد علی خان نے جو معافی نامہ لکھا اس کا مضمون حسب ذیل تھا -

بخدمت جناب مولوی شبلی صاحب

سب الحکم عالی جناب والا مناقب معلی القاب مسٹر تھیوڈور بیک

صاحب پرنسپل کالج میں آپ سے معافی مانگتا ہوں ۔ فقط

اس معافی نامے میں حامد علی خان نے نہ تو اپنی گفتگو پر اظہار افسوس کیا اور نہ مناسب الفاظ لکھے ۔ ضابطہ میں تو یہ معاملہ ختم ہوگیا لیکن مولانا حامد علی خان سے کشیدہ ہوگئے ۔ مندرجہ بالا واقعہ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ طلبا کے ساتھ کلاس میں ایک مرتبہ زیادہ بے تکلف ہونے کے بعد کوئی استاد اپنا وقار قائم نہیں رکھ سکتا ۔ مولوی صاحب کا آخر زمانۂ قیام علی گڑھ میں عزت نفس کا احساس بہت تیز ہو گیا تھا ۔ مگر اس کا نتیجہ یہ ہؤا کہ اسی نسبت سے طلبہ میں ان کی ہر دلعزیزی کم ہوتی گئی ۔ طلبہ ان سے گستاخ ہونے لگے ۔ چانچہ ایک بڑے فوٹو گروپ لئے جانے کے موقع پر جس میں تمام اسٹاف کالج اور سر سید علیہ الرحمۃ بھی موجود تھے یہ واقع پیش آیا کہ دو طالب علم جن کا بورڈنگ ھاؤس کا نام بوم اور بومنی تھا ۔ فوٹو لیتے وقت مولوی شبلی صاحب کی کرسی کے اوپر کھڑے ہوگئے چونکہ بومنی خاص قسم کے طالب علم تھے جن کی طرف بوم اور مولانا زیادہ متوجہ ہوتے تھے اس لئے خیال ہوتا ھے کہ اپنی خصوصیت ظاہر کرنے کے لئے مولوی صاحب کے سر پر سایہ فگن تھے ۔ بوم تو بومنی کے ساتھ ہمیشہ منسلک ھی رہتے تھے اس منظر کو دیکھ کر ایک منچلے طالب علم (محمد داؤد مرحوم) نے جو کالج میں اپنی شاعری بالخصوص فی البدیہہ گوئی کی وجہ سے مشہور تھے ۔ شیخ سعدی کا مشہور مصرعہ ”کس نیاید بہ زیر سایۂ بوم“ پر حسب ذیل تضمین فوراً کر دی اور اس کو ایک ذریعہ خاص سے مولوی صاحب کی خدمت میں پہنچا دیا گیا :

آج کالج میں مچ رہی تھی دھوم
طلبا کا تھا ہر طرف سے ھجوم

بول اٹھی روح سعدئ مرحوم
”کس نیاید بزیر سایۂ بوم“

الا مولانا شبلیؒ مخدوم

ان اشعار میں مولانا کی کوئی توہین نہ تھی لیکن اس پر بھی انہوں نے بہت برا مانا مگر چارۂ کار کچھ نہ تھا کیونکہ شاعر کے خلاف ضابطے کی کوئی گرفت نہیں ہو سکتی تھی ۔

خود داری اور عزت نفس نہایت عمدہ اوصاف ہیں لیکن جب یہ اپنی حدود سے بڑھ جاتے ہیں تو کبر و نخوت اس کی جگہ لے لیتے ہیں ۔ مولانا خود اپنے آپ کو آخرالذکر رذائل سے پاک سمجھتے تھے لیکن اس کے ساتھ ان کو یہ معلوم ہوگیا تھا کہ لوگ علی العموم ان کو مغرور سمجھنے لگے ہیں اور ان کے مقابلہ میں مولوی خلیل احمد صاحب سنبھلی جو اسکول میں عربی کے استاد تھے منکسرالمزاج اور خلیق کہتے ہیں ۔ چنانچہ مولانا نے ایک مرتبہ میر ولایت حسین صاحب سے شکایت کی کہ میر صاحب ! عجیب نا انصافی کی بات ہے کہ لوگ مجھ کو تو مغرور کہتے ہیں اور مولوی خلیل احمد صاحب کو منکسرالمزاج ۔ حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہے ۔ میر صاحب نے جواب دیا کہ مولوی خلیل احمد صاحب دوسروں کی تعریف کرکے اور ان کو بڑا ظاہر کرکے اپنی بڑائی کا ایک پہلو نکال لیتے ہیں اور مثال کے طور پر مولوی بہار علی کا ذکر کیا کہ وہ مولوی خلیل احمد صاحب سے پرائیویٹ طور پر ایم ۔ اے کا عربی کورس پڑھا کرتے تھے اور مولوی خلیل احمد نے آن کا ذکر ان الفاظ میں کیا تھا ۔ کہ بہار علی کو پڑھانا بڑا ہی مشکل کام ہے وہ تو ہر سبق میں ایسی ایسی باریکیاں نکالتا ہے کہ ان کا جواب دینا مشکل ہوتا ہے ۔ وہ تو ایک بڑا پہلوان ہے جو مجھ سے کشتی لڑتا ہے اور مجھ کو پچھاڑنے کی کوشش کرتا ہے ۔

اس قسم کے بہت سے واقعات دلچسپ ہیں اور دل خراش بھی ۔ ہم صرف ایک واقعہ اور لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں ۔

سر سید علیہ الرحمۃ کا یہ معمول تھا کہ وہ چار بجے شام کالج کی زیر تعمیر عمارتوں کو دیکھنے روزانہ تشریف لے جایا کرتے تھے اس وقت ان کی کوٹھی پر جو کوئی ان کا مہمان وغیرہ موجود ہوتا اس کو اور

تعمیر کے سلسلہ کے اہلکاروں میں سے جس کی ضرورت ہوتی ان کو اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھا لیتے بعض اوقات مولانا شبلی بھی سر سید کے ساتھ آتے لیکن مولانا کو رفتہ رفتہ عزت نفس کا احساس اتنا شدید ہوگیا تھا کہ میر عمارت (کپتان محمد سعید خان) کا سر سید کے ساتھ گاڑی میں بیٹھنا بھی ناپسند تھا۔ ایک دو بار جب ایسا ہوا کہ ہلاسی مستری کو (جو محمد سعید خان کا دست راست تھا) سر سید نے اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھا لیا تو مولانا شبلی کے احساس عزت نفس کو بڑی ٹھیس لگی اور انہوں نے میر ولایت حسین صاحب سے (جن سے وہ اس قسم کی باتیں اکثر کیا کرتے تھے) کہا کہ میر صاحب! یہاں تک تو صبر کر لیا تھا کہ کپتان سر سید کے ساتھ گاڑی میں بیٹھیں لیکن اب تو ہلاسی صاحب بھی گاڑی میں رونق افروز ہوتے ہیں۔ بھلا، فرمائیے کہ اس کو کون گوارا کریگا کہ ہلاسی کا ہم نشین ہو۔ میر صاحب نے ہنس کر کہا کہ سر سید کے یہاں ایسی چیزوں کا کوئی خیال نہیں کیا جاتا۔

سطور بالا میں میں نے جو کچھ لکھا بہ حیثیت ایک طالب علم اور مولانا شبلی کے ادنیٰ شاگرد کے عرض کیا ہے اور یہ واقعات سماعی نہیں ہیں بلکہ ذاتی مشاہدہ پر مبنی ہیں۔ اب سطور ذیل میں جو کچھ میں عرض کروں گا وہ آن احساسات کے تاثرات ہیں جو علی گڑھ اور سر سید رحمہ کے ساتھ حیات شبلی کے مطالعہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان احساسات کو پردۂ اخفا میں رکھنا واقعات سے چشم پوشی اور اپنے ضمیر کے خلاف سمجھتا ہوں۔

مولف ''حیات شبلی'' (علامہ سید سلیمان ندوی) نے سر سید کی نسبت چند الزام قائم کئے ہیں جن کا خلاصہ ''شبلی نامہ'' میں شیخ محمد اکرام آئی۔ سی۔ ایس نے کیا ہے اور ہر ایک الزام کا مدلل اور مسکت جواب دیا ہے۔ مجھ کو اس وقت ان سب کی بابت یہاں پر کچھ کہنا ہے۔ اگر ان سب الزامات کی تحقیق کی جائے اور پھر ان پر تنقید کی جائے تو وہ ایک بڑا دفتر ہو جائے گا جن کا عشر عشیر بھی شبلی نمبر کے اوراق میں نہیں سما سکتا۔ میں صرف ایک خاص واقعہ کی بابت یہاں پر مختصر

عرض کرتا ھوں ۔ اس واقعہ کو شیخ محمد اکرام نے حیات شبلی سے شبلی نامہ میں اس طرح نقل کیا ھے ۔

”شبلی اور سر سید کے درمیان اس لئے بگاڑ ھوگیا کہ آخر عمر میں سر سید کی یہ بڑی خواھش تھی کہ ان کی سوانح عمری لکھی جائے ۔ وہ چاھتے تھے کہ یہ کام مولانا شبلی کریں ۔ مولانا اس سے پہلو بچاتے تھے ۔

جہاں تک مجھے علم ھے سر سید کی لائف لکھنے کا آغاز حاجی محمد اسمعیل خان رئیس دتاؤلی نے ۳ جون ۱۸۹۰ء میں کیا اور اخبار علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں انہوں نے مضمون شائع کر دیا ۔ اس مضمون کی تاریخ اشاعت اور سر سید کے آخری سال زندگی میں آٹھ برس کا زمانہ ھے ۔ جو مولانا کے سولہ سال قیام علی گڑھ کا پورا نصف حصہ ھے ۔ اس وقت تک مولانا سر سید سے اس قدر متاثر ھو چکے تھے کہ اس کو ھر شخص مولانا کی نظموں اور مضامین سے پڑھ کر اندازہ کر سکتا ھے ۔ وہ سر سید کے اعلیٰ درجہ کے مداحین میں شمار ھوتے تھے ۔ اس واقعہ کا تقاضہ قدرتی طور پر تو یہ ھے کہ مولانا بڑی خوشی سے سر سید کی فرمائش پوری کرتے اور آن کی سوانح عمری ایک دو برس میں تیار کر دیتے ۔ لیکن اگر اس فطری تقاضے کو چھوڑ دیا جائے تو لازمی طور پر یہ نتیجہ نکلے گا کہ ۱۸۹۰ء سے لے کر سر سید کی وفات تک پورے آٹھ برس مولانا اپنے اصلی جذبات کو اپنے سینہ میں اس طرح چھپائے رھے کہ کبھی کسی کو شائبہ بھی نہ ھوا کہ سر سید مولانا سے بوجہ عدم تعمیل فرمائش نا خوش ھوئے ھیں ۔ نیز مولانا کے علم و فضل اور دینی حیمت سے یہ بعید معلوم ھوتا ھے کہ باوجود باھمی کشمکش کے وہ پچھلے آٹھ برس تک اپنا قیام علی گڑھ میں کس طرح کرسکے ۔ حالانکہ اس درمیان میں انہوں نے متعدد موقعوں پر سر سید اور کالج کی ایسی تعریف نظم و نثر کی ھے جو واقعی ھونے کے علاوہ بلند پایہ ھے ۔ مثلاً مولانا کی وہ تقریر جو انہوں نے مبارک باد کے جلسہ میں کی جو اسٹاف کی طرف سے مولانا کو خطاب شمس العلما ملنے پر منعقد کیا گیا تھا اور جس میں

انہوں نے کالج اور سر سید کو شاندار الفاظ میں یاد کیا ہے ۔ ان واقعات پر غور کرنے کے بعد میں نہیں سمجھ سکتا کہ مندرجہ بالا الزام کسی انصاف پسند آدمی کے نزدیک ثابت ہو سکتا ہے ۔ یہ بات ہی سمجھ سے باہر ہے کہ ایسے ناسازگار حالات میں مولانا کس طرح آٹھ برس علی گڑھ میں گزار سکے ۔

سر سید کی خواہش اپنی لائف لکھوانے کی بابت (اگر یہ بات صیح مان لی جائے ایک لمحہ کےواسطے) تو اس وہ پورا دیباچہ جو مولانا حالی نے ''حیات جاوید'' کا لکھا ہے اور جس میں ہر ضروری تفصیل صداقت کے ساتھ درج ہے علامہ سلیمان صاحب کے نتائج کو صحیح نہیں ثابت کرسکتا ۔ علامہ صاحب نے حیات جاوید ملاحظہ فرمائی تھی اور دیباچہ پر بھی حرف گیری کی ہے لیکن افسوس کی جن اقتباسات کو انہوں نے دیباچہ سے حیات شبلی میں درج کیا ہے وہ نہایت کتر بیونت کے ساتھ ادھورے پیش کئے گئے ہیں اور بعینہہ اس طرح کے ہیں کہ کوئی شخص نعوذ باللہ یہ کہے کہ قرآن میں تو نماز پڑھنے کی ممانعت ہے اور اپنے لغو و لاطائل دعویٰ کی تائید میں قرآن کا ایک حصہ (لاتقربوالصلوۃ) پڑھے اور (انتم سکاراٰی) کو حذف کر دے ۔

اگر سر سید کو اپنی لائف لکھانے کا شوق ایسا ہی دامن گیر ہوتا جیسا کہ علامہ سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے تو حالی کو جو واقعی فن سوانح نگاری میں مولانا شبلی سے کسی طرح کم رتبہ نہیں رکھتے ہیں کیوں نہ اس کام کے واسطے کہہ دیتے جب کہ خود مولانا حالی کو اس کام کرنے کا خیال (سر سید کی لائف لکھنے کا خیال) مدرسۃالعلوم کے قائم ہونے کے بعد ہوا تھا ۔

حرف آخر کی بابت میں یہ مناسب خیال کرتا ہوں کہ مولانا حالی نے حیات جاوید کے دیباچہ میں اس مسئلہ کی بابت جو کچھ لکھا ہے اس کا ملخص یہاں پیش کرتا ہوں ۔

راقم کو سر سید کی زندگی کے حالات لکھنے کا خیال پہلے پہل اس

وقت پیدا ہوا تھا جب کہ وہ اپنے سب سے بڑے اور سب سے زیادہ مفید کام کی بنیاد ڈال چکے تھے - مدرسۃ العلوم علی گڑھ قائم ہو چکا تھا اور باوجود سخت مخالفتوں کے بہت تیزی کے ساتھ ترقی کرتا جاتا تھا اور اس کے ساتھ تہذیب الاخلاق میں سر سید کی دل نشیں تحریریں جیسی کہ اردو زبان میں پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں شائع ہو رہی تھیں ... میرے دل میں اُن کی وقعت روز بروز زیادہ ہونے لگی۔ اس وقت سے میں نے کچھ نوٹ ان کی لائف کے متعلق قلم بند کرنے شروع کئے اور کم و پیش سو سوال ایک کاپی میں لکھ کر سر سید کے پاس بمقام علی گڑھ اس غرض سے بھیجے کہ ان کے جواب مختصر طور پر لکھ دیں - مگر یہ کاپی اُن کے پاس یونہی پڑی رہی کسی سوال کا جواب وہاں سے نہ آیا ...... کچھ دنوں بعد سر سید کے نہایت خالص و مخلص دوست نواب حاجی محمد اسمعیل خان رئیس دتاولی کو یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ معزز لائف جہاں تک جلد ممکن ہو اردو زبان میں، مکمل طور پر لکھی جائے - چنانچہ ان کی تحریک سے میرے دوست منشی سراج الدین احمد مالک و مہتمم چودھویں صدی سر سید کی لائف لکھنے پر آمادہ ہوئے - انہوں نے بڑی کوشش سے مٹیرئیل جمع کیا اور ایک خاص حد تک اس کو ترتیب دیکر حاجی صاحب کو دے دیا - کئی برس تک وہ مسودہ رکھا رہا - مگر اس کے چھپنے کی نوبت نہ آئی -

چونکہ کرنل گریہم اور منشی سراج الدین سر سید کی زندگی ہی میں ان کی لائف لکھنے کی راہ نکال چکے تھےمیرے دل میں پھر ایک ولولہ اُٹھا میں نے خیال کیا کہ اگرچہ قوم میں لائق آدمی روز بروز بڑھتے جاتے ہیں مگر مزدوروں کا گھاٹا ہوتا جاتا ہے .... جو ان کی بائیوگرافی کو قوم کے حق میں مفید سمجھتے ہیں اور اگر کوئی ان کی بائیوگرافی لکھے تو اس پر نکتہ چینی کی اعلیٰ لیاقت رکھتے ہیں ...... ایسی حالت میں ضروری کام کو لیت و لعل میں ڈالنا اور اس وقت کا انتظار کرنا جو معلوم نہیں کہ اول ہم کو پیش آئے یا سر سید کو...... جس طرح ہو سکے اصلی کام کو ان کی زندگی ہی میں پورا کر لینا

چاہئے ... ان خیالات سے میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ سب کام چھوڑ کر پہلے اس قومی فرض کو ادا کرنا چاہئے۔ چنانچہ ۱۸۹۴ء میں اسی غرض سے میں نے چند ماہ علی گڑھ میں قیام کیا ...

یہ ہے وہ حقیقت حال جس کی بابت علامہ سید سلیمان ندوی نے انصاف سے کام نہیں لیا۔

مجھے امید ہے کہ شبلی نمبر سے پھر ایک بیداری کی لہر اٹھے گی اور شبلی و سر سید پر ملک و قوم کی طرح سے لکھنے لکھانے کا پھر آغاز ہوگا۔ میری درخواست ان صاحبان سے جو اس کام کو کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں یہ ہے کہ وہ شیخ محمد اکرام کا شبلی نامہ ضرور ملاحظہ فرماویں جس میں اختلافات کو نہایت شرح و بسط سے لکھا گیا ہے اور پوری دیانت کو کام میں لایا گیا ہے۔

علی گڑھ میں شبلی کا قیام

محمد مقتدا خان شروانی

اپنا تعارف

محترم شیخ عطاء اللہ صاحب ایم - اے (سابق معلم معاشیات مسلم یونیورسٹی حال پرنسپل اسلامیہ کالج - چنیوٹ - مغربی پاکستان) نے مجھے حکم دیا کہ ان کے کالج کے میگزین ''البصیر'' کے شبلی نمبر کے لئے ''علی گڑھ میں شبلی کا قیام'' کے عنوان سے ''ایک مقالہ مرحمت'' فرماؤں جس میں شبلی مرحوم کے متعلق جملہ معلومات درج ہوں - بالخصوص یہ اشارہ ضرور ہو کہ شبلی پر علی گڑھ کا کیا اثر ہؤا اور علی گڑھ پر شبلی کا کیا اثر ہؤا -

میں نے ایم - اے - او کالج کے آنریری سیکرٹریوں کی تمام نسلوں کو (سر سید سے لے کر نواب سید محمد علی تک) اور مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلروں کی تمام نسلوں کو (مہاراجہ محمود آباد سے لے کر ڈاکٹر ذاکر حسین خاں تک) دیکھا ہے - اور کرنل بشیر حسین زیدی مسلم کو اب دیکھ رہا ہوں - اور نواب وقار الملک آنریری سیکرٹری سے لے کر ڈاکٹر ضیاءالدین احمد وائس چانسلر تک تقریباً ستائیس سال مجھے ان بزرگوں کے ساتھ کام کرنے کی عزت حاصل رہی ہے - اور شبلی کی بھی علی گڑھ میں قیام کی منزل میں سنہ ۱۸۹۳ء سے بذریعہ رویت اور علی گڑھ سے باہر کی تمام منزلوں میں بذریعہ روایت ہم سفر رہا ہوں - اور اگرچہ خان بہادر شیخ عبداللہ مجھ سے سینئر ہیں (مگر تقریباً تارک الدنیا ہیں) اور خاں بہادر مولوی حاجی حبیب اللہ خاں ان سے بھی سینئر ہیں (مگر بوجہ ضعف پیری و استیلاء امراض زیادہ کام نہیں کر سکتے - البتہ قومی کام کے ہوکے کے مرض سے مجبور ہیں کہ عمر ہم با شیراندروں شدو باجان

بدر شود لہذا اس قسم کی فرمائشیں جیسی کہ ''البصیر'' کی ہے مجھی سے ہوتی رہتی ہیں - اور خدائے قادر و توانا کا بے حد فضل و احسان ہے کہ اس نے اب تک باوجود ہشتاد سالگی کے ارذل العمر (نکمی عمر) سے محفوظ رکھا ہے - اس لئے بقدر استطاعت اکثر تعمیل کرتا رہتا ہوں - اور یہ اسی خدائے رحیم و کریم کا فضل ہے و احسان ہے کہ آج کل کی معذوری کے باوجود کچھ نہ کچھ کرتا رہا ہوں - دعا ہے کہ شافیٔ مطلق جلد بخیر و عافیۃ اس سے نجات دے - آمین - واللہ ہو النصیر والمعین -

قیام علی گڑھ سے پہلے کے حالات

شبلی (مولوی ، مولینا ، پروفیسر شمس العلماء ، علامہ اور اب رحمۃاللہ) کا مولد قصبہ بندول ضلع عظم گڑھ - یو پی ہے - نسلاً نو مسلم راجپوت ہیں - ولادت ذوالقعد ۱۲۷۳ھ مطابق ۱۸۵۷ء ہے - عقیقہ کا نام محمد شبلی ہے مگر مرحوم صرف شبلی ہی لکھتے تھے - اور چونکہ غالی حنفی تھے اور جس زمانہ میں لکھ پڑھ کر چوکس ہوئے اور رد عدم تقلید میں تقریر و تحریر کرنے لگے تو ان کے ایک استاد مولینا محمد فاروق چڑیا کوٹی (امام ابو حفینہ رحمۃاللہ کے نام مبارک نعمان کی نسبت سے) ان کو نعمانی کہنے لگے - اور شبلی نے بھی عرصہ تک اسے اپنے نام کا جزولاینفک رکھا اور آردو فارسی اشعار میں بھی باندھا - اور اگرچہ علامہ شبلی کے حیات نگار (خود علامہ) سید سلیمان نے تو لکھا ہے کہ '' کیا عجیب بات ہے کہ ایک ہندی نژاد راجپوت آگے بڑھ کر اس قابل ہؤا -'' (آگے چل کر مولانا نے مورخانہ و عارفانہ موشگانیوں اور نکتہ سنجیوں کو شمار کیا ہے) مگر میں کہتا ہوں کہ یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے - جہاں تک اسلام کا تعلق ہے شبلی کے مورث اعلیٰ تو اب سے چار سو برس پہلے مسلمان ہوئے تھے اور شبلی سے پہلے عرصہ دراز سے ان کے خاندان میں علم و فضل کا سلسلہ چلا آتا تھا - اسلام کی تاریخ میں ایسی بے شمار مثالیں ہیں کہ خود آج اسلام لائے کل ہی دنیا کے دلوں

میں اسلام کے دقائق و حقائق اتارنے لگے - دور نہ جائیے ، علامہ اقبال ہی کو لیجئے جو ایسے پرانے نو مسلم نہیں ہیں اور فخریہ کہتے ہیں :

مرا بنگر کہ در ہندوستان دیگر نمی بینی
برهمن زادهٔ دانائے رمز روم و تبریز است

اور اپنے کافر مورثوں پر طعن کرتے ہیں کہ :

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدے کے بت ہو گئے پرانے

شبلی کے والد شیخ حبیب اللہ بہت معزز تھے اور معاشی حیثیت سے کافی آسودہ تھے - اوسط درجہ کے زمیندار تھے اور نیل و نیشکر کی کاشت اور اس کی مصنوعات سے وافر آمدنی تھی - ابتدائی تعلیم کے بعد فارسی پڑھی تھی اور اس میں خاص ذوق پیدا کیا تھا -

شبلی اپنے باپ کی سب سے بڑی اولاد تھے - اور چونکہ شبلی کی تعلیم کے آغاز کے وقت مسلمان انگریزی تعلیم کی طرف راغب نہ تھے بلکہ اس سے نفور تھے - اس لئے اُن کی ابتدائی تعلیم فارسی و عربی کی گھر ہی پر یا گھر کے قریب ہی دینی مدارس میں ہوئی اور سر سید کی تحریک تعلیم اس وقت بروئے کار آئی کہ شبلی علوم شرقیہ میں کچھ ترقی کر چکے تھے - چنانچہ اُنہوں نے تو انگریزی تعلیم حاصل نہ کی مگر ان کے تین چھوٹے بھائیوں نے علی گڑھ میں رہ کر اعلیٰ تعلیم پائی - چند روز مولانا علی عباس سے چڑیا کوٹ میں اور مولانا ہدایت اللہ خاں سے جون پور میں استفادہ کیا - معقولات کی تمام کتابیں مولانا محمد فاروق چڑیا کوٹی سے تمام کیں - اور فارسی ادب و شاعری کا مذاق بھی انہی کے فیض سے پیدا ہؤا - فقہ کی تعلیم مولانا ارشاد حسین مجددی سے حاصل کی - جو بڑے ژرف نگاہ فقیہ اور علوم ظاہری و باطنی سے آراستہ و پیراستہ تھے - عربی ادب مولانا فیض الحق سہارنپوری سے پڑھا جو سر سید کے بھی اس فن کے اُستاد تھے - علم حدیث مولینا احمد علی سہارنپوری سے لیا - تعلیم کا سلسلہ ابتدا سے انتہا تک چودہ برس تک جاری رہ کر ۱۹ سال کی عمر

میں ختم ہو گیا - شبلی کی سوانح عمری '' حیات شبلی سے ثابت ہے کہ سوائے معقول کے (کہ وہ مولینا فاروق چڑیا کوٹی سے تمام کی) اور کسی آستاد سے کوئی فن تفسیر ، فقہ ، حدیث و ادب تمام نہیں کیا چنانچہ صرف معقول ھی کی نسبت خود شبلی کا یہ اعتراف ہے کہ '' میں نے معقولات کی تمام کتابیں آنہی سے پڑھیں اور میری تمام کائنات آنہیں کے افادات ھیں - فارسی کا مذاق بھی انہیں کا فیض ہے '' اور دوسرے اساتذہ کرام (مثلاً مولانا ھدایت اللہ خان ، مولانا ارشاد حسین ، مولینا احمد علی - مولینا فیض الحسن کی خدمت میں معتدبہ عرصہ تک حاضر رھنا بھی ثابت نہیں ھوتا - بہرحال جب یہ مان لیا گیا کہ اب تعلیم ختم ھو گئی تو آن کے تکمیل تعلیم کے بعد مشاغل یہ ھوئے کہ باپ کے نیل کے کاروبار کی نگرانی کی - عدالت میں نقل نویس ھوئے ، پھر امین ھوئے - امتحان پاس کر کے وکالت کی - مگر آن میں سے کسی میں کامیاب نہ ھوئے - حالانکہ ان کے باپ شیخ حبیب اللہ ایک کامیاب زمیندار ، تاجر اور وکیل تھے - البتہ دوسرے مشاغل علمی اور رفاہ عام ھی کے رہے - مثلاً طالبعلموں کو پڑھانا ، مدارس قائم کرنا ، قومی کاموں کے لئے چندہ کرنا ، انھی مباحث و مناظرات اور وھی رسائل کی تصنیفات اپنے نام سے اور دوسروں کے نام سے شعر و شاعری وغیر وغیرہ اور اسی سلسلہ میں اپنے بعض اعزہ کے ساتھ حج بیت اللہ و زیارت روضۂ رسول اللہ صلعم سے بھی مشرف ھوئے -

علی گڑھ سے وابستگی

باالفاظ دیگر شبلی کے شبلی (بلکہ علامہ شبلی) بننے کا سلسلہ یوں چلتا ہے کہ (علی گڑھ تحریک) ۱۸۶۶ء میں شروع ھو چکی تھی ۱۸۷۰ء میں سر سید نے ولایت سے واپس آ کر رسالہ '' تہذیب الاخلاق '' جاری کیا - ۱۸۷۱ء میں '' انجمن خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان '' قائم کی - ۱۸۷۵ء میں '' مدرسۃ العلوم مسلمانان '' علی گڑھ میں اسکول کے درجہ تک جاری ھؤا - اور ۱۸۷۷ء میں کالج کے درجہ تک پہنچا - ان تحریکوں کا اثر یو - پی کے پوربی اضلاع میں بہت کافی ھؤا جن میں شبلی کا ضلع

اعظم گڑھ بھی شامل تھا - اور ان اضلاع کے اچھے اچھے مسلمان خاندانوں کے بچے داخل ہوئے لگے- چنانچہ شبلی کے منجھلے بھائی مہدی حسن بھی ایم - اے - او کالجئیٹ سکول میں داخل کر دیۓ گئے - اس سلسلے سے شبلی کے والد شیخ حبیب اللہ علی گڑھ آتے رہتے تھے - اور اس عرصے میں شبلی (جو اب مولوی ہو چکے) تھے - اکتوبر ۱۸۸۱ء میں شیخ صاحب مہدی حسن سے ملنے علی گڑھ آئے تو مولوی شبلی کو ساتھ لائے اور اُن کو سر سید کے سامنے پیش کیا - مولوی شبلی سر سید کی شان میں ایک عربی قصیدہ لکھ کر لائے تھے - جس میں سر سید کے حسب نسب اور ان کی مفید قومی کاموں کی تاریخ و توصیف تھی - اور چونکہ قصیدے میں مسلمانوں کی حالت کا بھی نقشہ تھا - (علم و عمل سے بیگانگی اور اپنے ہی خواھوں سے بد گمانی بلکہ دشمنی وغیرہ وغیرہ) اس لئے سر سید نے اسے کالج کے اخبار میں بھی چھپایا - ۱۸۸۲ء میں کالج میں عربی و فارسی کے لئے اسسٹنٹ پروفیسر کی ضرورت ھوئی تو مولوی شبلی پھر علی گڑھ آئے اور کئی صاحبوں کی سفارش سے ان کا تقرر اس عھدے پر بمشاعرہ ۴۰ روپے ماھوار ھو گیا -

علی گڑھ آنے سے پہلے

مولوی شبلی کے مندرجہ بالا ابتدائی حالات کے ضمن میں آپ نے دیکھا (اور خود اُن کی سوانح حیات شبلی سے ثابت ھے) مولوی شبلی کی کوئی خاص حیثیت نہ تھی - اُن کا کسی فن معقول منقول - ادب کے علماء میں شمار نہ تھا نہ وہ جمہور میں متعارف تھے - صرف ایک محدود حلقے میں تعلیم دین کی اشاعت کرتے تھے - افراد کی ایک نہایت محدود تعداد کو خود بھی تعلیم دی - مذھبی تقلید اور عدم تقلید کے مناظرے بھی کئے اردو ، عربی ، فارسی کی شاعری بھی کی - کتابوں کے مطالعے سے بھی شغف تھا مگر وھی کتابیں جن کا تعلق شعر و ادب سے تھا - بلکہ ان کی حیات سے ثابت ھے بقول خود مولانا کے معقولات کی کتابیں مولانا محمد فاروق چڑیا کوٹی سے تمام کیں - باقی فنون حدیث - فقہ و ادب کا تمام کرنا

نہیں پایا جاتا - اور ان فنون کی تعلیم کی مدت مختلف استادوں سے صرف تقریباً اڑھائی سال پائی جاتی ہے اور تفسیر و عقائد کی باقاعدہ کسی استاد سے تعلیم حاصل کرنے کا پتہ نہیں چلتا - اور عربی کا سادہ نگاری کا ذوق اُن کو جاحظ کی کتابوں سے پیدا ہؤا جو انہیں علی گڑھ ہی میں ملیں - ان حالات میں -

علی گڑھ آنے کے بعد

مولوی شبلی کی وہی حالت ہوئی جو قفس سے نکل ایک چڑیا کی فضاء نا محدود میں یا ایک مچھلی کی چھوٹے سے تالاب سے چل کر بحر نا پیدا کنار میں ہوتی متصور ہو سکتی ہے - یہاں سر سید تھے - جو اپنی ذات میں اک انجمن تھے - یہاں علمی اور قومی خدمت کر رہے تھے - یہاں محسن الملک، حالی، ندیر احمد، ذکاء اللہ، چراغ علی اور کون کون حتیٰ کہ آرنلڈ بعد کے (سرطامس آرنلڈ) تھے جن کی پیشانیاں سر سید کی مہر تربیت سے نورانی تھیں - اور مولوی شبلی کے خود ترقی کرنے کے جذبے کے لئے گویا زندہ نمونہ تھیں - یہاں سر سید کا ذاتی کتب خانہ تھا، جس میں تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ، ادب کی کتابوں کا مصر، شام، حتیٰ کہ (یورپ) سے سیلاب آتا رہتا تھا (جو کم از کم) اس وقت ہندوستان کے طول و عرض میں نایاب تھا - مولوی شبلی کا خود بیان ہے کہ سر سید کے کتب خانے تک پوری دسترس سے پہلے وہ گھنٹوں الماریوں کے سامنے کتابوں کو کھڑے کھڑے پڑھتے تھے - سر سید میں جہاں اور بہت سی لازم و متعدی خوبیاں تھیں ایک یہ بھی تھی کہ وہ بڑھنے والے کو اور زیادہ بڑھاتے تھے - یہی عمل مولوی شبلی کے ساتھ ہؤا - اور سر سید نے اول اُن کو شاعری کے پر پرواز پر آڑانا شروع کیا - جس کی صورت یہ تھی کہ جب کوئی غمی یا خوشی کا واقعہ ہوتا یا کوئی بڑا شخص آتا (اور بڑے اور بڑے بڑے اشخاص آئے دن آتے ہی رہتے تھے) تو سر سید مولوی شبلی سے نظم لکھواتے اور آن ہی سے پڑھواتے اور پھر آسے اپنے اخبار میں شائع کرتے - پبلک جلسوں میں آن سے ریزولیشنوں پر تقریر

کراتے - مضامین پڑھواتے - طالبعلموں کی یونین میں (جو کالج کے زمانہ میں اسٹوڈنس یونین کلب تھا - اب یونیورسٹی یونین ہے) موافق و مخالف تقریریں کراتے جس سے آن میں عام جلسوں میں مباحثہ کا سلیقہ پیدا ہوتا - ان سے قومی جلسوں میں مضامین پڑھواتے جس سے نہ صرف عام مسلمانوں کو فائدہ پہنچا بلکہ خود مولوی شبلی بھی مسلمانوں کے ایک معزز حلقے میں بیک وقت با آسانی روشناس ہو جاتے - چنانچہ مقالات شبلی کے پہلے حصے میں بعض وہ مضامین شامل ہیں جو انہوں نے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس (حال آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس) میں پڑھے اور نہایت مقبول ہوئے - ''مسدس حالی'' کو قومی لٹریچر میں جو درجہ حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں - حالی کی یہ مسدس ۱۸۷۹ء میں شائع ہو چکی تھی - ۱۸۸۴ء میں مولوی شبلی نے مثنوی صبح امید لکھی جس میں مسلمانوں کی غفلت سر سید کی شفقت اور تبدیل حالت کی شدید و فوری ضرورت کو ایسے پر اثر انداز میں بیان کیا ہے کہ اگرچہ یہ مولوی شبلی کی قومی شاعری کا دیباچہ ہے مگر دراصل جواہر پارہ ہے اور یہ مولوی شبلی کی غیر معمولی ذہانت اور قابلیت تھی کہ وہ نقل کو اصل کے طور پر پیش کرتے تھے اور نقل کا سایہ بھی نہیں پڑنے دیتے تھے - ''کتب خانۂ اسکندریہ'' آن کا معرکۃ الا راء مضمون ہے جو اول کالج میگزین میں چھپا پھر مقالات شبلی حصہ اول میں نقل ہؤا - اس کے متعلق سر سید نے اپنے قیام انگلستان ۱۸۶۹ء میں لکھا اور قدیم ماخذوں سے اس کا جولیس سیزر (قیصر روم ۴۴ — ۱۰۰ قم) کے زمانے میں آس کا جلنا ثابت کیا - ''حقوق الزمیین'' کا مضمون بھی مقالات شبلی اول میں ہے - یہ مضمون بھی مولوی چراغ علی اپنے دوسرے مضامین کے سلسلے میں لکھ چکے تھے - مولانا شبلی کی ندرت فکر کی ایک مثال لکھتا ہوں - رودکی (متوفی ۳۰۴ ھجری) فارسی کا مشہور نابینا شاعر ہے آس کی ایک غزل ہے جس کی تلمیح اگرچہ بہت دلچسپ ہے مگر بہ نظر اختصار چھوڑتا ہوں:-

موئے جوئے مولیاں آید همی
یاد یار مہربان آید همی

ریگ آموں با درشتی ھائے او
زیر پایم پرنیاں آید ھمی

آب جیھوں باھاں پہناوری
خنگ مارا تا میاں آید ھمی

وغیرہ وغیرہ اس کے بعد ایک اور شاعر معزی متوفی ۵۴۲ ھجری نے ایک مدحیہ قصیدہ لکھا جو اسی بحر و ردیف و قافیہ میں تھا۔ ملاحظہ ہو:-

رستم از مازندراں آید ھمی
زین ملک از اصفہاں آید ھمی

آفریں و مدح سود آید ھمی
گر بہ گنج اندر زیاں آید ھمی

اب جس زمانے میں مولانا شبلی علی گڑھ کالج میں پروفیسر تھے۔ سر آسماں جاہ مرحوم (اُس وقت کے وزیراعظم حیدر آباد دکن) کالج میں تشریف لائے حسب معمول مولینا شبلی نے قصیدہ لکھا اور پیش کیا چند اشعار یہ ھیں:

ھم چناں بودیم گرم گفتگو
قاصد از در ناگہاں آید ھمی

افگنند شور مبارک باد و پس
ایں حدیثش برزباں آید ھمی

آسماں جاہ از سوئے ملک دکن
جانب ھندوستاں آید ھمی

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ابتدائی زمانہ میں اس کا ایک اجلاس علی گڑھ میں ھوُا جس میں سید محمود مرحوم نے فقۂ اسلامی کا تفوق تمام قدیم و جدید قوانین عالم پر (یہاں تک کہ روم کے سولن اور ھندوستان کے منوں کے قوانین پر بھی) ثابت کیا۔ اور فقۂ حنفی کا تفوق بقیہ مذاھب

ثلاثه مالکی - شافعی - حنبلی فقوں پر بھی ظاہر ہے - اس سے مولانا شبلی کا خیال سیرۃ النعمان (سوانح عمری حضرت امام اعظم ابوحنیفہ) کی طرف رجوع ہؤا - یہاں تک شاعری میں بھی وہ دوسروں کے تخیل سے پورا فائدہ اُٹھاتے تھے - چنانچہ رودکی اور معزی کی بحر و ردیف و قافیہ میں اُن کے ایک قصیدے کے ہونے کا ذکر کر چکا ہوں - نیز میں نے بتایا ہے کہ ۱۸۸۹ء میں مولانا حالی نے جو کانفرنس کے اجلاس میں ترکیب بند پڑھا - اس میں شبلی کا بھی ذکر تھا - شبلی کے علاوہ سارے یورپین اور ہندوستانی اسٹاف (بیک موریسن ، آرنلڈ ، والس ، چکرورتی ، عباس حسین) کا بھی ذکر تھا - اسی (۱۸۸۹ء) کے دوسرے سال اس کانفرنس کے اجلاس میں مولانا شبلی نے جو فارسی نظم پڑھی اُس میں سر سید کے رفقاء کا ذکر تھا - چنانچہ ایک شعر ملاحظہ ہو -

نگہ از مہر سوئے حالی آزادہ فگن
وان نذیر احمد طوطئی شکر خابنگر

سر سید کی کوٹھی کے لق و دق احاطہ میں ایک چھوٹا سا بنگلہ تھا وہ سر سید نے مولانا شبلی کو بالکل بلا کرایہ دے کر اپنے قریب رکھ لیا تھا - جس کی وجہ سے اُن کو سر سید کے عملی رجحان اور عملی فیضان سے فائدہ اُٹھانے کا بہترین موقع ملا - وہ اپنے علی گڑھ کے قیام کی تقریباً تمام مدت اسی بنگلے میں رہے اور وہ مولینا کے علی گڑھ سے اور پھر اس دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد اور (خود اپنے وجود) تک ''مولوی شبلی والی بنگلیہ'' ھی کہا جاتا رہا - یوں تو کالج کا سارا یورپین سٹاف (پرنسپل اور پروفیسر) سر سید کی کوہ وقار شخصیت سے متاثر تھا - مگر پروفیسر آرنلڈ تو مولینا ھی بن گئے سر سید ھی کے ساتھ تبادلۂ خیالات کے بعد اُنھوں نے اپنی معرکۃ آلارا کتاب ''پریچنگ آف اسلام'' لکھی جس میں اسلام کو تبلیغی اور بزورشمشیر نہ پھیلنے والا مذھب ثابت کیا - اس کا ترجمہ مولوی عنایت اللہ (خلف اکبر مولینا ذکاء اللہ دھلوی) نے ''اشاعت اسلام'' کے نام سے کیا - مولینا آرنلڈ نے مولینا شبلی کو فرنچ پڑھائی اور جدید یورپین طرز تحقیق بتایا - پروفیسر

آرنلڈ کبھی کبھی عربی لباس بھی معہ عمامہ زیب تن کیا کرتے تھے ۔ چنانچہ مولینا حالی کے مشہور ترکیب بند بعنوان مسلمانوں کی تعلیم " مرتبہ ۱۸۸۹ء کا یہ شعر اسی واقعہ کی تلمیح ہے ۔"

مسیحی پوششیں دیکھیں مسلمانوں کے بچوں کی
مسیحی کو مسلمانی قبا زیب بدن دیکھیں

یہی آرنلڈ لاہور جا کر علامہ اقبال کے استاد بنے ۔ ان حالات میں ظاہر ہے کہ مولینا شبلی بہت جلد (اور غالباً اپنی بھی توقعات سے پہلے) جاذب نظر ہو گئے ۔ چنانچہ ان کے ۱۸۸۳ء میں چالیس روپے ماہوار پر اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہونے کے بعد مولوی اکبر صاحب (پروفیسر عربی) کی ۱۸۸۷ء میں جگہ خالی ہوئی تو مولانا شبلی کو پروفیسری پر بے تکلف ترقی مل گئی اور مولینا حالی نے اپنی اسی نظم (مرتبہ ۱۸۸۹ء میں آن کا ذکر ان الفاظ میں کیا :

ادب اور مشرق تاریخ کا ہو دیکھنا مخزن
تو شبلی سا وحید عصر و یکتائے زمن دیکھیں

بے شک علی گڑھ آنے سے پہلے بھی، شبلی میں ادبی اور علمی ذوق موجود تھا ۔ مگر علی گڑھ آنے اور علی گڑھ میں چند روز رہنے سے اس ذوق کا دھارا بالکل بدل گیا ۔ چنانچہ آن کے اس بدلے ہوئے ذوق کے نتیجے میں ادب میں " موازنہ انیس و دبیر " اور " شعر العجم " چار ضخیم جلدوں میں ہے) اور آئے دن کے واقعات پر آن کی چھوٹی چھوٹی نظموں کا کوئی شمار ھی نہیں ۔ جو پتھر سے پتھر دلوں پر بجلی کا اثر کرتی ھیں ۔ ان کے عملی ذوق نے تاریخ کی شکل اختیار کی ۔ یہ کہ علی گڑھ نہ آتے تو مسلمان " سیرۃ النعمان " " المامون " ۔ " الفاروق " ۔ " الغزالی " سوانح عمری مولانا روم اور از دور و بدیر کی بمصداق " سیرۃ النبی جیسے پائیدار شاہکار نہ پاتے ۔ معمولی خانگی مذاکرہ یا باقاعدہ جلسے میں مولانا شبلی کسی مضمون یا رسالہ یا کتاب کے لکھے جانے کا خیال ظاہر کرتے تو سر سید سر ہو کر انہیں کے سر اسے ڈالتے اور بزرگانہ لطف سے یہ مثل دھراتے جو کہے وھی گھی لائے ۔ " الغزالی " " الفاروق " اسی

سلسلے کی لاجواب کڑیاں تھیں جو سر سید کے بعد شائع ہوئیں - "المامون و الفاروق" - رائیل ہیروز آف اسلام (نامور فرمانروایان اسلام) کے منصوبہ کے جزو تھیں - المامون سر سید کی حیات میں شائع ہوئی اور اُس کے دوسرے ایڈیشن کے ساتھ سر سید نے نہایت پسندیدہ فاضلانہ اور همت افزا تبصرہ شائع کیا - الفاروق ھی کے لئے روم و شام و مصر کے کتب خانوں سے کافی اطلاعی سرمایا فراہم کرنے کے لئے مولینا نے ۱۸۹۲ء میں ان ممالک کا سفر کیا - ہر جگہ اُن کا خیر مقدم ایم - اے - او کالج کے پروفیسر ہی کی حیثیت سے ہوا - ہر ملک کے ہر شعبے کے اکابر سے ملاقاتیں ہوئیں سلطان عبدالحمید خاں کی بارگاہ میں غازی عثمان پاشا فاتح پلونا کی سفارش سے باریاب ہوئے اور تمغہ مجیدی بھی موصوف ھی کی سفارش سے حاصل کیا جس کے متعلق فرمان سلطانی میں تصریح تھی کہ "شبلی النعمانی آفندی دارالمعلمین علی گڑھ کے معلم اول" (پروفیسر) کو عطا کیا جاتا ھے - جہاز سے اُتر کر مولانا سیدھے علی گڑھ آئے اور یہاں ان کا نہایت شاندار استقبال ہؤا - سکول و کالج اسٹاف کی طرف سے ڈنر ہوئے - سر سید ھی کی کوشش سے ۱۸۹۴ء میں مولینا کو "شمس العلماء" کا خطاب ملا - اس خوشی میں مولینا نے کالج کو کچھ نقد نذر کیا - اسٹاف اور طلباء نے دعوتیں کیں - ایک دعوت کے موقع پر (جس کے صدر نواب محسن الملک تھے اور جس میں سر سید اور سید محمود بھی شریک تھے) - نواب محسن الملک کی معرفانہ تقریر کے جواب میں نہایت پرجوش تقریر کی - جس میں خطاب کا شکریہ ، حکومت کی تعریف ، کالج کی عظمت نہایت شاندار الفاظ میں اور اپنی اُس تربیت کا ذکر جو علی گڑھ کے ماحول میں ہوئی نہایت منت پذیری کے ساتھ تھا - ۱۸۸۴ء میں ایم - اے - او کالج میگزین کا مستقل اور جدا گانہ انتظام ہؤا - تو مولینا اس کے اردو حصے کے ایڈیٹر بنائے گئے اور مسٹر بیک پرنسپل نے اس کے انگریزی حصے کا چارج لیا - یہ سلسلہ کئی سال جاری رہا اور مولینا نے معرکہ کے مضامین لکھے - "الجزیہ" "کتب خانۂ اسکندریہ" اور "حقوق الزمعین" کے یادگاری مضامین اُسی دور کی یادگار ھیں - اس سے مولانا کو ایڈیٹری کا سلیقہ حاصل ہؤا - علی گڑھ ھی کے تعلق کے زمانے میں مولینا کا سو روپے ماہوار کا وظیفہ

حیدر آباد سے مقرر ہو گیا - کالج کے قیام کے زمانے میں انہوں نے عربی کے منتہی طلباء کے لئے عربی میں ایک رسالہ '' بداء الاسلام'' کے نام سے اسلام کی ابتدائی تاریخ کے متعلق لکھا :

سیرۃ النبی کا تخیل مولینا کو سر سید کے '' خطاب احمدیہ '' سے ہؤا تھا اور یہ رسالہ بداء الاسلام درحقیقت اس تناور درخت کا گویا ایک ننھا سا تخم تھا جیسے برگد کے درخت کا ہوتا ھے - الہ آباد یونیورسٹی کے امتحان انٹرنس کے لئے نصاب بنایا اور یونیورسٹی مذکور کے فیلو بھی مقرر ہوئے جہاں فارسی زبان کے قیام و استحکام کے لئے انہوں نے نمایاں کام کئے - ۱۸۹۴ء میں جب ندوۃالعلما قائم ہؤا تو سر سید نے اس کی زبردست تائید کی - پہلے جلسہ میں مولانا عبداللہ انصاری ناظم دینیات اور پروفیسر شبلی کو کالج کی طرف سے شرکت کے لئے بھیجا - اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں نواب محسن الملک اور سید محمود سے اس کی تائید میں تقریریں کرائیں - اس پہلے جلسے کی روئیداد مولانا نے کالج میگزین کے اردو حصے میں شائع کی - چونکہ انہوں نے علی گڑھ کے ماحول اور بلاد اسلامی کی سیاحت کے تجربوں کے ساتھ عربی تعلیم کی موجودہ حالت اس کی اصلاح اور علماء کی باھمی یکجہتی و اتفاق کی ضرورت پر کافی غور کیا تھا - اور اب اپنے غور کے نتائج کو جو ندوہ کے جلسوں میں مؤثر طریقوں سے پیش کیا انہوں نے ندوہ میں بھی ایک بڑی جماعت کو اپنا ہم خیال بنا لیا - اور ندوہ میں بھی آن کی ایک اھم اور مؤثر شخصیت قائم ہو گئی - یہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ مولانا شبلی سر سید کی کوٹھی کے احاطہ ھی میں رہتے تھے - سر سید کی حیات کے آخری ایام میں سید محمود کا دماغی توازن اس درجہ خراب (بلکہ تباہ ہو گیا تھا) سر سید کی کوٹھی چھوڑ کر یونین کے قریب ایک بنگلے میں چلے گئے تھے - مگر بیگم محمود ھاتھ پاؤں جوڑ کر واپس لے آئیں - مگر انتقال (۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء) سے تقریباً پندرہ دن پہلے حاجی اسمعیل خاں (رئیس دتاولی) انہیں اپنی کوٹھی میں آٹھا لے گئے جہاں سر سید کا انتقال ہؤا- اس سے بہت قبل سید محمود ھی کی چپلقش کی وجہ سے مولانا شبلی بھی

حاجی اسمعیل خاں کی کوٹھی کو منتقل ہوگئے تھے - اس کوٹھی کے قیام میں مولانا شبلی نے حاجی اسمعیل خان سے ترکی پڑھی - حاجی صاحب موصوف ترکی زبان کے اچھے ماہر تھے - سید سجاد حیدر یلدرم نے بھی انہیں سے ترکی پڑھی تھی - سید محمود کی اس حالت نے سر سید کو آوے کی طرح بٹھا دیا تھا - اگرچہ وہ مصروف کار دم آخر تک رہے - امہات المومنین کے متعلق ایک پادری کی دریدہ دھنی کا دندان شکن جواب انہوں نے مرض الموت میں مبتلا ہو جانے تک لکھا مگر وہ شگفتگی باقی نہ رہی تھی - دوست گھنٹوں ان کے پاس بیٹھے رہتے تھے - مگر وہ خلاف معمول خاموش اور سنجیدہ کام کرتے رہتے وہ "دل بہ یار دست بکار" کی کیفیت بالکل نہ رہی تھی - اسی لئے اس زمانے کی مولانا شبلی کی علی گڑھ کی زندگی کا کوئی واقعہ قابل ذکر نہیں الا یہ کہ سر سید کے ارتحال کے واقعہ سے وہ از خود رفتہ سے ہوگئے چنانچہ ۲۹ مارچ ۱۸۹۸ء کو علی گڑھ سے نواب علی حسین خاں کو بھوپال عربی میں خط لکھا - جس کا اردو ترجمہ یہ ہے - " قومی امارت کے ستون ہل گئے یعنی سید احمد خاں بہادر اپنے پروردگار کے جوار رحمت میں گئے اور یہ سانحہ ۲۷ مارچ کو پیش آیا اور ہماری قوم کا شیرازہ بکھر گیا - میں کچھ عرصے تک کوئی کام نہیں کر سکتا -" مولانا کے علی گڑھ کے تعلق اور قیام کے زمانے میں ریاست حیدر آباد کے اکثر اکابر اور امراء ان سے واقف ہو گئے تھے - ۱۸۹۱ء کے سفر حیدر آباد کے موقع پر بھی مولانا شبلی سر سید کے همراه تھے - اس موقع پر بھی مولانا نے متعدد نظمیں پڑھیں - ان سب واقعات کا یہ اثر تھا کہ ۱۸۹۵ء میں ریاست سے ان کا سو روپے ماہوار کا وظیفہ خدمت تصنیف مقرر ہو گیا - بعد میں نظامت سر رشتۂ علوم و فنون پر بھی ان کا تقرر بمشاہرہ چار سو روپے ہو گیا - اور انتقال کے قریب ان کے سو روپے ماہوار کے سابقہ وظیفے میں بھی دو سو ماہوار کا اضافہ ہوگیا - اس اضافے کی خبر ملی تو مولانا نے حسرت سے یہ مصرعہ پڑھا:

عید ہوئی ذوق ولے شام کو

اگرچہ نواب محسن الملک (جو سر سید کے جانشین ہوئے) مولانا کے

کافی قدردان تھے۔ مگر سر سید کے انتقال کے معاً بعد سید محمود قائم مقام سیکرٹری ہوئے۔ کیونکہ وہ لائف جائنٹ سیکرٹری تھے اور حالات ایسے تھے کہ ان کے مستقل سیکرٹری ہو جانے کا بھی امکان تھا۔ اس لئے مولانا نے اول طویل رخصت لی اور اسی سال (یعنی ۱۸۹۸ء میں) استعفیٰ دے دیا۔ اور اگرچہ نواب محسن الملک کے مستقل سیکرٹری منتخب ہو جانے کے بعد مولانا کی واپسی کی تحریک چلی مگر دوسری طرف ندوہ کی بھی کشش تھی اور ان دونوں کششوں کا (اس وقت جب کہ زور دونوں طرف برابر تھا)۔ مولانا نے اپنے بعض خطوط میں بھی ذکر کیا ہے۔ ۷ اپریل ۱۹۰۱ء کو اپنے بھائی مولوی محمد اسحاق کو لکھتے ہیں ''لکھنو یا علی گڈھ میں بستر ہوگا اور ندوہ یا کالج کا مشغلہ'' پھر جون ۱۹۰۳ء میں مولوی حمید الدین فراہی کو لکھا۔ ''میں یہاں (حیدر آباد) سے چھوٹا تو اعظم گڑھ نہیں بلکہ ندوے میں رہوں گا یا کالج میں۔ وطن سے جی سیر ہو گیا۔'' پھر نواب محسن الملک کو لکھا۔'' کہ (بصیغۂ واحد غائب'') ''اب بھی یہ خواب دیکھتا رہتا ہے۔ کہ اگر اس کو موجودہ تعلقات (نظامت حیدر آباد) سے آزادی مل سکے تو پھر کالج کے احاطہ میں رہ کر سال کا بڑا حصہ کالج کی خدمت میں بلا کسی معاوضہ کے صرف کرے۔'' اس کے بعد مولانا ندوہ ہی میں چلے گئے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہاں سے اچاٹ ہوئے تو پھر علی گڑھ ہی سوجھا چنانچہ ایک غزل کا ایک شعر ہے:-

آں شد اے دوست کہ در ندوہ بہ بینی بازم
کہ دم از صحبت آں دشمن ایمان زدہ ام

اگر ''دشمن ایمان'' کو کسی نے کہیں اور کسی نے کہیں ڈھونڈا ہے مگر میری رائے میں سوائے علی گڑھ کے اور کہیں نہیں ہے۔

میرے سابقہ بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ مولوی شبلی صاحب جب ۱۸۸۳ء میں ایم۔ اے۔ او کالج سے وابستہ ہوئے تو آن کی تعلیم نامکمل تھی۔ وہ صرف معقولات تمام کر چکے تھے۔ منقول (حدیث۔ فقہ۔ ادب) کی تعلیم کی مدت صرف تقریباً ڈھائی تین سال تھی۔ تفسیر و عقائد جیسے

لابدو لازم علوم کا کسی استاد سے حاصل کرنے کا ثبوت نہیں ملتا ۔

کسب معاش کے متعدد پیشوں ریاست ، تجارت ، وکالت ، ملازمت میں مطلق ناکام ثابت ہو چکے تھے ۔ علمی لحاظ سے آن کا مطالعہ اردو فارسی کے شعراء کے کلام میں منحصر و محصور رہا ۔

تعلیم ھی کے دوران میں فریضۂ حج و شرف زیارت سے فارغ ہوئے اس کے بعد باقاعدہ تعلیم تقریباً ختم ھوگئی ۔ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے کتب خانوں میں بھی آن کا مطالعہ دواوین شعراء اور کتب عقائد تک رھا ۔ اس کے بعد مولوی شبلی کے یہ مشاغل رہے کہ اردو فارسی کے شعراء کے کلام کا مطالعہ کرتے ۔ مشاعروں میں شریک ھوتے ۔ خود بھی شعر کہتے ۔ اس زمانہ میں تسنیم تخلص فرماتے تھے ۔ خاندان و اعزہ میں دینی تعلیم کی ترجیح و ترقی کی کوشش کرتے ۔ خود بھی بعض اعزہ و اقربا کو تعلیم دیتے ۔ سب سے زیادہ انہاک تقلید و عدم تقلید کے مسلۂ میں تھا ۔ فرماتے تھے ”مسلمان عیسائی ھو سکتا ھے مگر وھابی نہیں ھو سکتا “ عدم تقلید کے دور میں مناظرے کرتے ۔ اپنے نام سے اور دوسروں کے نام سے لکھتے ۔ اس زمانہ کے ایک رسالہ نے جو عربی زبان میں اسکات المعتدی کے نام سے تھا ۔ عربی بولنے والے ممالک میں اتنی شہرت حاصل کی تھی کہ جب سالہا سال بعد مولینا نے روم و مصر و شام کا سفر کیا تو وھاں آن کی شہرت اسکات المعتدی کی راہ سے وھاں بہت پہلے پہنچی ھوئی تھی ۔ وھاں آن کی عزت اھل دنیا میں علی گڑھ اور اسکات المعتدی کے ذریعہ ھوئی ۔

۱۸۸۱ء میں سر سید کی خدمت میں بذریعہ اپنے والد بزرگوار کے مع ایک عربی مدحیہ قصیدہ کے بار یاب ھوئے ۔ دوسرے سال ۱۸۸۲ء کے آخر میں عربی اور فارسی کے اسسٹنٹ پروفیسر چالیس روپے ماہوار پر مقرر ھو گئے اور ۱۸۸۷ء میں جگہ خالی ھونے پر پروفیسری پر ترقی پا گئے اور سر سید کے فیض صحبت اور دوسرے اکابر مثلاً محسن الملک وقار الملک ، حالی ، نذیر احمد ، ذکا اللہ ، چراغ علی وغیرہ وغیرہ کے نمونوں اور بلاشبہ اپنے فطری ذوق اور ذاتی علمی انہاک کی بدولت نہ صرف اپنی تعلیم کو

پورا کیا بلکہ اپنی قابلیت کو اتنا بڑھایا کہ مولوی سے مولینا، پروفیسر، شمش العلماء اور کیا کیا حتیٰ کہ علامہ بلکہ علامہ گر ہوگئے اور مقلد اور غیر مقلد کے تنگ مذہبی اور شعر و شاعری کے خیالی دائرہ سے نکل کر تاریخ و تحقیق کے اس وسیع میدان میں گام فرسا اور بحر نا پیدا کنار میں غوطہ زن ہو گئے جسے من جملہ دیگر متعدد علوم کے علمی شان اول مرتبہ صرف مسلمانوں نے دی اور اس حیثیت سے اردو لٹریچر پر ان کا بے مثل اور پائیدار احسان ہے ۔

علاوہ اپنی شخصی علمی ترقی کے انہوں نے قومی کاموں میں بھی پوری دل سوزی اور سرگرمی سے سر سید کی مدد کی ۔ سر سید جس طور مسلمانوں کی تعلیم چاہتے تھے مولینا شبلی بھی اسی کے حامی تھے۔ سر سید سیاسی مطالبات اور سیاسی آزادی کے خلاف نہ تھے مگر خاص وقتی وجوہ سے کانگرس کے طریقوں کو ناپسند کرتے تھے اور انہی خاص تروجوہ کے مسلمانوں سے مسلمانوں کے کانگریس میں کم از کم فی الوقت شرکت سے شدت کے خلاف تھے۔ مولینا شبلی بھی اس وقت اسی اصول کے حامی تھے۔ یہاں تک کہ وہ سر سید کے ایسے کاموں کے بھی بظاہر دل سے حامی تھے جن سے سر سید کے بعض مخلص سے مخلص دوستوں مثلاً نواب وقارالملک کو سخت اختلاف تھا ۔ جیسے سید محمود کا لائف جوائینٹ سیکرٹری بنایا جانا ۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ سر سید کے بعد سید محمود ھی قدرتی طور پر بلا انتخاب سیکرٹری ہوں چنانچہ ۱۸۸۹ء کے مشہور ٹرسٹیز بل کے ضمن میں اسے پاس کیا گیا ۔

مولینا شبلی کے اس کا موئید ہونے کا ثبوت وہ قصیدہ ہے جو انہوں نے اس زمانہ (۱۸۸۹ء) میں سید محمود کی شان میں لکھا اور پیش کیا اس کے تین شعر یہ ھیں !

باپ کی طرح تو اب بن قوم کا پشت و پنا
جانشینی کے لئے کون ہے تجھ سے افضل

ایک عالم کو مسلم ہے تیرا فضل و کمال
پھر نہ مانے کوئی حاسد تو جنوں ہے یا خلل

قوم کی چارہ نوازی بھی ھے تجھ پر لازم
تجھ کو خالق نے بنایا ھے جو مسعود ازل

اوپر کے شعر سے یہ غلط فہمی ہوسکتی ھے کہ اس میں مسعود کا لفظ محمود کے بیٹے مسعود کی مناسبت سے ھے مگر یہ واقع نہیں۔ مسعود کا وجود اس وقت صرف خدا کے علم میں تھا اور ان کی پیدائش اس کے بہت بعد ہوئی۔

یہاں تک مرلوی سمیع اللہ خان جو کالج کی تعمیر و ترقی میں شروع ھی سے سر سید کے دست راست تھے اور وہ خود اور سر سید کے بہت سے دوست سر سید کی جانشینی کا حق سمجھ تے تھے اور جو ٹرسٹیز بل کے سب سے زیادہ مخالف تھے انہوں نے جب میور سنٹرل کالج الہ آباد میں مسلمانوں کے لئے ایک خاص بورڈنگ ہاؤس میں محمڈن بورڈنگ ھاؤس، کے نام سے بنایا اور جس نے سالہا سال تک مسلمانوں کو بہت فائدہ پہنچایا اس کی تاریخ مولینا شبلی نے قرآن کے الفاظ میں ابتدا تاریخ اسلام کے ایک خاص واقعہ ''مسجد ضرار/۱۳۰۸ھ'' سے نکالی۔ اسے سر سید کے ساتھ مولینا شبلی کے جوش عقیدت کی حد سمجھنا چاھئے۔

سر سید تمام اسلامی سلطنتوں کے نہ صرف بقا و قیام بلکہ کامل استحکام کو دل سے چاھتے تھے اور ترکی سلطنت کے سب سے زیادہ حامی تھے۔ چانچہ انہوں نے ترکی لباس خود اختیار کیا اور کالج کے طلبا کی (یونیفارم) وردی قرار دیا۔ یہاں تک کہ وہ مسلمانان ھند کا قومی لباس بن گیا۔ مگر سر سید ترکوں کی خلافت کے قائل نہ تھے چنانچہ مولانا شبلی نے سر سید کے اس خیال کی تائید میں کئی مضمون کالج میگزین میں لکھے۔ کالج ھی کے تعلق کے زمانہ میں ریاست حیدر آباد میں ان کا رسوخ بڑھا اور ریاست سے ان کو سو روپے ماھوار منصب علمی مقرر ہوا۔ الہ آباد یونیورسٹی کے وہ فیلو مقرر ہوئے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے فیلو ہوئے۔ غرض سر سید کی حیات میں اور سر سید کی سرپرستی میں انہوں نے شہرت و عزت کے اعلیٰ سے اعلیٰ مدارج طے کئے۔ اور سر سید بہ الفاظ دیگر علی گڑھ کے ان احسانات کا خلاصہ خود مولانا کے

ان احساسات سے ثابت ہے جو انہوں نے کالج میں اپنے خطاب شمس العلماء کی تبریک و تہنیت کے ایک جلسہ میں ظاہر کئے۔ ان کی تقریر کا ماقل و دل خلاصہ لفظ بہ لفظ یہ ہے ''جب کہ میں اس موقع پر آپ کے اور گورنمنٹ کے احسانات کا شکریہ ادا کر رہا ہوں تو نہائیت ناسپاسی ہوگی اگر میں اس چیز کا ذکر نہ کروں جو ان تمام احسانات کا سر چشمہ ہے۔ یعنی ہمارا قومی کالج۔ یہ سچ ہے اور بالکل سچ ہے کہ اگر میری زندگی کا کوئی حصہ علمی یا تعلیمی زندگی قرار پا سکتا ہے تو اس کا آغاز، اس کی نشو و نما، اس کی ترقی، اس کی نمود، اس کا امتیاز جو کچھ ہے اسی کالج سے ہوا ہے۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہاں آنے سے پہلے میں نے تصنیف کے دائرہ قدم نہیں رکھا تھا۔ لیکن اس کا مقصد کیا تھا۔ آپس کے مذہبی جھگڑے، مسلمانوں کی جماعت کو منتشر کرنا اور جو انتشار پہلے سے موجود تھا اس کو اور قوت و استحکام دینا۔ میں آج سے بہت پہلے فارسی میں شعر بھی کہتا تھا مگر آج اگر میری شاعری پست ہے تو اس وقت پست تر تھی۔ میں نے جو کچھ سیکھا ہے اور جو کچھ ترقی کی ہے وہ اسی کالج کی بدولت ہے۔ اس لحاظ سے میں جس طرح اس کالج کا پروفیسر ہوں اسی طرح اس کا ایک تربیت یافتہ شاگرد بھی ہوں۔ یہ کالج نہ صرف طالب علموں اور اسٹوڈنٹس کو ترقی دلاتا ہے بلکہ وہ پروفیسروں اور ماسٹروں کی علمی اور روحانی ترقی کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اگر وہ طالب علموں کو بی۔ اے اور ایم۔ اے کی ڈگریاں دلا سکتا ہے تو پروفیسروں اور ماسٹروں کو شمس العلماء کر سکتا ہے۔''

غرض مولانا شبلی علی گڑھ میں اس طرح چل رہے تھے کہ وہ اپنے محسنوں اور قدردانوں کے ہاتھوں ہاتھ تھے اور مولانا کے قلب و جگر ان کے ساتھ تھے کہ مارچ ۱۸۹۱ء میں ان کے محسن بلکہ صناع اعظم سر سید کا انتقال ہوا۔ اور اس کا مولانا کے نہایت حساس قلب پر جو اثر ہوا اس کا کچھ عکس اس خط میں نظر آئے گا جو انہوں نے سانحہ کے دوسرے ہی دن نواب علی حسن خاں کو علی گڑھ سے بھوپال لکھا۔ خط عربی میں ہے اور نہایت مختصر ہے مگر گویا اپنے گریہ کے دریا کو

چند سطور کے کوزہ میں بھر دیا ۔ عنوان میں سعدی کے خلیفہ معتصم باللہ کے مشہور فارسی مرثیہ کا یہ شعر ہے ۔

نمی دانم حدیث نامہ چون است
همی دانم کے عنوانش بخون است

عربی خط کا ترجمہ یہ ہے :

'' قوی عمارت کے ستون ھل گئے۔ یعنی سید احمد خان بہادر اپنے پرور دگار کے جوار رحمت میں گئے اور یہ سانحہ نامی یک شنبہ ۲۷ مارچ کو ھوا ۔ قوم کا شیرازہ بکھر گیا ۔ میں کچھ دن تک کوئی کام نہیں کر سکتا ۔''

نشبلی نعمانی

سر سید کا انتقال ۲۷ ، ۲۸ مارچ ۱۸۹۸ء کی درمیانی شب میں ھوا ۲۸ مارچ کو غروب آفتاب کے قریب دفن ھوئے اور یہ خط ۲۹ مارچ کا ھے ۔

اگرچہ مولانا شبلی اردو مضمون میں چوٹی کے مصنف ھیں اور صاحب طرز ھیں جس طرح سر سید اور حالی کا طرز سادگی ھے اس طرح مولانا کا طرز شوکتِ الفاظ ھے اسی طرح جس طرح فردوسی کے مقابلہ میں نظامی کا ھے ۔ پھر بھی سر سید کے معناً بعد اپریل ۱۸۹۸ء میں انھوں نے ''سر سید اور آردو لٹریچر'' کے عنوان سے جو مضمون لکھا ھے وہ تصنیف و تالیف کے میدان میں بھی سر سید کی برتری کے متعلق ان کے کھلے اعتراف کا ثبوت ھے ۔

اقتباس ملاحظہ ھو ۔

''سر سید کے جس قدر کارنامے ھیں اگرچہ ریفارمیشن اور اصلاح کی حیثیت ھر جگہ نظر آتی ھے لیکن جو چیزیں خصوصیت کے ساتھ ان کی اصلاح کی بدولت ذرہ سے آفتات بن گئیں ان میں ایک اردو لٹریچر بھی ھے ۔ سر سید کی بدولت اردو اس قابل ھوئی کہ عشق و عاشقی کے دائرہ سے نکل کر ملکی ، سیاسی ، اخلاقی ، تاریخی ، غرض ھر قسم کے مضامین

اس روز اور اثر وسعت و جامعیت سادگی اور صفائی سے ادا کرسکتی ہے کہ خود اُس کے استاد یعنی فاوسی زبان کو آج تک یہ بات نصیب نہیں۔ ملک میں آج بڑے بڑے انشا پرداز موجود ہیں جو اپنے اپنے مخصوص دائرۂ مضمون کے حکمران ہیں لیکن ان میں سے ایک شخص بھی نہیں جو سر سید کے بار احسان سے گردن اُٹھا سکتا ہو۔ بعض بالکل ان کے دامن تربیت میں پلے ہیں۔ بعضوں نے دور سے فیض اُٹھایا ہے۔ بعض نے مدعیانہ اپنا راستہ الگ نکالا تاہم سر سید کی فیض پذیری سے بالکل آزاد کیونکر رہ سکتے تھے۔''

مذکورہ بالا واقعات اور خود مولانا شبلی کے اعترافات و احساسات کے مندرجہ بالا اقتباسات سے میری رائے میں یہ بخوبی ثابت ہو گیا کہ مولانا نے علی گڑھ (بالفاظ دیگر سر سید سے) یا سر سید بالفاظ دیگر علی گڑھ سے کیا اور کتنا لیا۔ حتیٰ کہ ادب (لٹریچر) اور تاریخ (ھسٹری) میں جو مولانا کے مخصوص میدان ہیں وہ سرسید کا تفوق بلکہ فیض پذیری کھلے دل سے اور کھلے الفاظ میں مانتے ہیں۔

منش کردہ ام رستم داستان
و گر نہ یلی بود در پاستان

اور مضمون کے پہلے جزو کے لئے کہ شبلی نے علی گڑھ سے کیا لیا اس قدر واقعات اور اسی قدر الفاظ کافی ہیں۔

اب دوسرے جزو کر لیجئے کہ

شبلی نے علی گڑھ کو کیا دیا

اس کے لئے اول ان کی علی گڑھ کی زندگی کو معلوم کیجئے کہ وہ بحیثیت ایک معلم کی تھی۔ یوں تو وہ اول فارسی اور عربی کے معین معلم (اسسٹنٹ پروفیسر) اور پھر معلم ہوئے اور ان عہدوں پر وہ ۱۸۸۳ء سے ۱۸۹۸ء تک پندرہ سال رہے۔ جن میں سوا چودہ سال (مارچ ۱۸۹۸ء سر سید کی حیات تک) سر سید کے زیر فیض رہے اور اسی کا اثر تھا کہ علاوہ ذاتی علمی اور تجربہ کی ترقی کے انہوں نے اپنے خاص فرض (معلم

فارسی و عربی) کے عام فیض رسانی میں بھی بہت ترقی کی ۔ ان پندرہ سال میں کالج سے جتنے مسلمان نوجوان علاوہ خالص قومی جوش کے گہرا علمی ذوق لے کر نکلے ۔ ان کی فہرست بہت طویل ہے ۔ میں نمونے اور محض مشتی از خروارے کے طور پر چند نام بتاتا ہوں ۔ عزیز مرزا آفتاب احمد خان ، چودھری خوشی محمد ناظر ، مولوی عبد الحق ، خواجہ غلام الثقلین ، ظفر علی خان ، مسٹر (بعدہ مولانا) محمد علی اور سب سے آخر میں لیکن یقیناً سب سے بڑھ کر پروفیسر ٹامس (بعدہ سر ٹامس) آرنلڈ جو علی گڑھ سے لاهور جا کر اقبال کے استاد ہوئے اور علی گڑھ کے قیام ھی کے زمانے میں انہوں نے مولانا شبلی سے عربی پڑھی اور صحیح اسلامی تبلیغ پر اپنی مشہور اور معیاری کتاب پریچنگ آف اسلام جس کا اردو ترجمہ اشاعت اسلام ہے لکھی ۔ ان کی صحبت سراسر علمی اور دینی صحبت ہوتی تھی ۔ خان صاحب میر ولایت حسین صاحب نے (جو سر سید کے زمانے سے کالج میں اور پھر یونیورسٹی کے آغاز تک اسکول اور بورڈنگ ہاؤس میں نہایت نمایاں ہستی رہے اور جن کا کام کے ساتھ غیر معمولی شغف زبان زد خاص و عام تھا اور جو مذھباً شیعہ تھے) ایک بار مجھ سے فرمایا کہ ہم مجتہد صاحب کے پاس جاتے تھے تو سوائے طہارت کے مسائل کے کوئی اور ذکر مذکور نہیں ہوتا تھا چھی چھی چھی ۔ مگر مولوی شبلی کے یہاں سوائے پر مغز علمی مسائل اور پر معلومات تاریخی واقعات کے اور کچھ نہ ہوتا ۔''

بہت لگتا ہے جی صحبت میں اُن کی
وہ اپنی ذات سے اک انجمن ہے

علاوہ عربی فارسی کے دینیات کا درس بھی انہیں سے متعلق تھا اور اس میں انہوں نے اتنی دلچسپی پیدا کرلی تھی کہ جہاں پہلے طالب علم اس درس سے جان بچاتے تھے اب ٹوٹ کر پڑتے تھے ۔ چنانچہ یہ تاریخی لطیفہ ہے کہ سر سید کے بعد سید محمود از روئے قانون (موجودہ) آنریری سیکریٹری ہوئے اور اپنی خاص مزاجی کیفیت کی بنا پر (جو ان کے مشہور خاص مشاغل کے سبب سے پیدا ہو گئی تھی) سر کردہ ممبران سٹاف

کو تنگ کرنا اور ان کے کاموں میں عیب نکالنا شروع کیا تو مولانا شبلی کے کام میں وہ سوائے اس کے کوئی عیب نہ نکال سکے کہ :

'' دینیات میں انہوں نے طالب علموں کی دلچسپی اتنی بڑھا دی ہے کہ وہ دنیوی تعلیم کی طرف سے اچاٹ ہو گئے ہیں'' انہوں نے '' لجنة الصلواة'' قائم کی جس کے ممبر (جو طالب علم ہی ہوتے تھے) اپنے ساتھیوں کو گھیر گھیر کر مسجد میں لاتے تھے اور صبح کے وقت کمرہ کمرہ حی الصلواۃ پکارتے پھرتے تھے - عربی ادب کے ذوق اور ارتقاء کے لئے لجنة الادب ، کی بنیاد ڈالی آن کے زمانے میں جو مسلم اور غیر مسلم رجال کبار کالج میں آتے تھے ان کی شان میں مولانا مناسب حال قصیدہ پڑھتے جس سے ان بڑی ہستیوں کی دلچسپی کالج کے ساتھ کچھ بڑھ ہی جاتی - تاریخی و تحقیقی مضامین کالج کے جرائد میں لکھتے اور قومی مجامع میں پڑھتے جن سے متعصب مخالفوں کے اسلام پر سے ناروا اعتراضات رفع ہوتے اور مسلمان کا اپنے قابل فخر ماضی کے متعلق علم و وقوف بڑھتا - کالج کے قیام کے زمانے میں انہوں نے کئی مستقل تصانیف کیں - مثلاً سیرة النعمان ، المامون ، سفر نامہ روم و مصر و شام اور رسالوں کی تعداد بھی معتدیہ رہی جیسے کتب خانہ اسکندریہ ، حقوق الزمیین ، وغیرہ وغیرہ اور الفاروق کا سر سری نقشہ بھی علی گڑھ میں بنایا گو تکمیل بعد میں ہوئی - ندوہ کے ابتدائی جسلوں میں وہ علی گڑھ کے قائم مقام کی حیثیت سے انگشت نما ہوتے تھے - سلطنت حیدر آباد کی نظامت سر رشتہ علوم و فنون پر گئے تو وهاں بھی علی گڑھ ہی کا نشان لئے ہوئے تھے - اس کے علاوہ آخر عمر تک انہوں نے جتنے تعلیمی ، مذہبی اور سیاسی کام کے کئے (اور بہت کئے اور چوٹی کے کئے) ان سب میں مولانا کے ساتھ سند علی گڑھ کو بھی ملتی تھی کہ یہ علی گڑھ کے تجربات کی خوبی ہے - اور مولانا بھی مخالفین کے نرغہ کے موقع پر بسا اوقات سر سید کا ہی حوالہ دیتے تھے کہ سر سید نے فلاں ایسے موقع پر ایسا کیا تھا - رسالہ الندوہ کی ایڈیٹری پر مقرر ہوئے تو ان کے ساتھ مولانا حبیب الرحمان خان شروانی لگائے گئے - کیونکہ ارکان ندوہ کو

کامل اعتماد نہ تھا کہ مولانا شبلی اپنی تحریروں میں علی گڑھ کے اثرات و معتقدات سے آزاد رہ سکیں گے - چنانچہ سرورق پر یہ الفاظ ہوتے تھے۔ '' زیر ادارت مولوی شبلی نعمانی و مولوی حبیب الرحمان شروانی '' جس طرح علی گڑھ آ کر اور اس کی فضا سے متاثر ہو کر مولانا شبلی کی تصنیف کا موضوع یک قلم بدل گیا اسی طرح شاعری کا قافیہ بھی تنگی سے فراخی میں بدل گیا اور ان دونوں باتوں کا صاف اعتراف انہوں نے اس تقریر میں کیا ہے جو تہنیت خطاب شمس العلماء کے جلسے میں شکریہ کے طور پر کی جس کا اقتباس میں اوپر دے چکا ہوں - علی گڑھ میں وہ عربی شاعری لے آئے جس میں (بقول خود ان کے شاگرد رشید علامہ سید سلیمان کے فنی خامیاں تھیں) فارسی شاعری کو انہوں نے علی گڑھ میں بیٹھ کر ترقی دی اور ایسی کہ بڑے بڑے نقادان سخن مثل مولانا حالی اور خواجہ عزیز لکھنوی کے حافظ و حزیں کے مغالطے میں پڑ جاتے تھے - مگر جس شاعری نے ان کا نام زبان زد عام کیا وہ اردو شاعری تھی جس کا مطلع تو علی گڑھ میں ہی فرمایا گیا مقطع مدۃ العمر علی گڑھ سے باہر پڑتا رہا - سب کی سب (اور شاید بلا استثنا) بحثیت صولت مضامین اور شوکت الفاظ نہایت ہیبت ناک ہیں -

اب کے میں سمجھتا ہوں کہ عطا اللہ صاحب کے ارشاد کی تعمیل علی گڑھ اور شبلی کے باھمی داداو ستد کے مضمون کو (Give and take) کے مضمون کو بقدر کفاف واضح کر دیا ہے -

خاتمہ الکلام

کے طور پر صرف اتنا کہوں گا (کیونکہ اس کا اس مضمون و موضوع سے میری رائے مںیں چنداں تعلق نہیں ہے) کہ علی گڑھ سے جا کر اور خود اپنی ایک مستقل اور مرکزی حیثیت قائم کر کے سر سید اور ان کی تمام تحریکات کے مخالف (بلکہ طاعن) ہو گئے تھے چنانچہ ادنیٰ نمونہ یہ ہے کہ جب مولانا حالی کی حیات جاوید (سیرت سر سید) شائع ہوئی تو مولانا شبلی نے اسے واقعات کا '' بہی کھاتہ '' اور '' کتاب المناقب ''

بتایا - میرے قیام لاہور کے زمانے میں ایک بار مولانا انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے کے سلسلہ میں لاہور آئے تو میری موجودگی اور سماعت میں متعدد اکابر پنجاب و لاہور کے سامنے فرمایا کہ ’’ جب ۱۸۸۷ء میں کانگرس کے خلاف سر سید کی مشہور و معروف و تاریخی تقریر لکھنؤ میں ہوئی اور جس کی ہندوستان سے لے کر ولایت تک دھوم ہوئی ‘‘ تو مسٹر بیک (پرنسپل ایم - اے - او کالج) نے جو میرے برابر ہی تھے مجھ سے پوچھا مولانا آپ سن رہے ہیں تو میں نے کہا صاحب مجھے تو نیند آ رہی ہے اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں اور غالباً میں نے صحیح سمجھا ہے یہ اس بات کا نتیجہ تھا کہ مولانا کی سر سید اور علی گڑھ سے اثر پذیری کو مولانا کی رائے میں غیر معمولی اہمیت دی جاتی تھی جسے وہ زہر کی طرح اپنی اہمیت کے وجود سے زائل کرنا چاہتے تھے - اور اس کے لئے اُن کی رائے میں سر سید اور علی گڑھ کا استخفاف ہی تریاقِ کامل تھا اور اس میں کامیاب ہوئے ہوں یا نہ ہوئے ہوں لیکن اس زہر کو وہ اپنے شاگردوں اور معتقدوں اور حواریوں تک متعدی کرنے میں ضرور کامیاب ہو گئے -

باوجود کوشش اختصار اگر مضمون طویل سمجھا جائے تو معاف فرمایا جاوے -

عیب طول کلام مت کریو
کیا کہوں میں سخن سے خوگر تھا

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم
چنان کہ حرف عصا گفت موسیٰ اندر طور

عـــربی انشـاء

مولانـا سعیـــد انصـاری

رفیق دارالمصنفین اعظم گڑھ حال ادارہ اردو

انسـائیکلو پیـڈیـا آف اسلام پنجـاب یونیورسٹی ۔ لاھـور

ابو عثمان عمرو بن محبوب کنانی ، لیثی ، بصری (۱۵۰ھ - ۲۵۵ھ) مشہور ہمہ دان ، صاحب تصانیف عالم ، ''الجاحظ'' کے لقب سے ملقب تھا ۔ اُس کو ''حدق'' بھی کہتے تھے ، کیونکہ اُس کی آنکھوں کے ڈھیلے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ باہر نکلے پڑتے ہیں ۔ اس وصف کے ساتھ اُس میں شکل و شمائل کے اور محاسن بھی جمع تھے ۔ وہ بہت پستہ قد ، یعنی پستہ قد تھا ۔ ساتھ ہی سخت بدنما اور کریہ المنظر تھا ۔ ان خصوصیات کی بنا پر لوگوں نے اُس پر طبع آزمائیاں کی ہیں ۔ ایک شاعر کہتا ہے : ''اگر خنزیر کو دوبارہ مسخ کر دیا جائے تب بھی وہ بدصورتی میں جاحظ سے کم رتبہ ہی رہے گا!''

جاحظ نے خود اس سلسلہ میں چند لطائف بیان کئے ہیں :

(۱) کہتا ہے: ''ایک عورت نے مجھے سخت شرمندہ کیا ۔ اُس نے میرا ہاتھ پکڑا ، اور ایک بڑھئی کے پاس لے گئی ، اور کہنے لگی :- ''ایسا !'' یہ کہہ کر آگے بڑھ گئی ۔ مجھ کو تعجب ہؤا ۔ میں نے بڑھئی سے پوچھا کہ ''وہ کیا کہہ گئی ؟'' وہ بولا :- ''میرے پاس آئی تھی ، اور کہتی تھی کہ '' ایک ایسی شکل بنا دو جو ڈراؤنی ہو ، جس سے میرے بچے ڈر جائیں !'' پھر نمونے کے لئے تم کو لے آئی ۔

(۲) ایک دفعہ وہ دروازے پر تھا ۔ ایک عورت آئی اور اُس نے بھی اسی طرح شرمندہ کیا ۔ کہنے لگی : ''مجھے آپ سے ایک کام ہے ۔ ذرا میرے ساتھ چلئے ۔'' جاحظ اُٹھ کر اُس کے ساتھ ہو گیا ۔ وہ اُس کو ایک یہودی سنار کے پاس لے گئی ، اور اُس سے کہنے لگی : ''ایسا !''

اس کے بعد چلی گئی ۔ جاحظ نے سنار سے پوچھا ، تو بولا : ’’ یہ ایک نگینہ لے کر آئی تھی ، اور کہتی تھی کہ اس پر شیطان کی صورت نقش کر دو !‘‘ میں نے کہا : ’’ بیوی ! میں نے شیطان تو دیکھا نہیں !‘‘ اس پر یہ تم کو لے آئی ۔

(۳) ایک عورت نے پستہ قد ہونے کی وجہ سے اُس کو شرمندہ کیا وہ چھاؤنی میں رہتی تھی اور بہت لانبی تھی ۔ ایک دن جاحظ کھانا کھا رہا تھا ، وہ سامنے سے نکلی تو اُس نے مذاق میں چھیڑنا چاہا ۔ اس موقع پر جاحظ نے یہ جملہ کہا :’’ نیچے اُتر آؤ اور ہمارے ساتھ کھانا کھاؤ !‘‘ اُس نے برجستہ جواب دیا : ’’تم اتنے اونچے ہو جاؤ کہ دنیا دکھائی پڑے !‘‘ یہ کوتاہ قامتی پر تعریض تھی ۔

(۴) ایک دن وہ دعا کر رہا تھا ۔ اتنے میں ایک لڑکا اندر آیا اور اُس کی مصروفیت دیکھ کر سوال کیا : ’’میرے آقا ! کیا بات ہے ؟‘‘ جاحظ نے کہا : ’’ ایسا خیال پیدا ہؤا کہ میں لوگوں کا مذاق بن گیا ہوں ، اس لئے خدا سے دعا کر رہا تھا کہ میری بدنمائی دور ہو جائے !‘‘ لڑکے نے جواب دیا : ’’ یہ زیادہ آسان ہے کہ خدا آپ کو ازسر نو پیدا کر دے !‘‘

یہ لطائف تو صورت ، شکل کے متعلق تھے ۔ اب ایک ادبی لطیفہ بھی سن لیجئے :-

ایک شخص نے اُس سے سفارشی خط لکھوایا ۔ اُس نے اپنے کسی دوست کو رقعہ لکھ کر اور اُس پر مہر لگا کر دے دیا ۔ اُس شخص نے راستہ میں مہر توڑ کر خط پڑھا ۔ لکھا تھا : ’’میرا خط تمہارے پاس ایسا شخص لا رہا ہے جس سے میں واقف نہیں ۔ اُس کا کام کرنا تم پر ضروری قرار نہیں دیتا ۔ کر دو گے تو شکر گزار نہ ہوں گا ۔ محروم رکھو گے تو تمہاری مذمت نہ کروں گا !‘‘ شخص یہ خط پڑھ کر اُس کے پاس واپس آیا ۔ جاحظ نے دیکھا ، تو بولا :’’ شاید تم نے خط کھول لیا ؟‘‘ جواب ملا :’’ ہاں ! ‘‘ اُس نے کہا : ’’خط میں جو کچھ لکھا ہے ، اُس سے تم کو کچھ نقصان نہ پہنچے گا ۔ کیونکہ یہ میری علامت ہے ، جب

کسی شخص کے حال پر توجہ کرتا ہوں !'' یہ سن کر اُس شخص نے جواب دیا : ''خدا تیرے دونوں ہاتھ اور دونوں پیر کاٹے ، اور تجھ پر لعنت کرے !'' جاحظ نے کہا : ''یہ کیا ؟'' وہ بولا : ''یہ میری علامت ہے ، جب کسی کا شکر گزار ہوتا ہوں !''

(ملخص از معجم الادباء ، ۸۳ ، ۶ ۱۰)

ان ہنسی کی باتوں بلکہ ''نوادر'' سے آگے رعب ڈالنے والی باتیں سامنے آتی ہیں ! وہ فصحاء اور متکلمین کا امام تھا ۔ اُس کے اخبار اور فوائد سے دنیا کے تمام آفاق لبریز تھے ۔ لوگوں نے یہاں تک کہا ہے کہ خدا نے اُمت محمدیہ پر جو احسان کیا ہے وہ یہ ہے کہ سیاست میں حضرت عمر رض ، علم میں حسن بصری اور بیان میں جاحظ کو پیدا کیا ! (ملخص از معجم الادباء ، ۹۵–۹۸) اُس کی انشاپردازی میں فلسفہ کا پورا اثر ہے ۔ اس لئے تصنیفات میں فصاحت اور خوبیٔ عبارت کے پہلو بہ پہلو حکمائے طبیعین یعنی ارسطو اور کندی وغیرہ کا انداز نظر آتا ہے ۔

جاحظ نے نظام سے معتزلی مذہب کے خیالات سیکھے تھے۔ اُس نے نہ صرف استاد کی پیروی کی ، بلکہ اپنا خود ایک مذہب نکال لیا ۔ یہ ''اسکول'' اُسی کی طرف منسوب ہے ۔ اور ''جاحظیہ'' کہلاتا ہے ۔ ان حکماء کے خاص خیالات ہیں ، جن کے ظاہر کرنے کا یہ موقع نہیں ۔ البتہ اس سلسلہ میں معلم پطرس بستانی نے دائرۃ المعارف (۳۴۹ ، ۶ ۰) اور جرجی زیدان نے تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ جلد دوم میں اُس کا قرآن مجید کے متعلق جو یہ نظریہ نقل کیا ہے کہ ''قرآن نازل ہونے کے بعد جسمانی چیزوں میں شامل ہو گیا ہے ، اس لئے ہو سکتا ہے کہ وہ کبھی آدمی کی شکل اختیار کر لے اور کبھی جانور کی ؟'' یہ قابل نقد ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک قرآن نازل نہیں ہوٗا تھا ، کلام الٰہی تھا جو قدیم ہے ۔ لیکن جب اُس نے نزول کے وقت حرف و صوت کی شکل اختیار کی ، تو جسمانی قالب میں آ گیا ، اور عالم اجسام میں داخل ہو گیا ، اس لئے اب وہ اور شکلیں بھی اختیار کر سکتا ہے ، جس طرح تمام چیزیں شکل بدلتی رہتی ہیں ۔

کچھ شبہ نہیں کہ فلاسفہ کے ایک گروہ نے عالم اجسام کا نظام ''تناسخ ارواح'' سے وابستہ کر کے تسلیم کیا ہے۔ لیکن جاحظ نے ''قرآن کا تناسخ ایجاد کیا تھا؟'' یہ چیز قابل غور ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ افتراء جاحظ کے اُن دشمنوں نے باندھا تھا جو یا صفاتی تھے اور یا اہل سنت! معتزلہ کے مذاہب، علم کلام کی کتابوں میں مفصل درج ہیں۔ جاحظ اُن کی زبان ہے۔ ان کی حجت ہے۔ اُن کے مذہب کا مؤید ہے۔ اُس کے اور معتزلہ کے خیالات بہتیری کتابوں میں درج ہیں۔ یاقوت نے معجم الادباء میں چالیس صفحے (۷۴-۱۱۴، ۱۶۰، طبع مصر) اُس کے حالات میں لکھے ہیں۔ لیکن کہیں بھی اس مہمل بات کا ذکر نہیں! یہ عقل کے دشمن اُس کی یہ بات لے اُڑے کہ ''قرآن مخلوق ہے!'' اس کا سیدھا اور صاف مطلب یہ تھا کہ قرآن نازل ہونے کے بعد چونکہ حرف و صوت کے قلب میں آ گیا ہے، اس لئے وہ اُس کلام الٰہی کی طرح نہیں رہا جو غیر منزل ہے۔ کیونکہ حرف و صوت حادث چیزیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسئلہ ''خلق قرآن'' محض لفظی بحث ہے اور اُس میں کچھ جان نہیں ہے! لیکن ایک زمانہ میں وہ بہت اہم سمجھا جاتا تھا۔ جاحظ پر یہ افتراء بھی اُسی زمانہ کا ہے۔ جس کا مقصد صرف اُس کو بدنام کرنا تھا۔

جاحظ کا ادب میں ایک مستقل طرز تحریر ہے۔ اُس میں بعض ادیبوں نے اُس کی تقلید بھی کی ہے۔ چنانچہ امدی (حسن بن بشر بصری) کے متعلق الفہرست (۱۵۵، طبع یورپ) میں یہی خیال ظاہر کیا گیا ہے۔ ثابت بن قرۃ فلسفی، مشہور مترجم (۲۲۱ھ - ۲۸۸ھ) جو صابئی مذہب رکھتا تھا، جاحظ کی نسبت کہتا ہے: ''مسلمانوں کا خطیب، متکلمین کا شیخ، متقدمین اور متاخرین کا معزز سردار! گفتگو کرے تو بلاغت میں سحبان معلوم ہوتا ہے۔ مناظرہ کرے تو جدال میں نظام کا حریف ہے۔ سنجیدہ ہو تو عامر بن عبد قیس کا لباس پہن لیتا ہے۔ ظرافت پر اُتر آئے تو مزید سے آگے نکل جاتا ہے دلوں کا محبوب، روحوں کا مزاج، ادب کا شیخ، عرب کی زبان! اُس کی کتابیں شاداب گلستان ہیں۔ اُس

کے رسالے پھل دار شاخیں ھیں - علماء اُس سے سیکھتے ھیں - خواص اُس کو مسلم مانتے ھیں - زبان و قلم ، ذھانت و علم ، رائے و ادب ، نثر و نظم ، ذکاء و فہم کا جامع ھے - اُس کو قدرت نے حکمت اور فصل الخطاب عطا کیا تھا ! '' (معجم الادباء ، ۹۷ ، ۹۸) -

جاحظ ، خلافت عباسیہ کے دوسرے دور میں تمام عربی ادیبوں کا امام تھا ! اُس کے ادب اور لغت میں مخصوص اسالیب ھیں ! وہ اپنے دور میں بالکل اُسی طرح چھایا ھؤا تھا ، جس طرح ابن المقنع عباسیہ کے دور اول میں چھا گیا تھا -

علامہ شبلی نعمانی (۱۸۵۷ء - ۱۹۱۴ء) ، ھندوستان کے مشہور ھمہ دان عالم ، مختلف مناسبتوں کی وجہ سے ، عربی تحریر میں اُسی کے پیرو تھے - اُن کے علم و فضل ، وسعت نظر ، واقفیت عامہ ، ذھانت ، ظرافت ، زور طبع کا تقاضا اسی طرز سے پورا ھو سکتا تھا - اُن کے ادب کے استاد مولانا محمد فاروق چڑیا کوٹی اور مولانا فیض الحسن سہارنپوری تھے - مولانا فاروق اگرچہ بہت بڑے ادیب تھے ، لیکن اُن کا مذاق وھی تھا جو حریری وغیرہ کا ھے ! اس لئے تصنع ، تکلف اور صنائع و بدائع سے آراستہ عبارت لکھتے تھے - مولانا فیض الحسن ''سفینہ جاھلیت'' کہلاتے تھے - اس لقب سے یہ بات نکلتی ھے کہ اُن کو اشعار جاھلیت پر کامل عبور حاصل تھا ! دونوں اُستادوں سے مولانا کو ایسی اُلفت تھی کہ ایک کا اردو نثر میں اور دوسرے کا فارسی نظم میں ماتم کیا - لیکن ان دونوں جلیل القدر اساتذہ کا قدیم ، بلکہ عقیم طرز تحریر علامہ شبلی کے لئے بالکل ناکافی اور بے کار تھا !

علامہ شبلی عربی ادب سے کس قدر اعتناء کرتے تھے ؟ اس کا جواب لاھور کے زمانہ طالب علمی سے لے کر جو ۱۸۷۲ء تھا ، اور ۱۸۸۳ء سے جو قیام علی گڑھ کا زمانہ تھا ، دسمبر ۱۹۱۳ء تک اُن خطوط میں ملتا ھے جو مکاتیب شبلی کی دونوں جلدوں میں درج ھیں - ھم اُن کو تتمیم فائدہ کی غرض سے اس جگہ نقل کرتے ھیں -

لاھور کی طالب علمی کے زمانہ (۱۸۷۳ء) کا خط فارسی میں ھے -

اُس میں حاشیہ (۲٦۷ ، ۲.) پر مولانا سید سلیمان ندوی نے بتایا ہے کہ وہاں ادب پڑھنے گئے تھے - اورینٹل کالج کے عربی پروفیسر ، اُس زمانہ میں حضرت مولانا فیض الحسن سہارن پوری تھے -

۱۸۸۲ء کا خط مولوی عمر صاحب (۲۷۲ ، ۲.) کے نام ہے - اُن کو لکھتے ہیں: "دریں فرصت بہ ادب کار دارم - خود چیزی از ادب می خوانم و دیوان حماسہ بدیگری می آموزم -"

۱۸۸٦ء میں جرمنی میں ، عربی و فارسی پر تحقیقات جدیدہ کی ایک مجلس کا اجلاس ہؤا تھا - نواب حمید اللہ خان سر بلند جنگ جو مولوی سمیع اللہ خان کے صاحبزادے تھے، گورنمنٹ ہند کی طرف سے اُس میں نمائندہ بنا کر بھیجے گئے تھے - اُنہوں نے ایک خط بھیجا ، جس کی نسبت مولانا اپنے چچا شیخ عجیب اللہ صاحب (۱۲ اگست ۱۸۸٦ء، مکاتیب ۱۸ ، ۱.) کو لکھتے ہیں: "حمید اللہ خان نے یہ اعتراف کر کے کہ وہ اس کام کو بالکل انجام نہیں دے سکتے، سید احمد صاحب کو لکھا ہے کہ وہاں کے علماء سے کچھ لکھوا کر ارسال فرمائیے - بالخصوص میرا نام لکھا ہے ! یہ مضمون وہ اپنے نام سے نہیں پڑھیں گے - بلکہ جس کا لکھا ہوگا ، اُس کے نام سے - افسوس ہے کہ میری طبیعت صحیح نہیں - آپ کو خط لکھ رہا ہوں اور سر پھرنے لگا ! فرصت بھی کم رہ گئی ہے - شاید نہ لکھ سکوں - آپ دیکھیں گے کہ عربیت اب بھی موجب شہرت و عزت ہے ! اگر آج حمید اللہ خان عربی سے واقف ہوتے تو نہ صرف لندن بلکہ تمام یورپ میں اُن کی نام آوری کا پھریرا اُڑتا !"

مولانا حمید الدین فراہی کے نام ۱۹۰۲ء ، ۱۹۰۳ء ، ۱۹۰۴ء ، اور ۱۹۱۲ء میں اس مضمون کے خطوط آئے: (۱) خط سے معلوم ہؤا کہ عربی عبارت لکھی ہے - داؤد بھائی ۱ کے پاس بھیجتے ہو - اس قسم کے مہملات کام کرو گے ! عربی عبارت لکھ کر اپنا دل خوش کروگے کہ دوسرا حریری پیدا ہؤا ؟ اچھا ، پھر نتیجہ کیا ؟ مسلمانوں کو آج کل حریری اور امراء القیس کی ضرورت ہے ؟" (حیدر آباد دکن ، ۱۲ فروری ۱۹۰۲ء

مکاتیب ۱۲، ۲۰۲ حیدر آباد ہی سے ۱۱ مئی ۱۹۰۳ء کو دوسرا گرامی نامہ آیا : (۲) مکاتیب ۱۷ ، ۲۰ میں ہے :- '' نظام القرآن... عبارت اور طرز بیان کی خوبی میں کلام نہیں !'' (۳) پروفیسر آرنلڈ کی رخصتی کے موقع پر مولانا حمید صاحب کو ایڈریس کی نسبت لکھتے ہیں کہ '' عربی میں لکھ دوں گا !'' یہ خط ۱۵ فروری ۱۹۰۴ء کا ہے ۔ اور مکاتیب کے صفحہ ۲۲ ، ۲۰ میں درج ہے ۔ (۴) ۸ فروری ۱۹۱۲ء کا والا نامہ ، اسی جلد کے صفحہ ۳۴ میں حسب ذیل ہے : ''عبدالواجد نے درجۂ تکمیل ادب میں امتحان دیا ۔ زبانی امتحان ڈاکٹر هارویز نے لیا ۔ اور مجھ کو تعجب انگیز خط اُن کی لیاقت کی نسبت لکھا !''

مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی کے نام ۱۹۰۲ء ، ۱۹۰۷ء ، ۱۹۰۹ء ۱۹۱۰ء اور ۱۹۱۲ء میں اس مضمون کے خطوط آئے :(۱) ۱۹۰۲ء میں دو خط ہیں ۔ علامہ فرید وجدی نے مصر سے '' الاسلام فی عصرالعلم'' ایک رسالہ نکالا تھا ۔ علامہ شبلی اُس کے خریدار بنے ۔ اس سلسلہ میں رسالہ کی نسبت ۲۵ اپریل ۱۹۰۲ء کے والا نامہ میں تحریر فرماتے ہیں : '' زور کا پرچہ ہے اور واقعی عمدہ ہے ۔'' یہ خط حیدرآباد کا ہے ، اور مکاتیب ۱۴۹ ، ۱۰ میں ملے گا (۲) ۔ ۶ ستمبر ۱۹۰۲ء کے خط میں لکھتے ہیں : '' نصاب تعلیم میں برسوں غور کرچکا ہوں ۔ مصر کی اصلاحات کو دیکھتا رہتا ہوں ۔ وهاں سے جدید کتابیں جو اب تک کسی کے پاس نہیں پہنچیں ، اُن کو منگوایا ہے ۔'' یہ خط مکاتیب صفحہ ۱۵۳ میں ہے ۔ (۳) ۴ مارچ ۱۹۰۷ء کے والا نامہ میں جو صفحہ ۱۶۵ میں درج ہے ، مولانا سید سلیمان کی عربی تقریر کا تذکرہ کیا ہے ، جو انہوں نے اپنی دستار بندی کے موقع پر جلسہ میں کی تھی ۔ یہ تقریر بروقت اور برجستہ تھی ۔ سارا مجمع متحیر ہو گیا تھا ! (۴) ۲۹ نومبر ۱۹۰۹ء کے خط (مکاتیب ۱۸۴) میں مولانا شیر علی ، شیخ محمد عرب اور مولوی سید محمد ، دارالعلوم کے اچھے اساتذہ کا تذکرہ ہے ، اور مولانا فاروق صاحب کی نسبت یہ جملہ ہے : ''بڑی مشکل

---

(۱) علامہ شبلی مرحوم کے ایک شاگرد جو مکتوب الیہ کے هم جماعت تھے ۔

یہ ہے کہ مولوی فاروق صاحب مرحوم کا بدل نہیں ملتا !'' مولانا فاروق صاحب عباسی ادیب دارالعلوم تھے - (۵) ۱۹۱۰ء میں چار خط ہیں - ۵ مئی ۱۹۱۰ء (مکاتیب ، ۱۸۸) میں یہ اطلاع دی ہے کہ ''ایلیڈ'' کا عربی میں ترجمہ ہوا ، اور مصر سے کتاب منگوائی - (۶) پھر اس کتاب کی نسبت ۱۵ نومبر ۱۹۱۰ء (مکاتیب ، ۱۹۸) کے خط میں ہے کہ مولوی حقی بغدادی سے علی گڑھ مین بھی خرید لی - (۷) ۲۵ مئی ۱۹۱۰ء کے خط میں جو مکاتیب صفحہ ۱۹۸ میں درج ہے ، دو عرب لڑکوں کا تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے ندوہ آنا مذکور ہے - (۸) ۲۷ اکتوبر ۱۹۱۰ء کے خط (مکاتیب ، ۱۹۸) میں عرب کے نقشہ کی نسبت لکھا ہے کہ ''مصر سے عربی میں نقشہ مل سکتا ہے -'' (۹) ۱۹۱۱ء میں دو خط ہیں - ۶ فروری ۱۹۱۱ء (مکاتیب ، ۲۰۰) کو اطلاع دیتے ہیں کہ ''عربی کی بعض مفید کتابیں مصر سے آئیں -'' (۱۰) مولانا حفیظ اللہ صاحب کے بعد ، مہتمم ندوہ کی جگہ کے لئے مولانا ماجد علی کا نام پیش کر رہے ہیں - مولانا نے علامہ مرحوم سے ادب پڑھا تھا - یہ خط ۱۴ جون ۱۹۱۱ء (مکاتیب ، ۲۰۱) کا ہے - (۱۱) ۲۴ جون ۱۹۱۲ء کے مکتوب (مکاتیب ، ۲۱۱) میں ''کارلائل'' کی کتاب کے عربی ترجمہ کا تذکرہ آیا ہے ، اور لکھا ہے کہ ''اچھا ترجمہ کیا ہے !''

پروفیسر عبدالقادر سرفراز کو ۴ اپریل ۱۹۰۸ء کے خط میں لکھتے ہیں : ''نکلسن سے مجھ کو پہلے سے واقفیت ہے - عربی میں یہ لوگ ابھی کوسوں ہم سے دور ہیں !'' (مکاتیب ، ۲۲۸ ، ۰۱) -

منشی محمد امین زبیری کے نام تین خط اس مضمون کے آئے : (۱) یکم جون ۱۹۰۸ء (دیکھئے مکاتیب ، ۲۴۵ ، ۰۱) کو تحریر فرماتے ہیں : ''تعلیم کے متعلق مصر میں جو دو رسالے لکھے گئے ہیں ، یعنی تحریر المرأة و المرأة الجدیدة وہ نہایت آزادی اور قابلیت سے لکھے گئے - تحریر المرأة کا جواب المرأة المسلمة بھی نہایت عالمانہ اور فلسفیانہ طریقہ سے لکھا گیا -'' (۲) ۳۱ دسمبر ۱۹۱۳ء (مکاتیب ، ۲۶۳) کو لکھا : ''مولوی حمید الدین ... قرآن مجید کے اشکالات پر ان کے چھ رسالے عربی زبان میں

شائع ہو چکے ہیں، جس پر علماء مصر نے حیرت ظاہر کی!'' (۳) ۳۰ جنوری ۱۹۱۴ء کے خط (مکاتیب، ۲۶۸) میں لکھتے ہیں: ''مسلمان عورتوں کے حال میں عربی زبان میں ایک بسیط کتاب مصر میں چھپ گئی ہے۔ وہ تمام کتابوں کی جامع ہے۔''

پروفیسر سید نواب علی رضوی (بڑودہ کالج) کو تحریر فرماتے ہیں: ''فرنچ میں ''دوزی'' بڑا عربی دان گذرا ہے۔ اُس نے عربی لغت پر جو اضافہ کیا ہے، وہ عجیب و غریب چیز ہے! اور میرے پاس ہے۔'' یہ تحریر ۱۸ جولائی ۱۹۱۳ء کی ہے اور مکاتیب شبلی، جلد اول کے صفحہ ۳۰۹ میں درج ہے۔

ان خطوط میں، جن کی تعداد بائیس اور مکتوب الیہم سات ہیں، مختلف اوقات اور مختلف حالات میں عربی زبان سے متنوع دلچسپیوں کا تذکرہ آیا ہے۔ ان سے مفید کتابوں کے مطالعہ کا شوق ظاہر ہوتا ہے۔ مصر میں ادب کی ترقی اور اُس پر نظر معلوم ہوتی ہے۔ تلامذہ میں جن لوگوں نے عربی زبان میں ملکہ پیدا کر لیا تھا، اُس پر اظہار مسرت کی اطلاعیں ملتی ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ یہ ذوق، یہ دلچسپی، یہ انہاک، شروع سے اخیر تک قائم ہے! اور اُس میں کبھی فرق نہیں پڑا ہے! سچ ہے:-

مہر تو در وجودم و عشق تو در سرم
با شیر اندرون شد و با جان تو بدر شود

میں نے اس سلسلے میں ابھی تک علی گڑھ کی لجنۃ الادب اور ندوۃ العلماء کے نصاب میں تکمیل ادب کے درجہ کا ذکر نہیں کیا ہے، جو مولانا کی زندگی کے اہم کارنامے اور اُن کے مقصد کی عملی تصویریں ہیں۔ ان کا بھی اس موقع پر اپنے دماغ میں ایک تصور کر لیجئے۔

ان دلچسپیوں کے ذکر کے بعد اب موقع آ گیا ہے کہ ہم یہ بتائیں کہ خود مولانا کا اپنی عربی انشاء کی نسبت کیا خیال تھا؟ خوش قسمتی سے یہ عقدہ بھی ہم اُنہیں کے قلم سے حل کرنے کا شرف حاصل کر رہے ہیں! علامہ مرحوم کا ایک رسالہ ''الانتقاد'' جرجی زیدان

مصری کی ایک کتاب پر تنقید ھے - یہ ۱۹۱۰ء کی تصنیف ھے - اس کی نسبت مسٹر مہدی حسن افادی اقتصادی کو (۲۲ نومبر ۱۹۱۰ء) لکھتے ھیں: "جرجی زیدان کی تنقید اردو میں کچھ نہیں - اصل مخاطب عرب تھا، اس لئے عربی زبان میں تمام زور صرف ھوا - سو صفحہ کی کتاب ھو گئی - اور لٹریچر بھی ایسا ھے کہ مصر والے بھی ھندوستان کو کچھ چیز سمجھیں گے!" (مکاتیب، ۲۵۸، ۰۲) - پہلے فقرہ کا اشارہ اس اردو مضمون کی طرف ھے، جو الندوہ میں شائع ھوا تھا -

مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی کو اردو مضمون کے کمزور ھونے کی وجہ لکھتے ھیں: "اس کی وجہ یہ ھے کہ طبیعت کا زور عربی میں مصروف تھا - کیونکہ اصلی مخاطب عرب و شام تھا!" (۷ نومبر ۱۹۱۱ء، مکاتیب ۲۰۵، ۰۱)

مولوی محمد ریاض حسن خاں، رئیس رسول پور ضلع مظفر پور کو تحریر فرماتے ھیں: "المنار میں یہ رسالا بتدریج شائع ھو گا - خوشی کی بات ھے کہ ھندوستان کی آبرو، مصر میں قائم رھی -" یہ خط ۱۲ فروری ۱۹۱۲ء کا ھے، اور لکھنؤ سے لکھا گیا ھے - مکاتیب کے صفحہ ۲۱۷، ج ۲ میں ملے گا -

یہ مبارک رائیں سنانے کے بعد، ھم صرف یہ کہہ سکتے ھیں اور خوش ھیں کہ "حل این عقدہ ھم از روے نگار آخر شد!"

مولانا کے بعض عربی رسالے اور خطوط علی گڑھ کے قیام سے پہلے کے ھیں، یعنی جنوری ۱۸۸۳ء سے پہلے ھی وہ لوگوں سے عربی میں خط و کتابت کرتے تھے - ان میں سے جو خطوط، مصر وغیرہ کے علماء کو لکھے ھیں، وہ نہیں مل سکے - چند خطوط مکاتیب میں ھیں - ان میں سے ایک پر سید سلیمان صاحب نے حاشیہ میں لکھا ھے کہ علی گڑھ جانے سے پہلے کا ھے (۲۹۲، ۰۲) - رسائل کی تاریخی ترتیب یہ ھے:

(۱) اسکات المعتدی	(۲) بدء الاسلام
(۳) الجریة	(۴) الانتقاد

ان میں سے مجھے صرف آخری رسالہ ملا - مولانا نے اُس کو لکھنؤ میں خود چھپوایا تھا - لیکن وہ ایڈیشن ، پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں نہیں ہے - یہاں اُس کا دوسرا ایڈیشن ہے ، جو ۱۹۱۲ — ۱۳۳۰ھ میں مطبع المنار ، مصر سے علامۂ سید رشید رضا نے نکالا تھا - یہ انگریزی کتابوں کے چھوٹے سائز پر چھاپا گیا ہے - اور ۱۷۶ صفحات پر حاوی ہے اِس میں ۸ صفحے سید رشید رضا صاحب نے ناشر کی حیثیت سے لکھے ہیں - جس میں اس کی تصنیف کے اسباب ، اور سخت لب و لہجہ کے سبب جرجی زیدان سے معذرت ، پھر اس کے شائع کرنے کی ناگزیر وجہ بیان کی ہے - اس کے بعد ۱-۷۶ میں مولانا کی ''الانتقاد علی التمدان الا سلامی'' ہے اس کتاب کی اشاعت کے زمانہ میں دو ، تین عربی اهل قلم نے بھی اسی عنوان پر مضمون لکھے تھے - تتمیم فائدہ کے لئے ناشر نے ان کو بھی اسی کتاب کے ساتھ چھاپ دیا ہے - ۷۷ — ۱۲۶ میں استاذ شیخ احمد عمر اسکندری کی تنقید ہے ، اور بہت عالمانہ ہے - ۱۲۷-۱۳۶ میں آب لویس شیخو مشہور عیسائی ادیب کی تنقید ہے - ان تین تنقیدوں کے بعد ، جو ''کتاب التمدن الاسلامی'' پر ہیں ، لویس شیخو کی ایک اور تنقید ۱۳۷ — ۱۶۷ میں چھاپی گئی ہے ، جو اُنھوں نے جرجی زیدان کی '' طبقات الامم '' پر کی تھی - اس طرح یہ پوری کتاب ، تنقید علمی وسعت نظر اور معلومات کے لحاظ سے علم و ادب کا ایک لازوال خزانہ ہے - اور یقیناً وہ فنا ہو جاتا اگر علامہ سید رشید رضا اُس کی اشاعت پر کمر بستہ نہ ہو جاتے !

مارچ ۱۹۱۲ء میں علامۂ رشید رضا ، ندوة العلماء کے اجلاس سالانہ کے صدر ہو کر ہندوستان تشریف لائے تھے ! اُن کے دعوت نامے کے ساتھ ، علامہ شبلی نے '' الانتقاد '' کا مطبوعہ نسخہ بھی بھیجا تھا - اُنھوں نے چلتے وقت اُس کو المنار میں شائع کرنے کے لئے ہدایت کر دی - اور خود ہندوستان روانہ ہو گئے ! رسالہ کا پر زور طرز تحریر ، مصر و عرب و شام میں ایک ہیجان کا باعث بنا ! جرجی زیدان نے اپنی تردید پڑھ کر علامۂ شبلی کو ایک خط لکھا ! وہ خط میں نے دیکھا

ہے ! ۱۹۱۶ء تک دارالمصنفین میں محفوظ تھا ۔ اور علامہ مرحوم کی ایک وقف کردہ کتاب کے اندر رکھا ہوا تھا ۔ اب نہیں معلوم کہ موجود ہے یا معدوم ہو گیا ۔

سید رشید رضا صاحب نے دیباچہ میں یہ بات ظاہر کی ہے کہ ''علامہ شبلی نے ندوہ میں اُن کو جرجی زیدان کا وہ خط دکھایا ! اُس میں علامۂ سے بیس برس کی دوستی اور شناسائی کا حق جتانے ، اور اس تعلق کا لحاظ نہ رکھنے پر افسوس کرنے کے بعد ، یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ علامہ ، رسالہ کی اپنی طرف نسبت سے انکار فرما دیں لیکن علامہ نے اس کا کچھ جواب نہیں دیا'' یہ مضمون مجھے اس وقت یاد نہیں آتا ۔ کیونکہ خط دیکھے ہوئے بہت زمانہ گذر گیا ہے ۔ اتنا البتہ یاد آتا ہے کہ چند سطروں کا خط تھا ، اور یہ استدعا کی تھی کہ علامہ کی مرضی اور اشارے کے مطابق ، وہ اپنی کتاب میں ترمیم کریں گے ۔

جاحظ سے موازنہ :—

مولانا کے طرز تحریر کی نسبب چند ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اوپر جو اظہار خیال کیا گیا اُس سے جی میں یہ آ رہا ہے کہ اسی لپیٹ میں اُن کی تحریر کا جاحظ کی تحریر سے موازنہ بھی کر دوں! لیکن ڈرتا ہوں ، کہیں ناظرین وہ فقرہ چست نہ کر دیں ، جو طاہر بن الحسین (ذوالیمینین) نے ابو عبداللہ مروزی (صوفی) کی نسبت کہا تھا جاحظ نے کتاب الحیوان (۳ ، ۳۰) میں لکھا ہے کہ ابوعبداللہ مروزی ایک بار طاہر سے ملنے آئے تو اس نے سوال کیا : '' ابو عبداللہ ! آپ کو عراق آئے ہوئے کتنا زمانہ گذرا ؟ '' اُنھوں نے جواب دیا : '' بیس برس سے یہاں رہتا ہوں اور تیس برس سے روزے رکھ رہا ہوں ! '' طاہر بولا : '' اے ابو عبداللہ ! ہم نے آپ سے ایک بات پوچھی تھی آپ نے دو باتوں کا جواب دیا '' طرز تحریر سے موازنہ تک ذہن کا منتقل ہونا ، اسی قسم کی ایک صورت ہے ، جو بعض ناظرین کے نزدیک قابل اعترض ہو گی ۔

تاہم ذیل میں ہم اس غرض سے دو ہمرنگ عبارتیں درج کرتے ہیں ، جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ادب کا نباض کسی حال میں ایک چابک دست مصور سے کم نہیں ہوتا اور وہ اپنی انفرادیت قائم رکھنے کے لئے ایک نیا راستہ ضرور نکال لیتا ہے ۔ ان عبارتوں میں جاحظ کا اطناب اور مولانا کا ایجاز بہت معنی خیز ہے ۔ اول الذکر کے اطناب نے عبارت کا زور گھٹا دیا ہے موخرالذ کر کے ایجاز سے عبارت زور دار ہو گئی ہے ۔ کیونکہ شروع سے اخیر تک ایک ہی رنگ قائم ہے ۔ اور نشیب و فراز کہیں پیدا نہیں ہونے پایا تمہید کے اطناب نے ایک فرق یہ بھی پیدا کیا ہے کہ اُس کا آخری حصہ اصل مضمون سے مل کر لاپتہ ہو گیا ہے ، جس طرح سمندر کسی ریگستان میں جذب ہو جائے ۔ بخلاف اس کے ، تمہید کے ایجاز نے اپنا آخری حصہ اصل مضمون سے علیحدہ رکھا ہے ۔ خاتمہ بہت ہی پر زور ہے اس کے علاوہ عبارت کے فرق کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ دونوں کے مقصد میں زمین و آسمان کا فرق ہے ۔ جاحظ محض اپنی تصنیفات اور خیالات کے لئے مدافعت کر رہا ہے اور مذہبی علماء کے عائد کردہ الزامات رفع کرنا چاہتا ہے ۔ لیکن مولانا خود اسلام کی طرف سے مدافعت کر رہے ہیں اور عیسائی مصنف کو الزام دے رہے ہیں کہ اُس نے بد دیانتی سے کام لیا ہے اور اس سلسلے میں تدلیس سے لے کر تحریف تک پر اُتر آیا ہے ۔ ظاہر ہے کہ ان مقاصد کی وجہ سے دونوں کے لہجے اور عبارت میں پستی اور بلندی ، زور اور کمزوری پیدا ہو گئی ہے ۔ اور ایسا ہونا بالکل قدرتی بات تھی ۔

بہر حال بلاغت کی جو تعریف جاحظ نے کی ہے ، اُس کے لحاظ سے اُس کی سب سے بہتر تصنیف ، ”کتاب الحیوان“ کا سب سے پر زور عبارت والا حصہ میں نے انتخاب کیا ہے اور اسی خصوصیت کو سامنے رکھ کر علامہ شبلی کی عبارت بھی چنی ہے ۔ ایجاز و اطناب اور مقصد کی بلندی و پستی کو نظر انداز کرنے کے بعد ، جو خصوصیتیں دونوں مصنفوں میں مشترک نظر آتی ہیں وہ یہ ہیں :۔ ”لفظ و معنی مساوی اور مناسب

ہیں۔ نا پسندیدگی سے عاری، اور تکلف سے خالی ہیں۔ حسن موقع کے مطابق اور سامع کے لئے مفید ہیں۔ نکتہ چینوں اور عیب بینوں سے اپنی حفاظت کرتے ہیں۔ دلوں میں گھر کرتے ہیں۔ سینوں میں سما جاتے ہیں۔ الفاظ بجائے خود شریف، کھرے، فضول سے محفوظ، تعقید سے بری ہیں، اس لئے نفس کو پسند آتے ہیں۔ ذہن سے مل جاتے ہیں۔ اور عقل سے پیوند کھا جاتے ہیں۔ کان ان کے مشتاق رہتے ہیں۔ دلوں کو راحت ملتی ہے۔ راویوں کی زبان پر آسانی سے چڑھ جاتے ہیں۔ اور ان کا تمام عالم میں چرچا ہو جاتا ہے۔ لوگ ان کی وقعت کرتے ہیں۔ وہ عالم کے لئے مواد اور متعلم کے لئے مشق و ریاضت کا سامان مہیا کرتے ہیں جس کو ان کا کچھ حصہ مل جاتا ہے وہ معانی کو محبوب سمجھنے لگتا ہے۔ اور اس کے لئے نظام لفظ سلیس ہو جاتا ہے۔ وہ سامع کو تکلف کی مشقت سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ اور پڑھنے والے تفہم کے علاج سے بے فکر رہتے ہیں۔"

یہ خیالات جاحظ کے ہیں جن کو ابو حیان توحیدی نے اُس تالیف میں لکھا ہے جو جاحظ کی تقریظ پر ہے۔ یا قوت نے معجم الادباء (۳، ۹۵، ۱۶، ۰) میں ان کو نقل کیا ہے۔ ان کو سامنے رکھ کر اب موازنہ کی عبارتیں دیکھئے!

الانتقاد علی التمدن الاسلامی	کتاب الحیوان
ان الدهر دار العجائب۔ و من عجائبه ان رجلاً من رجال العصر یؤلف فی تاریخ تمدن الاسلام کتاباً یرتکب فیه تحریف الکلم و تمویه الباطل، و قلب الحکایة، والخیانة فی النقل و تعدمد الکذب، ما یفوق الحد، و یتجاوز النهایة، ینتشر هذا الکتاب فی مصر و هی غرة البلاد،	جنبک الله الشبهة و عصمک من الحیرة، وجعل بینک و بین المعرفة نسباً و بین الصدق سبباً، و حبب الیک التثبت، و زین فی عینک الانصاف، و اذاقک حلاوة التقویٰ، و اشعر قلبک عزالحق، و اودع صدرک البر و الیقین، و طرد عنک ذلة الیاس، و عرفک ماق الباطل من

الذلة و ما فی الجهل من القلة ۔

و لعمری لقد کان غیر هذا الدعاء اصوب فی امرک ،و ادل علی مقدار وزنک و علی الحال التی وضعت نفسک فیها ، و وسمت عرضها بها ، ورضیتها لعرضک حظاً و لمروتک شکلاً ، لدینک اذاً کان ضاراً فی العاجل والکذب اذاً کان نافعاً فی الاجل ، ولم جعل الصدق ابداً محموداً ، والکذاب ابداً مذموماً ، والفرق بین الغیرة واضاعة الحرمة ،و بین الافراط فی الحمیة والانفة ، و بین التقصیر فی حفظ حق الحرمة و قلة الا کتراث بسوء القالة ، و هل الغیرة اکتساب و عادة ام بعض ما یعرض من جهة الدیانة ولبعض التزید فیه والتحسن به ، او یکون ذالک فی طباع الحریة و حقیقة الجوهریة ، ما کانت العقول سلیمة و الافات منیفة والا خلاط معتدله ۔

وعبتنی بکتاب الصرحاء و الهجناء ، و مفاخرة السودان والحمران ، موازنة ما بین حق الخؤلة والعمومة ۔ و عبتنی بکتاب الزرع و النخل و الزیتون و الا عناب و اقسام فضول الصناعات و مراتب التجارات ، و بکتاب فضل ما بین الرجال و النساء و فرق ما بین الذکور والاناث و فی وقبة الاسلام ، و مغرس العلوم ، ثم یزداد انتشاراً فی العرب و العجم ، و مع هذا کله لا یتفطن احد لدسائسه۔ ان هذا لشیئی عجاب ۔

لم یکن المرء لیجتری علی مثل هذا الفظیعة فی مبتدء الامر ولکن تدرج الی ذالک شیئاً فشیئاً ، فانه اصدر الجزء الثانی من الکتاب و ذکر فیه مثالب العرب دسیسة یتطلع بها علی احساس الامة و عواطفها ، ولما لم یتنبه لذلک احد ، و لم ینبض لاحد عرق ، و وجد الجو صافیا ، ارخی العنان و تمادی فی الغی ، و اسرف فی النکایة فی العرب عموماً ، وخلفاء بنی امیة خصوصاً ۔

وکان یمنعنی عن النهوض الی کشف دسائسه اشتغالی بامر ندوة العلماء ۔ ولکن لما عم البلاء ،واتسع الخرق ، وتفاقم الشر ، لم اطق الصبر فاختلست من اوقاتی ایاما وتصدیت للکشف عن عوار هذا التالیف والا بانة عما فیه من انواع الافک والزور و اصناف التحریف و التدلیس ۔

انی ایها لفاضل المؤلف غیر جاحد لمنتک فانک قد نوهت باسمی فی تالیفک هذا و جعلتنی موضع الثقة منک ، واستشهدت باقوالی و نصوصی و وضقتنی بکونی من اشهر علماء الهند،

ای موضع يغلبن و يفضلن و فی ای موضع يكن المغلوبات و المفضولات و نصيب ايها فی الولد اوفر و فی ای موضع يكون حقهن اوجب و ای عمل هو بهن اليق و ای صناعة هن فيها ابلغ -

وعبتنی بكتاب القحطانية ، والعدنانية فی الردعلیٰ القحطانية ، وزعمت انی تجاوزت فيه حد الحمية الیٰ حد العصبية ،و انی لم اصل الیٰ تفضيل العدنانية الا بتنقيص القحطانية - و عبتنی بكتاب العرب و الموالی ، و زعمت انی بخست الموالی حقوقهم كما انی اعطيت العرب ماليس لهم - وعبتنی بكتاب العرب والعجم ، وزعمت ان القول فی فرق مابين العرب و العجم هو القول فی فرق مابين الموالی والعرب ، و نسبتنی الیٰ التكرار و الترداد ، والیٰ التكثير و الجهل بما فی المعاد من الخطل و حمل الناس المؤن -

و عبتنی بكتاب الا صنام و بذكر اعلالات الهند لها ، و سبب عبادة العرب اياها ، و كيف اختلفا فی جهة العلسة مع اتفا قهما علی جملة الديانة ، و كيف صار عباد البددة و المتمسكون بعبادة الاوثان المنحوتة والاصنام المنجورة اشد الديانين الفاً لما دانوا به و شغفاً لما مع انی اقلهم بضاعة ،و اقصرهم باعا و اخملهم ذكراً ، و لكن مع كل ذلک هل كنت ارضی ان تمد حنی و تهجو العرب ، فتجعلهم غرضاً لسهامک ، و درية لرمحک ترميهم بكل معيبة و شين و تعزو اليهم كل دنية و شر ، حتی تقطعهم ارباً ارباً ، و تمزقهم كل ممزق - وهل كنت ارضی بان تجعل بنی امية لكونهم عربا بحتا من اشر خلق الله و اسوء هم ، ويفتكون بالناس ، و يسومونهم سوء العذاب ، و يهلكون العرث و النسل ، يقتلون الذرية ،و ينهبون الاموال ،وينتهكون الحرمات و يهدمون الكعبة ،ويستخفون بالقران !

وهل كنت ارضی بان تنسب حريق الخزانة الاسكندرية الی عمر بن الخطاب الذی قامت بعدله الارض و السماء - و هل كنت ارضی بان تمدح بنی العباس فتعد من مفاخرهم انهم نزلوا العرب منزلة الكلب ، حتی ضرب بذالک المثل ، و ان المنصور بنی القبة الخضراء ارغاما للكعبة و قطع الميرة عن الحرمين استهانة بهما ، و ان المامون كان ينكر نزول القرآن ، و ان المعتصم بالله انشأ كعبة فی سامرا و جعل حولها مطافا و اتخذ منی و عرفات -

و هب انی عدمت الغيرة علی

تعبدوا له ،واظهر هم جداً و اشدهم
علیٰ من خالفهم ضغناً وبما دانواضنا،
ومـا الفرق بین الوثن والصنم ، وما
انفرق بین الدمیة و الجثة ولم صوروا
فی محاریبهم و بیوت عباداتهم صور
عظائهم ور جال دعوتهم ، و لم تأنقوا
فی التصویر و تجردوا فی اقامـة
الترکیب و بالغوا فی التحسین و
التفخیم ، و کیف کانت اولیهٔ تلک
العبادات و کیف افترقت تلک النحل
و من ای شکل کانت خدع تلک
السدنـة و کیف لم یزا لوا اکثر
الاصناف عدداً و کیف شمل ذلک
المذهب الاجناس المختلفـة ۔

و عبتنی بکتـاب المعادن و القول
فی جواهر الارض ، و فی اختلاف
اجناس الفلز والا خبار عن ذائبها و
جامدها و مخلوقها و مصنوعها و کیف
یسرع الاانقلاب الیٰ بعضها و یبطئی
عن یعضها ، و کیف صار بعض الا
لوان یصبغ ولا ینصبغ و بعضها ینصبغ
ولا یصبغ و بعضها یصبغ و ینصبغ ،
وما القول فی الا کسیر و التلطیف ۔
(۲-۳)

الملة والدین ، وافتخرت کصنیع بعض
الاجانب بانی فلسفی بحت عادم لکل
عـاطفة و وجـدان ، فـلا ارضی ولا
اغضب و لااسر ولا اغتاظ ولا افرح
ولا اتالم ، و هب انی حملت نفسی
علی احتمال الضیم ، و قبول المکروه
و الصمم عن البذاء ، ومجازاة السیئة
بالحسنة ، و مکافاة الخبیث بالطیب ،
فهل کنت رضی بان تشوه وجه التاریخ
و تـدمغ الحق ، و تروج الـکذب ،
و تفسد الروایة ، و تقلب الحقیقة ،
و تنفق التهم ، و تعود الناس الخرافة
بئس مازعمت ایها الفاضل ! فـان
فی الناس بقایا وان الحق لا یعدم
انصاراً (۱-۳)

جاحظ کی تمہید لا نبی ھے ۔ ھم نے تھوڑا سا حصہ لے لیا ھے ۔ اور ترجمہ اس لئے چھوڑ دیا ھے کہ اردو میں وہ زور اور لطف باقی نہ رھتا ۔ اب دونوں عبارتیں آمنے سامنے رکھ کر پڑھئے تو نظر آئے گا کہ

یہ طرز تحریر کتنا بلند ، رواں اور بے تکلف ہے ۔ اور اس میں کس غضب کی آمد ہے؟ ساتھ ہی بھی یہ معلوم ہوگا کہ علامہ شبلی ، جاحظ کے رنگ میں نہ صرف یہ کہ بہت کامیاب ہیں ، بلکہ اس عبارت میں اس سے آگے نکل گئے ہیں لیکن اس موقع پر جاحظ اور شبلی میں دریا اور چشمہ کی مثال بھی سامنے رکھنا چاہئے ۔ جاحظ کی تصنیفات میں عربی علم ادب کا جو دریا موجزن ہے ، شبلی کے رسائل کا سر چشمہ ، گو کتنا ہی صاف و شفاف ہو ، اس کی ہمسری نہیں کر سکتا — اصلاً اور وطناً ہندی ، شبلی کے لئے یہ بات کس قدر قابل فخر ہے کہ وہ اس عربی الاصل ، فطری انشا پرداز سے ٹکر لے رہے ہیں جو اسلام کا مایۂ ناز اور اپنے زمانہ کا سب سے بڑا انشا پرداز تھا ۔

شبلی نعمانی کی سیاسی نظمیں

ڈاکٹر وزیر آغا

ہندوستان میں انیسویں صدی کا اہم ترین واقعہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی ہے ۔ محض اس لئے ہی نہیں کہ اس سے اہل وطن کی طویل جد و جہد آزادی کی ابتدا ہوئی تھی بلکہ اس لئے بھی کہ اس کے باعث ہندوستان صدیوں کی گہری نیند سے بیدار ہؤا تھا اور اہل ہند ایک نئے سیاسی اور سماجی شعور سے آشنا ہونے لگے تھے ۔ انہوں نے نہ صرف غدر اور غدر کے بعد کے واقعات میں انگریز کی سامراجیت ، عہد شکنی اور ظلم کے واضح مظاہر دیکھ لئے تھے اور یوں اپنے دلوں میں حب وطن کی ایک ننھی سی قندیل روشن کر لی تھی بلکہ اب وہ انگریز ہی کے حربوں سے بدرجۂ اتم فائدہ اٹھاتے ہوئے ، ملکی آزادی ، جمہوریت اور اور مغربی علوم و فنون سے بھی آشنا ہونے لگے تھے ۔ چنانچہ اس زمانہ کے متعدہ ہندوستان میں پڑھے لکھے لوگوں کا ایک بہت بڑا طبقہ انگریز سے نفرت کے باوجود انگریزی اطوار کو اپنانے کی آرزو میں سرشار دکھائی دیتا ہے اور خاص طور پر وطن اور آزادی کے مسئلہ پر اس کا رویہ بے باک اور دلیرانہ ہے ۔

۱۸۵۷ء کے بعد کا یہ دور اردو میں بھی ایک انقلاب عظیم کا دور ہے ۔ اس زمانہ میں سجاد حسین اور رتن ناتھ سرشار کی مساعی سے ایک ایسی اخباری دنیا معرض وجود میں آئی ہے جس کے لکھنے والوں کے ”قلم سے پھبتیاں ایسے نکلتی ہیں جیسے کمان سے تیر“ ۔ موخرالذکر گروہ نے طنز و تحریف کے حربوں سے ناقص اقدار ، مضحکہ خیز میلانات اور سیاسی بے اعتدالیوں کو پہلی بار ایک بڑے دلیرانہ انداز سے طشت از بام کرتے ہوئے آزادی کی بنیادوں کو مستحکم کیا ہے ۔ اور ملک کی ایک نہایت اہم خدمت سر انجام دی ہے ۔ تا ہم بیشتر اوقات جذبات

کی فراوانی اور توازن کی کمی کے باعث ان لوگوں کے لہجے میں اوچھا پن اور گالی گلوچ کے عناصر بھی نمودار ہوئے ہیں ۔ اور انہوں نے اپنے شخصی رد عمل کے اظہار میں دلیل کو جذبے کے تابع کر دیا ہے ۔ اودھ پنچ کے کارٹون اور سجاد حسین کے معرکے اس جذباتی اُبال کا ایک واضح نمونہ ہیں ۔

رجحانات کی آویزش ، آزادی کی مختلف تحریکوں کے تصادم اور صحافتی دنیا میں جذبات کے ٹکڑاؤ کے اس دور میں شبلی نعمانی کی سیاسی نظمیں ، طنز میں توازن ، جذبے اور دلیل کے دل کش امتزاج اور ھنگامی واقعات کے بیان میں شخصی تاثر کے اظہار کا ایک قابل قدر نمونہ ہیں اور ان کے مطالعہ سے ہم صحافتی شاعری کا ایک اچھا معیار قائم کر سکتے ہیں ۔

بادی النظر میں سیاسی نظموں کو ادبی تحقیقات کے زمرے میں شامل کرتے ہوئے سخت ھچکچاھٹ محسوس ہوتی ہے ۔ یہ اس لئے کہ سیاست محض ھنگامی واقعات سے متعلق ہوتی ہے اور جب وقت کی گزران کے ساتھ ان واقعات پر گرد جم جاتی ہے اور یہ قصے ایک داستان پارینہ کا درجہ اختیار کر لیتے ہیں تو ناظر کے لئے ان واقعات سے اکتساب حظ قریب قریب نا ممکن ہو جاتا ہے اس کے بر خلاف ادب ، واقعات کی بہ نسبت اُن رجحانات و میلانات سے وابستہ ہوتا ہے جو ھنگامی واقعات کے پس پشت زندہ و قائم ہوتے ہیں اور جو یقیناً محض ایک دور تک محدود نہیں ہوتے ۔ چنانچہ وقت اور جگہ کی بندشوں سے آزادی ، ادب کو اس کی مخصوص صورت عطا کرتی ہے ۔ دوسری وجہ غالباً یہ ہے کہ سیاسی نظموں میں بالعموم وہ خلوص نہیں ہوتا جو شخصی نقصان کے باعث یا ذاتی وابستگی کی بنا پر ادبی تخلیقات میں نمودار ہوتا ہے ۔ دوسرے لفظوں میں سیاسی نظمیں ، خارجی واقعات کے دباؤ سے معرض وجود میں آتی ہیں اور یا پھر زیادہ سے زیادہ انبوہ کے رد عمل سے متاثر ہوتی ہیں ۔ لیکن ادبی تخلیقات دل کی گہرائیوں سے ابھرتی ہیں اورخارجی واقعات کے ساتھ اُن کی وابستگی عموماً بالواسطہ ہوتی ہے ۔ نتیجہ سیاسی

نظموں میں خلوص اور سوز کا وہ عالم دکھائی نہیں دیتا جو ادبی تحقیقات کا مابہ‌الامتیاز ہے ۔ تا ہم جب شبلی نعمانی کی سیاسی نظموں کا مطالعہ کریں تو ہم سب سے پہلے یہی تاثر قبول کرتے ہیں کہ یہ نظمیں شخصی نقصان کے احساس سے لبریز اور سوز وگداز کے عناصر سے متصف ہیں ۔ درآنحالیکہ حقیقت محض یہ ہے کہ شاعر نے ہنگامی واقعات سے متاثر ہو کر یہ نظمیں سپرد قلم کیں اور ان کا محرک کسی شخصی نقصان کا احساس نہیں تھا ۔ یہ بات اس چیز پر دال ہے کہ شبلی مرحوم کے لئے قومی یا ملکی معاملات بھی واردات قلب کی حیثیت رکھتے تھے اور ان کی اجتماعی صورت کے باوصف ، وہ ان سے اسی طرح متاثر ہوتے تھے جیسے اپنے ذاتی معاملات سے ۔ چنانچہ شبلی کی سیاسی نظموں کا مابہ‌الامتیاز ان کا وہ پر خلوص لہجہ ہے جو ناظر کو بھی متاثر کر دیتا ہے اس سب پر مستزاد ان نظموں میں وہ سوز اور تڑپ بھی ہے جو وقت گزر جانے کے باوجود دل کے تاروں کو مرتعش کرتی ہے اور ناظر ان نظموں سے اسی طرح متاثر ہوتا ہے جیسے خالص ادبی تحقیقات سے ۔ شبلی کی سیاسی نظموں کی یہ ایک بہت بڑی خوبی ہے کہ بالعموم ان نظموں کی سرحدیں ادب کی سرحدوں میں ضم ہو جاتی ہیں اور اس انضمام کے نتیجے کے طور پر ایک ایسی شاعری معرض وجود میں آتی ہے جس کے موجد بھی شبلی نعمانی ہیں اور جو غالباً ان ہی پر ختم بھی ہو جاتی ہے ۔ ” غالباً “ میں نے اس لئے کہا کہ ان کے بعد ظفر علی خاں نے جب اسی روش پر سیاسی نظمیں لکھنے کا آغاز کیا تو ان کی قادر الکلامی بھی بعض دلکش نظموں کی تحقیق کی صورت میں ظاہر ہوئی تاہم ظفرعلی خاں کے ہاں ایک بلا واسطہ انداز ، جذبے کی شدت نیز طنز میں نشتریت کی فراوانی کے باعث ایک مخصوص طرز کی ایسی سیاسی نظمیں نظر نہیں آتیں جیسی مثلاً شبلی نعمانی کے ہاں ملتی ہیں ۔ اس کی کئی ایک وجوہ ہیں جن میں سے اہم ترین یہ ہے کہ شبلی کی حیثیت زیادہ تر ناظر کی سی تھی اور وہ اکھاڑے کے کنارے پر کھڑے حالات و واقعات سے متاثر ہوتے تھے لیکن ظفر علی خاں خود بھی اکھاڑے کے مرد مجاہد تھے دوسرے ظفر علی خاں کے ہاں منتقمانہ روش اور جذبے کی

فراوانی تھی لیکن شبلی کے ہاں جذبے میں توازن تھا اور فطرت کی طرف سے انہیں ایک ایسا دل عطا ہوا تھا جو سوز وگداز کے عناصر سے لبریز تھا - پس ان کی سیاسی نظمیں ایک ایسے ہمدردانہ انداز نظر کی حامل ہیں جو سیاسی نظمیں لکھنے والوں میں عام نہیں ہے - چند مثالیں دیکھئے کانپور کی مسجد کے حادثۂ خونیں سے شبلی نے جو تاثر قبول کیا تھا اس کا نتیجہ ان اشعار کی صورت میں منظر عام پر آیا ہے -

کل مجھ کو چند لاشۂ بے جاں نظر پڑے
دیکھا قریب جا کے تو زخموں سے چور ہیں

کچھ طفل خورد سال ہیں جو چپ ہیں خود مگر
بچپن یہ کہہ رہا ہے کہ ہم بے قصور ہیں

آئے تھے اس لئے کہ بنائیں خدا کا گھر
نیند آ گئی ہے منتظرِ نفخ صور ہیں

کچھ نوجواں ہیں بے خبر نشئہ شباب
ظاہر میں گرچہ صاحب عقل و شعور ہیں

اٹھتا ہؤا شباب یہ کہتا ہے بے دریغ
مجرم کوئی نہیں ہے مگر ہم ضرور ہیں

سینہ پہ ہم نے روک لئے برچھیوں کے وار
از بسکہ مست بادۂ ناز و غرور ہیں

ہم آپ اپنا کاٹ کے رکھ دیتے ہیں جو سر
لذّت شناس ذوق دل ناصبور ہیں

کچھ پیر کہنہ سال ہیں دلدادۂ فنا
جو خاک و خوں میں بھی ہمہ تن غرق نور ہیں

پوچھا جو میں نے کون ہو تم ؟ آئی یہ صدا
” ہم کشتگان معرکۂ کانپور ہیں “

اسی طرح ایک اور نظم میں حادثۂ کانپور کے سلسلے میں لکھتے ہیں -

پنھائی جا رھی ھیں عالمان دیں کو زنجیریں
یہ زیور سید سجاد عالی کی وراثت ھے

یہی دس بیس اگر ھیں کشتگان خنجر اندازی
تو مجھ کو سستئی بازوئے قاتل کی شکایت ھے

شہیدان وفا کے قطرۂ خوں کام آئیں گے
عروس مسجد زیبا کو افشاں کی ضرورت ھے

عجب کیا ھے جو نوخیزوں نے سب سے پہلے جانیں دیں
کہ یہ بچے ھیں ان کو جلد سو جانے کی عادت ھے

یہ ۱۹۱۲ء کا واقعہ ھے - کان پور کے محلہ مچھلی بازار کی مسجد کا ایک حصہ بحکم سرکار گرا دیا گیا تھا - جس پر شہر کے مسلمانوں نے سخت احتجاج کیا تھا اور ایک جلوس کی صورت میں مسجد کی گری ہوئی دیوار پر اینٹیں رکھنے لگے تھے - اس پر فوجی پولیس نے ان پر گولی چلا دی تھی اور بہت سے بے گناہ مسلمان شہید ھو گئے تھے - ان شہیدوں میں بچے اور بوڑھے بھی شامل تھے - کان پور کے اس حادثۂ خونیں نے سارے ملک میں آگ لگا دی اور مسلمان مر مٹنے پر تل گئے -

بے شک اس واقعہ کی نوعیت ھنگامی اور وقتی تھی لیکن شبلی نعمانی کی نظموں سے معلوم ھوتا ھے کہ انہوں نے اس سے ایک گہرا تاثر قبول کیا تھا اور ان کے لئے یہ " قومی نقصان " شخصی نقصان کی صورت اختیار کر گیا تھا - چنانچہ یہ نظمیں مسلمان قوم کے جذبات کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ شاعر کے دل صد پارہ کو بھی بے نقاب کرتی ھیں اور اسی لئے مرور ایام کے ساتھ ان کی قدر و قیمت میں کوئی خاص کمی دکھائی نہیں دیتی -

لیکن شبلی نعمانی کی سیاسی نظموں کا معتدبہ حصہ اُن طنزیہ نظموں پر مشتمل ھے جن کے ذریعہ انہوں نے اھل وطن کی بے اعتدالیوں یا سیاسی جماعتوں کی ناھمواریوں کو نشانۂ طنز بنایا ھے لیکن اس طور کہ طنز میں ناواجب نشتریت پیدا نہیں ھوئی بلکہ شروع سے آخر تک ایک

سنبھلی ہوئی کیفیت قائم رہی ہے ۔ طنز کے میدان میں شبلی کی یہ نظمیں آج کے لکھنے والوں کے لئے بھی ایک لمحۂ فکریہ مہیا کرتی ہیں کہ ان میں نہ صرف جذبے کو دلیل کے تابع کر دیا گیا ہے بلکہ یہاں وہ شگفتگی اور تیکھا پن بھی ہے جو شاعر کے ہونٹوں پر ایک تبسم کی مانند جگمگاتا ہے ۔ لیکن جو ناظر کے دل میں بجز گدگدی اور کوئی رد عمل پیدا نہیں کرتا ۔ یہ بڑی بات ہے ۔ اس لئے کہ عام طور سے طنز میں منتقمانہ روش کا نتیجہ حریف کی برافروختگی کی صورت میں ظاہر ہؤا کرتا ہے اور وہ اسی شدت سے جوابی حملہ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے جس شدت سے اُسے نشانۂ تمسخر بنایا گیا تھا ۔ اس سے طنز کا سارا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے ۔ شبلی کی طنز میں جو سنبھلی ہوئی کیفیت نظر آتی ہے وہ اس لئے بھی قابل تعریف ہے کہ ان کے اپنے دور کی مروجہ طنزیہ شاعری (بالخصوص سیاسی طنزیہ نظم) ایذا رسانی کے جذبے سے متاثر ہے اور بالعموم اس سے حریف کی پگڑی اچھالنے کے سوا اور کوئی کام نہیں لیا گیا ۔ شبلی کی مندرجہ ذیل نظم ان کے مخصوص طریق کار کی غماز ہے :

لیگ کی عظمت و جبروت سے انکار نہیں
ملک میں غلغلہ ہے شور ہے کہرام بھی ہے

مختصر اس کے فضائل کوئی پوچھے تو یہ ہیں
محسن قوم بھی ہے خادم حکام بھی ہے

اس کے آفس میں بھی ہر طرح کا ساماں ہے درست
ورق سادہ بھی ہے کلک خوش اندام بھی ہے

ہیں قرینے سے سجائی ہوئی میزیں ہر سو
جابجا دفتر پارینہ احکام بھی ہے

چند بی ۔ اے ہیں سند یافتہ علم و عمل
کچھ اسسٹنٹ ہیں کچھ حلقۂ خدام بھی ہے

هو جو تعطیل میں تفریح و سیاحت مقصود
سفر درجۂ اول کے لئے دام بھی ہے
ید تو سب کچھ ہے مگر ایک گذارش ہے حضور
گرچہ یہ سوء ادب بھی ہے اور ابرام بھی ہے
مجھ سے آہستہ مرے کان میں ارشاد ہو یہ
سال بھر حضرت والا کو کوئی کام بھی ہے ؟

یہ مسلم لیگ کے آغاز کا زمانہ تھا اور یہ جماعت جس نے آگے چل کر مسلمانوں کی آزادی کے لئے ایک طویل جنگ لڑنا تھی ، ابھی ایک نیم سرکاری انجمن کا درجہ رکھتی تھی - شبلی اور دوسرے اکابر حب الوطنی کے زیر اثر لیگ کے طریق کار کو اچھا نہیں سمجھتے تھے اور اس کے مقاصد کو شک کی نظروں سے دیکھتے تھے - چنانچہ اپنی بہت سی نظموں میں شبلی مرحوم نے لیگ پر بھرپور طنز کی ہے — تاہم کہیں بھی توازن اور سلیقے کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا -

ایک اور نظم لیجئے لیکن اس کا روئے سخن لیگ کی طرف نہیں بلکہ اس کے ذریعے شبلی نعمانی نے ساری کی ساری ہندوستانی قوم کو نشانۂ طنز بنایا ہے - شبلی کی اس قسم کی نظمیں ہنگامی واقعات سے ایک شدید تعلق کے باوجود ، ایسے حقائق کو طشت از بام کرتی ہیں جو محض ایک دور تک محدود نہیں ہیں اور اسی لئے ان نظموں کے زندہ رہنے کے امکانات نسبتاً زیادہ ہیں - مرحوم نے یہ نظم ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کے سلسلے میں لکھی تھی :

اک جرمنی نے مجھ سے کہا از رہ غرور
آساں نہیں ہے فتح تو دشوار بھی نہیں
برطانیہ کی فوج ہے دس لاکھ سے بھی کم
اور اس پہ لطف یہ ہے کہ تیار بھی نہیں
باقی رہا فرانس تو وہ رند لم یزل
آئیں شناس شیوۂ پیکار بھی نہیں

میں نے کہا غلط ہے تیرا دعویٔ غرور
دیوانہ تو نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں
ہم لوگ اہل ہند ہیں جرمن سے دس گنے
تجھ کو تمیز اندک و بسیار بھی نہیں
سنتا رہا وہ غور سے میرا کلام اور
پھر وہ کہا جو لائق اظہار بھی نہیں
اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

ہمدردانہ انداز نظر ، خلوص اور تڑپ سے قطع نظر ، شبلی کی سیاسی نظمیں ایک دلکش انداز بیان کے باعث بھی حد درجہ مقبول ہوئی ہیں ۔ الفاظ کے انتخاب کا انہیں ایسا اچھا سلیقہ ہے اور مافی‌الضمیر کے اظہار کے لئے انہیں اتنی کم تگ دو کرنا پڑی ہے کہ ان کی بیشتر نظمیں غنائیت سے لبریز دکھائی دیتی ہیں ۔ شعر کی کامیابی کی غالباً پہلی شرط بھی یہی ہے کہ اس میں ایسا داخلی یا خارجی آہنگ موجود ہو جو زندگی کے نغماتی مد و جزر کی غمازی کے ساتھ ساتھ فرد کی روح کو بھی اس لازوال نغمے کی لے میں بہا لے جائے ۔ شبلی کے ہاں یہ نغمہ اپنے بھرپور انداز میں موجود تھا اور اس کے عقب میں الفاظ کی وہ نوکیلی اور رواں دواں کیفیت بھی تھی جو عظیم شاعری کا مابہ الامتیاز ہوتی ہے ۔ مگر افسوس ہے کہ شبلی مرحوم نے اپنی قادرالکلامی کو محض ہنگامی موضوعات تک محدود رکھا اور اگرچہ اپنے مخصوص طرز بیان اور تڑپ کے باعث انہوں نے ہنگامی واقعات کی تاریکیوں میں بھی چکا چوند پیدا کی تاہم ان بندشوں اور حد بندیوں کے باعث وہ ایسی شاعری کی تخلیق کی طرف مائل نہ ہو سکے جو زمان و مکان کی حدود سے ماورا ہوتی ہے اور جسے امتداد زمانہ کے ہاتھوں قعر گمنامی میں کھو جانے کا قطعاً کوئی خدشہ نہیں ہوتا ۔

مولانا شبلی کیا تھے

سید صباح الدین عبدالرحمن

مکرمی تسلیم

آپ کے خطوط ملے ، آپ مولانا شبلی رح کی یاد گار منانے کے سلسلہ میں ہم لوگوں سے مولانا مرحوم پر مضامین طلب فرماتے ہیں گویا آپ آفتاب کی شعاعوں سے آفتاب کی مدح سرائی چاہتے ہیں عطر کی عطر بیزی سے عطر کی تعریف کہلانا چاہتے ہیں بلبل کے نالہ سے بلبل کی داستان سننا چاہتے ہیں ، یہ کتنا صبر آزما کام ہے ؟ اگر ہم لوگ یہ خدمت دوسروں سے لیں تو بجا ہوگا تاکہ ہم کو اندازہ ہو کہ ہم جس چاند کی چاندنی ہیں وہ دوسروں کی نگاہ میں کیا حیثیت رکھتا ہے ۔

دارالمصنفین کی گذشتہ ۴۴ سالہ زندگی مرحوم ہی کی تصویر ہے اس کے علمی کارنامے ان ہی کی تصانیف کی تفسیر ہیں ، اب اس تصویر کی تصویر اور تفسیر کی تفسیر چاہتے ہیں ۔ کیا یہ مشکل کام نہیں ؟ ہم تو زیادہ خوشی اس میں محسوس کرتے کہ خود ہم دوسروں کی زبانی اس تصویر کی کہانی اور اس تفسیر کی تفسیر پڑھتے ۔

اس کے علاوہ اجازت دیجئے تو لکھوں کہ ہماری علمی روایات ایسی رہی ہیں کہ ہم اخباروں اور رسالوں میں چھپنے سے بہت گریز کرتے ہیں اسی لئے آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہم کہیں اور دوسری جگہ بہت کم چھپتے ہیں اور اگر ہم صرف چھپنے میں لگ جائیں تو شبلی و سلیمان کے مشن کی تکمیل نہ کر سکیں گے ۔ ہم کو دھن ہے تو صرف یہ ہے کہ ان دونوں بزرگوں نے جس کام کا سلسلہ جاری کیا تھا اس کو کسی طرح مکمل کر دیں ۔ اس ادارہ کے علمی خدمت گزاروں نے اپنی تمام عمریں یہاں گذار دی ہیں ، لیکن ان کے نام ایک محدود حلقہ سے زیادہ پھیلے ہوئے نہیں ، اور کوئی ان کا ذکر نہیں کرتا تو ان کو شکایت بھی نہیں ہوتی کیونکہ نشر و اشاعت ان کا مسلک بھی نہیں وہ تو ”گوشہ

میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے " کے قائل ہیں، اور وہ اپنے گوشہ عافیت میں تمام ہنگاموں سے دور اور نمود و نمائش سے بے نیاز ہو کر شبلی و سلیمان کے بنائے ہوئے نصب العین کی صرف تکمیل ہی کی فکر میں سرگرداں رہنا چاہتے ہیں۔

نہ ستائیش کی تمنا نہ صلہ کی پروا

ہی سے کوئی انجام پا سکتا ہے۔

مگر آپ کے متواتر خطوط پر قلم ہاتھ میں لے کر بیٹھا تو سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مولانا شبلی کے جلوۂ صد رنگ میں سے کس جلوہ کو پیش کروں۔ یکا یک قلم نے خود ہی لکھ دیا کہ:

مولانا شبلی کیا تھے؟

اور اس کے بعد کی سطریں نذر خدمت ہیں!

اگر کسی زبان سے یہ کہتے سنتا ہوں کہ مولانا شبلی بہت بڑے ادیب تھے، تو میرا جی چاہتا ہے کہ میں کہوں کہ نہیں وہ بہت بڑے مؤرخ تھے اور اگر کوئی ان کو مؤرخ کہتا ہے تو پھر میرا بے ساختہ جی چاہتا ہے کہ اس کو بتاؤں کہ نہیں وہ بہت بڑے متکلم تھے اور اگر کوئی ان کو متکلم کہتا ہے تو پھر میری خواہش ہوتی ہے کہ اس سے کہوں کہ نہیں وہ بہت بڑے شاعر تھے، اور اگر کوئی شاعر کہتا ہے تو پھر جی چاہتا ہے کہ اس کو قائل کروں کہ وہ بہت بڑے سیرت نگار تھے۔ اور پھر یہ بھی کہ وہ بہت بڑے ادیب تھے، بہت بڑے شاعر، بہت بڑے نقاد، بہت بڑے مؤرخ، بہت بڑے متکلم، بہت بڑے سیرت نگار، بہت بڑے فلسفی، اور بہت بڑے عالم:

انچه خوبان همه دانند تو تنها داری

اور ان کی عظمت کا صحیح اندازہ وہ نہیں کر سکتا ہے۔ جو صرف ادیب ہے، یا صرف نقاد ہے، یا صرف شاعر ہے، یا صرف مؤرخ ہے، یا صرف متکلم ہے، یا صرف سیرت نگار ہے، یا صرف عالم ہے، ان کے

علمی اور ادبی محاسن کا معترف صحیح معنوں میں وہی ہو سکتا ہے جو ان ہی کی طرح جامعیت رکھتا ہو۔ لیکن اس جامعیت کا کوئی اہل قلم ابھی تک پیدا نہیں ہوا۔ اسی لئے یا تو کسی ادیب نے صرف ان کے ادب و انشا کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے یا کسی نقاد نے ان کے فن تنقید نگاری کا جائزہ لیا ہے۔ یا کسی محقق نے ان کے طرز تحقیق پر نظر ڈالی ہے۔ لیکن کوئی بھی ان کی جامعیت کا صحیح معنوں میں احاطہ نہیں کر سکا ہے۔ ان کے شاگرد رشید مولانا سید سلیمان ندوی رح میں بڑی حد تک وہی جامعیت تھی۔ حیات شبلی لکھ کر وہ ان کی تصانیف پر ایک دوسری جلد لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ لیکن افسوس کہ اس کی تکمیل نہ ہو سکی۔

اور یہ عجیب بات ہے کہ مولانا شبلی کی جو کتابیں سب سے زیادہ مقبول ہیں ان ہی پر سب سے زیادہ تنقید و تنقیص کی چنگاریاں برسائی گئی ہیں۔ موازنہ انیس و دبیر کی رد میں المیزان لکھی گئی شعرالعجم کے مقابلہ میں تنقیدات شعرالعجم کے نام سے اہل علم کے سامنے ہے۔ الفاروق کے خلاف الفرق قلم بند ہوئی۔ لیکن ارباب نظر یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ مولانا کی اور تمام تصانیف کے ساتھ یہ بھی اردو زبان کے چمن ستان کے سدا بہار پھول ہیں، جو مسموم ہوا کے باوجود پژ مردہ نہ ہو سکے ہیں۔

شبلی کا بڑے سے بڑا پرستار یہ دعویٰ نہیں کر سکتا ہے کہ آئندہ ان سے بڑھ کر کوئی ادیب نہیں ہوگا، ان سے بہتر کوئی مورخ نہیں ہوگا، ان سے زیادہ دل آویز طریقہ پر کوئی سوانح نگاری نہ کر سکے گا، یا ان سے زیادہ موثر طریقہ ہر علم کلام اور فلسفہ کو پیش نہ کرسکے گا، آگے چل کر ان سے بڑھ کر ادیب بھی ہوں گے، مورخ بھی، سوانح نگار بھی، اور متکلم بھی، لیکن ہر زمانہ میں شبلی شبلی ہی رہیں گے۔

مولانا شبلی نے جب قلم سنبھالا تو مسلمانوں کی ایک عظیم الشان سلطنت ختم ہو چکی تھی، ان کی شاندار تہذیب ماند پڑ رہی تھی، اور

ایک ایسی سلطنت قائم ہو رہی تھی جس کے حکمرانوں کے تمدن کی ظاہری چمک دمک آنکھوں کو چکا چوند کر رہی تھی ، مولانا شبلی کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ ہندوستان میں اسلام کے آئینہ سے اس گرد و غبار کو صاف کیا جو انگریزوں کی حکومت کے زمانے میں ان کی لائی ہوئی آندھی نے اس پر ڈالنے کی کوشش کی تھی ، مولانا مسلمانوں کے عہد زریں کے ان تمام پرانے مرقع کو منظر عام پر لائے جو نگاہوں سے اوجھل ہو رہے تھے -

۱۸۵۷ء کے بعد بدلے ہوئے حالات میں نئی زمین اور نیا آسمان بن رہا تھا ، مسلمانوں کو اس وقت ضرورت تھی کہ کوئی ان کی مذہبی غیرت کو بر قرار رکھے ، ان کو قومی جوش دلاتا رہے ، ان کو ان کی شاندار روایت سے آشنا رکھے، اور ان کو ان کی عظمت بھی محسوس کراتا رہے ، اور پھر ان کے مذہب ، تہذیب اور ثقافت پر حملہ کرنے والوں کے خلاف نبرد آزما بھی ہو ، کار کنان قضا و قدر نے شبلی کو اسی کام کے لئے پیدا کیا ، ان کی عالمانہ صلاحیت ، متکلمانہ طرز استدلال ، محققانہ بصیرت ، مورخانہ تلاش و تحقیق ، فلسفیانہ ژرف نگاہی ، نا قدانہ گہرائی انشاپردازانہ لالہ کاری اور شاعرانہ رنگین بیانی میں جو اسپرٹ کار فرما ہے وہ یہی کہ وہ مسلمانوں کو ان کی برتری کا احساس دلائیں -

ان پر الزام ہے کہ وہ صرف مداحی کرتے ہیں ، یعنی وہ مسلمانوں کی تاریخ کے صرف پر عظمت اور پر شکوہ واقعات ہی لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں ، اس الزام کو سامنے رکھتے ہوئے کوئی بھی ان کی تصانیف اور مقالات پڑھتا ہے تو وہ غیر ارادی طور پر محسوس کرتا ہے کہ ان میں باد سحر کے جھونکے بھی ہیں ، خوشبو کی لپٹ بھی ، سبزہ کی لہک بھی ، بلبلوں کی چہک بھی ، طاؤس کی جھنکار بھی اور آبشاروں کا شور بھی ، اور وہ جہاں ان کی انشاپردازی کی رنگینیوں اور رعنائیوں سے محظوظ ہوتا ہے ، وہاں وہ ان کے تحقیقی انکشافات اور تاریخی رازوں کی پردہ کشائی سے بھی مرعوب ہوتا ہے -

مولانا شبلی نے اپنی ایک نظم میں اپنی قوم کو مخاطب کر کے کہا تھا :

یوں بھلانے کو تو ہم دل سے بھلاتے ہیں مگر
یاد آ جاتے ہیں پھر بھی ترے اگلے جوہر

وہ بھی اک دن تھا کہ جس سمت سے ہوتا تھا گزر
ساتھ چلتے تھے جلو میں ترے اقبال و ظفر

تو کبھی روم میں قیصر کو مٹا کر آئی
کبھی یورپ میں نئے فتنے اٹھا کر آئی

تھے نقیبوں میں ترے دولت و اقبال و حشم
ترے حملوں سے دھل جاتا تھا سارا عالم

ایسیا کا جو کیا تو نے مرقع برھم
جا کے یورپ کے افق پر بھی اڑایا پرچم

کر دیا دفتر تاتار کو ابتر تو نے
نیزہ گاڑا تھا جگر گاہ تتر پر تو نے

کون تھا جس نے فارس ویونان تاراج
کس کی آمد میں فدا کر دیا جے پال نے راج

کس کو کسریٰ نے دیا تخت و زر و افسر و تاج
کس کے دربار میں تا تار سے آتا تھا خراج

تجھ پہ اے قوم اثر کرتا ھے افسوں جن کا
یہ وھی تھے کہ رگوں میں ھے ترے خوں جن کا

ھم نے مانا بھی کہ دل سے یہ بھلا دیں قصے
یہ سمجھ لیں کہ ھم ایسے ھی تھے اب ھیں جیسے

یہ بھی منظور ھے ھم کو کہ ھمارے بچے
دیکھنے پائیں نہ تاریخ عرب کے صفحے

کبھی بھولے بھی سلف کو نہ کریں یاد اگر
یاد گاروں کو زمانہ سے مٹا دیں کیوں کر

مرو و شیراز و صفاهان کے وہ زیبا منظر
بیت حمرا کے وہ ایوان وہ دیوار وہ در

مصر و غرناطہ و بغداد کا ایک ایک پتھر
اور وہ دھلی مرحوم کے بوسیدہ کھنڈر

ان کے ذروں میں چمکتے ہیں وہ جوہر اب تک
داستانیں انہیں سب یاد ہیں از بر اب تک

ان سے سن لے کوئی افسانۂ یاران وطن
یہ دکھا دیتی ہیں آنکھوں کو وہی خواب کہن

تیرے ہی نام کا اے قوم یہ گاتے ہیں بھجن
تیرے ہی نغمۂ پر درد کے ہیں یہ ارگن

پوچھتا ہے جو کوئی ان سے نشانی میری
یہ سنا دیتے ہیں سب رام کہانی میری

مولانا کی ساری تصانیف ان ہی اشعار کی تفسیر ہے انہوں نے اسلام کے ''عروج شاہی'' ''شان کجکلاہی'' اور مسلمانوں کے ''مفاخر قومی'' کی حدی خوانی کرکے ان کے تھکے ہوئے کاروان کو آگے بڑھنے کی ہمت دلائی بلکہ اسلامی روایات کی رجز خوانی کرکے مسلمانوں کو للکارا اور یہ کہنا بھی صحیح ہوگا انہوں نے ایک ھلہ بول کر اور ایک طوفانی حملہ کرکے مخالفوں کو پسپا کیا اور ان کی تصانیف پر چاہے کتنی تنقیدیں کی جائیں لیکن مسلمانوں کو آج بھی ان کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ کوئی ان کی گزشتہ عظمت و شان کا تاج پھر سے پہنا رہا ہے اور گل و گلزار میں بسی ہوئی تحریروں کے ذریعہ ان کو ان کے ماضی کی بہاریں دکھا کر ان کے حال کے خزاں کو بدل کر ان کے مستقبل کو پھر سے چمن زار بنانا چاہتا ہے اور اسی میں مولانا شبلی کی عظمت کا راز ہے :

مولانا شبلی کا یہ پیام اب بھی مسلمانوں کے لئے ہے :

اے مدعیان حب اسلام !
حجروں میں تو اب کرو نہ آرام !

دعوے ہیں تو کچھ ہنر دکھاؤ
ہمت کے قدم ذرا بڑھاؤ

دیکھو ! وہ جستجو یہی ہے !
میدان یہی ہے ! گو یہی ہے

کر دو جو گذشتہ کی تلافی !
ثابت ہو زمانے پر کہ اب بھی !

گو دور فلک ہوا دگر گون
پھر بھی تو رگوں میں ہے وہی خون !

اسلاف کے وہ اثر ہیں اب بھی
اس راکھ میں کچھ شرر ہیں اب بھی

اس جام میں ہے شراب باقی
اب تک ہے گہر میں آب باقی

والسلام!.................. مولانا کے آستانہ کا خادم

سوانح مولانا روم

مولانا شبلی کے آئینہ تحقیق و تنقید میں

پروفیسر محمد ظفر خان ، ایم - ایم - او - ایل

ہر زندہ و بیدار قوم اپنے اسلاف کے کارناموں پر نظر ڈال کر اپنے افعال و اعمال کا محاسبہ کرتی ہے اور نئی امنگوں اور نئے جوش کے ساتھ نئی راہوں پر گامزن ہو کر ارتقائی منازل طے کرنے میں سعی و کوشش اور جد و جہد سے کام لیتی ہے - آزاد قوم کے افراد ان محبان قوم کو کبھی بھی فراموش نہیں کرتے جنہوں نے کسی نہ کسی طرح ان کی تیرہ و تار راتوں کو اپنے خلوص کی قندیل سے روشن کیا ہو - مسلمانان ہند و پاک جس دور ابتلا سے گذرے ہیں اس کی نظیر تاریخ کے کسی دور میں ملنی مشکل ہے - یہ اسی دور میں ابتلا کا ثمرہ ہے کہ ہم اپنے بزرگوں کی ادبی ، علمی اور روحانی کاوشوں سے یکسر نا بلد ہیں - ان خیر خواہاں قوم میں سے شبلی نعمانی مرحوم بھی ہیں جنہوں نے ہمیں اپنے اسلاف اور ان کارناموں سے روشناس کرایا ہے - مولانا شبلی نے جو کچھ لکھا ہے اس میں ان کے خلوص کو بڑا دخل ہے - انہوں نے مسلمانوں کے ملی شعور کو تازہ و توانا کرنے کےلئے اپنی زندگی صرف کی اور نوجوانان قوم کو تعلیمات اسلام کے ہر پہلو سے واقف و آگاہ کرنے کی کوشش کی اور ان کے عزم خفتہ کو بیدار و متحرک کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کیا -

مولانا شبلی نعمانی مرحوم جامع الکمالات تھے ، عربی - فارسی اور اردو میں انہیں یدطولیٰ حاصل تھا - وہ بیک وقت محقق ، مورخ ، نقاد ، ادیب اور شاعر سبھی کچھ تھے - ان کی تصنیفات و تالیفات سے ہر طبقہ اور ہر مزاج کے انسان کچھ نہ کچھ پالینے میں ضرور کامیاب ہو جاتے ہیں - کیونکہ ان کا طائر تخیل کبھی فلسفہ و تاریخ کے ریگ زاروں پر پرواز

کرتا ہے تو کبھی تحقیق و تنقید کے کوھساروں پر اپنا سایہ ڈالتا ہے اور کبھی چمنستان شعر و ادب اس کی نغمہ ریزی سے فردوس گوش ہوتا ہے۔ مولانا کی قابلیت و علمیت، ان کی ذھانت و فطانت اور ان کی وسعت مطالعہ کا عکس جمیل ان کی وہ متعدد تصنیفات و تالیفات ھیں جن میں سے بعض کو اولیت کا فخر حاصل ہے اور ''شہرت عام و بقائے دوام کے دربار'' میں بلند مقام رکھتی ھیں۔ مولانا کی شعر العجم تحقیقی و تنقیدی اعتبار سے اردو و فارسی میں اپنی مثال آپ ہے اور اس کی افادی اقدار کو تنقیدات شعرالعجم بھی کم کرنے سے قاصر رھی ہے۔ اور ایران نے فارسی زبان میں اس کا ترجمہ کرکے اس نقاد مشرق کو خراج عقیدت و اردات پیش کیا ہے۔ مولانا کی دیگر تصانیف بھی تاحد بشری جامع و مکمل ھیں۔ جن پر بجا طور پر فخر کیا جا سکتا ہے اور ان میں سے ایک سوانح مولانا روم ہے جو تنقیدی اور تحقیقی لحاظ سے ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔

فارسی ادب میں مولانا روم اور ان کی مثنوی کو جو مقبولیت حاصل ہے اس کا عشر عشیر بھی بہت کم شعرا اور ان کے کلام کے حصے میں آیا ہے اور اگر بنظر انصاف دیکھا جائے تو فی الحقیقت مولانا روم کو بھی جو قدر و منزلت اور شہرت حاصل ہے وہ صرف اس مثنوی کا کرشمہ ہے۔ ماضی بعید میں جب کہ فارسی زبان و ادب عام عروج پر تھے اس مثنوی کے سینکڑوں اشعار زبان زد خاص و عام تھے اور لوگ اس سرچشمہ ھدایت سے مستفید ہوتے اور غذائے روحانی حاصل کرتے تھے۔ عوام الناس تو اسے ''ھست قران در زبان پہلوی'' کہتے تھے کیونکہ اس میں عقاید اسلام کو دل نشیں پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ مثنوی کو مخصوص احترام کے ساتھ پڑھتے سنتے اور سر دھنتے تھے۔ میاں بشیر احمد صاحب سابق سفیر متعینہ ترکی اپنے ایک مقالہ میں جو انہوں نے ۱۷ دسمبر ۱۹۵۰ء کو مولانا جلال الدین رومی کی ۶۷۷ ویں [۱] برسی کے موقع پر انقرہ یونیورسٹی میں پڑھا تھا لکھتے ھیں:

---

۱ - یوم رومی - ص ۴ -

پروفیسر اوزلوک نے مجھے بتایا کہ ترکیہ میں جب لوگ مثنوی پڑھتے ھیں تو شروع کرتے وقت پہلے ھمیشہ یہ شعر پڑھتے ھیں :

این چنیں فرمود مولانائی ما
کاشف اسرار وحئی کبریا

دور مغلیہ کے زوال کے بعد جب اغیار بر سر اقتدار آئے تو فارسی شعر و ادب کی قدر و منزلت دن بدن کم ھوتی گئی اور روز بروز مثنوی پڑھنے پڑھانے اور سننے سنانے کا سلسلہ بھی بتدریج منقطع ھوتا گیا اور فی زمانہ تو گنتی کے چند باذوق لوگ ھوں گے جنھوں نے مثنوی کو تمام و کمال پڑھا ھوگا اور مولانا کے فلسفیانہ افکار کو سمجھا اور ان کے مطالب پر غور کیا ھوگا ۔

سوانح مولانا روم مولانا شبلی مرحوم کے سلسلہ کلامیہ کی چوتھی کڑی ھے جس میں فاضل مصنف نے مولانا روم کی زندگی کے حالات باختصار مگر مثنوی پر مفصل تنقید و تبصرہ سپرد قلم کیا ھے ۔ مولانا شبلی نے ۱۹۰۳ء میں مثنوی پر تقریظ لکھنی شروع کی چنانچہ ایک خط میں (جو انھوں نے ۱۸ فروری ۱۹۰۳ء کو مولوی حمید الدین صاحب کے نام لکھا ھے) فرماتے ھیں :

۱ ” تم نے ایک زمانے میں مجھ سے کہا تھا کہ تم نے مثنوی مولانا روم غور سے پڑھی اور ان کے اصول اور پرنسپلز متعین کئے اگر خیال میں ھوں تو لکھ بھیجو ۔“ ۱

اس طرح نواب سید علی حسن خاں کو ایک خط میں لکھتے ھیں :

۲ ”میں آج کل مثنوی مولانا روم پر ایک بڑا مفصل ریویو لکھ رھا ھوں ۔ مع سوانح عمری مولانا روم ۔“ ۲

سوانح مولانا روم اسی سال یعنی ۱۹۰۳ء میں ختم ھو کر منشی

---

۱ ۔ مکاتیب شبلی جلد دوم ص ۱۸ و حیات شبلی ص ۳۷۷ ۔

۲ ۔ ایضاً ص ۲۰۰ ۔

رحمت اللہ رعد کے مطبع میں چھپنے کو بھیجی گئی - مہدی حسن کو ایک خط محررہ ۲۲ نومبر ۱۹۰۵ء میں لکھتے ہیں :

"تقریظ مثنوی کم بخت رعد کے قبضۂ غضب میں ہے - دو برس ہو چکے ہیں -"۱

یہ کتاب پہلی بار اگست ۱۹۰۰ء میں چھپ کر مارکیٹ میں آئی - اور چار قسم کے کاغذوں پر چھپی تھی - اس کی کم سے کم قیمت دس آنے تھی - سید سلیمان ندوی مولانا شبلی کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ "مولانا کو تصوف سے کبھی لگاؤ نہ تھا - اس لئے بظاہر تعجب ہوتا ہے کہ وہ مولانا روم کے گرویدہ کس طرح ہوئے -" اور آگے جا کر خود ہی جواب دیتے ہیں :

"میرے خیال میں ان کے اس موضوع کے انتخاب میں حیدر آباد کے مقامی ذوق کو بھی تعلق ہے - حیدآباد کے رگ و پے میں تصوف اور وحدت الوجود کے مسائل سرائیت کئے ہوئے ہیں -"۲

مولانا شبلی مرحوم سوانح مولانا روم لکھنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

"مولانا روم کو دنیا جس حیثیت سے جانتی ہے وہ فقہ و تصوف ہے- اور اس لحاظ سے متکلمین کے سلسلہ میں داخل کرنا اور اس حیثیت سے ان کی سوانح عمری لکھنا لوگوں کو موجب تعجب ہوگا - لیکن ہمارے نزدیک اصل علم کلام یہی ہے کہ اسلام کے عقائد کی اس طرح تشریح کی جائے اور اس کے حقائق و معارف اس طرح بتائے جائیں کہ خود بخود دل نشین ہوجائیں- مرلانا نے جس خوبی سے اس فرض کو ادا کیا ہے مشکل سے اس کی نظیر مل سکتی ہے اس لئے ان کو زمرہ متکلمین سے

---

۱ - مکاتیب شبلی ص ۲۰۲ -

۲ - حیات شبلی ص ۳۷۷ -

خارج کرنا سخت نا انصافی ہے ۔"[1]

سوانح مولانا روم لکھنے کی وجوہات چاہے کچھ ہوں ہم تو مولانا حبیب الرحمان شروانی کے اس قول پر صاد کریں گے کہ ۔

"تصوف کی کتاب کی حیثیت سے یہ دقیقہ سنجی علامہ شبلی کی نظر کے واسطے ودیعت تھی کہ مثنوی معنوی علم کلام کا بھی بہترین مجموعہ ہے ۔"[2]

مولانا شبلی مرحوم نے سوانح مولانا روم لکھنے میں اگرچہ متعدد کتب سے استفادہ کیا ہے مگر سپہ سالار کی سوانح عمری مولانا روم اور مناقب العارفین کو زیادہ تر اپنا ماخذ قرار دیتے ہیں ۔ تاہم جن کتابوں سے انہوں نے فائدہ اٹھایا ہے ان کا مفصل حوالہ اپنی کتاب کے حاشیہ میں نہیں دیا اور نہ ہی کتابیات کے زیر عنوان ان کتابوں کی مکمل فہرست معہ سن طباعت یا سال تصنیف دی ہے گو اس سے ان کے تحقیقی پہلو پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا لیکن ایک ناقد صحت واقعات کی تحقیق کے وقت کافی دقت محسوس کرتا ہے ۔ بہر صورت مولانا نے سوانح مولانا روم لکھنے میں جس محنت اور دیدہ ریزی سے کام کیا ہے وہ قابل ستائش ہے آئیے ہم بھی مولانا شبلی کے آئینہ تحقیق و تنقید میں مولانا روم کے حالات زندگی اور مثنوی معنوی کے فلسفیانہ مضامین کا عکس دیکھیں ۔

مولانا روم کا نام محمد اور جلال الدین لقب تھا ۔ حضرت ابوبکر صدیق کی اولاد میں سے تھے ۔ جواہر مضیہ میں سلسلہ نسب اس طرح بیان کیا گیا ہے ۔ محمد بن محمد بن محمد بن حسین بن احمد بن قاسم بن سیب بن عبد اللہ بن ابی بکر الصدیق رح ۔ اس روایت کی رو سے حسین بلخی مولانا کے پردادا ہوتے ہیں ۔ لیکن سید سالار نے ان کو دادا لکھا ہے اور یہی صحیح ہے ۔ حسین بہت بڑے صوفی اور صاحب حال تھے ۔ سلاطین وقت اس قدر ان کی عزت کرتے تھے کہ محمد خوارزم شاہ (متوفی ۶۱۷ ھ)

---

۱ ۔ سوانح مولانا روم ص ۷ ۔

۲ ۔ حیات شبلی ص ۳۷۶ ۔

نے اپنی بیٹی کی ان سے شادی کر دی تھی - بہاء الدین اس کے بطن سے پیدا ہوئے - مولانا کے والد کا لقب بہاء الدین تھا اور بلخ وطن تھا - علم و فضل میں یکتائے روزگار گنے جاتے تھے - محمد خوارزم شاہ ان کے حلقہ بگوشوں میں تھا - ایک دن خوارزم شاہ مولانا بہاء الدین کے پاس گیا تو ہزاروں لاکھوں آدمیوں کا مجمع تھا - خوارزم شاہ نے امام فخرالدین رازی سے کہا کہ کس غضب کا مجمع ہے - امام رازی نے فرمایا کہ ہاں اور اگر تدارک نہ کیا گیا تو پھر مشکل پڑے گی خوارزم شاہ نے امام صاحب کے اشارے پر خزانہ شاہی اور قلعہ کی کنجیاں بہاء الدین کے پاس بھیج دیں - اور کہلا بھیجا کہ اسباب سلطنت سے صرف یہ کنجیاں میرے پاس رہ گئی ہیں وہ بھی حاضر ہیں - مولانا بہاء الدین نے فرمایا کہ اچھا جمعہ کو وعظ کہ کر یہاں سے چلا جاؤں گا - چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا - اور ۶۱۰ھ میں نیشا پور پہنچے - خواجہ فرید الدین عطار ان کو ملنے آئے - وہاں سے بغداد کا رخ کیا - یہاں مدتوں قیام رہا - وہاں سے حجاز اور حجاز سے شام ہوتے ہوئے زنجان آئے - زنجان سے آق شہر کا رخ کیا - ایک سال یہاں رہے اور پھر یہاں سے لارندہ میں سات برس تک مقیم رہے - اس وقت مولانا روم کی عمر اٹھارہ برس کی تھی - شیخ بہاء الدین نے اس سن میں ان کی شادی کر دی - لارندہ سے شیخ بہاء الدین علاؤ الدین کیقباد (متوفی ۶۳۴ھ کی درخواست پر قونیہ کو روانہ ہوئے - شیخ بہاء الدین نے ۱۸ ربیع الثانی ۶۲۸ھ (۱۲۳۱ء) میں وفات پائی -

مولانا روم ۶۰۴ھ میں بمقام بلخ پیدا ہوئے - ابتدائی تعلیم اپنے والد شیخ بہاء الدین سے حاصل کی - شیخ کے مریدوں میں سید برہان الدین محقق بڑے پایہ کے فاضل تھے - چنانچہ شیخ نے مولانا کو ان کی آغوش تربیت میں دیا - ۱۸ یا ۱۹ برس کی عمر میں اپنے والد کے ساتھ قونیہ آئے اور والد کے انتقال کے دوسرے سال یعنی ۶۲۹ھ میں جب ان کی عمر ۲۵

میاں بشیر احمد صاحب کی تحقیق کے مطابق مولانا روم ۱۶ ربیع الاول ۶۰۴ھ مطابق ۳۰ ستمبر ۱۲۰۷ء میں پیدا ہوئے - (یوم رومی)

برس کی تھی تکمیل فن کے لئے شام کا قصد کیا - مولانا نے اول حلب کا تصد کیا اور مدرسہ حلادیہ کی دارالاقامہ میں قیام کیا - مدرسہ حلادیہ کے سوا حلب کے اور مدرسوں میں بھی علم کی تحصیل کی - طالب علمی کے زمانہ میں عربیت ، فقہ ، حدیث ، تفسیر اور معقول میں کمال حاصل کیا - لیکن اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے جو کچھ پڑھا اور جن چیزوں میں کمال حاصل کیا تھا وہ اشاعرہ کے علوم تھے - کیونکہ معتزلہ سے ان کو وہی نفرت ہے جو اشاعرہ کو ہے - ایک جگہ فرماتے ہیں :

هست این تاویل اهل اعتزال
وای آنکس کو نـدارد نور حال

مولانا نے علم باطنی اپنے استاد سید برہان الدین سے حاصل کیا - سید صاحب نو برس تک مولانا کو طریقت اور سلوک کی تعلیم دیتے رہے - ، مولانا نے اپنی مثنوی میں سید موصوف کا اس طرح نام لیا ہے جس طرح ایک مخلص مرید پیر کا نام لیتا ہے - بہر حال مولانا پر اب تک ظاہری علوم کا رنگ غالب تھا - علوم دینیہ کا درس دیتے تھے ، وعظ کہتے تھے ، مثنوی لکھتے تھے سماع وغیرہ سے سخت احتراز کرتے تھے - لیکن شمس تبریز کی ملاقات کے بعد زندگی ایک نئے دور میں داخل ہوئی -

شمش تبریز سے مولانا کی ملاقات ان کی زندگی کا اہم واقعہ ہے - لیکن تذکروں اور تاریخوں میں متناقص طریقوں سے منقول ہے - شبلی مرحوم نے اگرچہ ان مقبول عام قصوں کو بھی سپرد قلم کیا ہے - لیکن وہ صرف سپہ سالار جو مولانا کے شاگرد خاص تھے - اور جنہوں نے چالیس سال فیض صحبت اٹھایا ، کے بیان کردہ واقعہ کو ایک حد تک درست سمجھتے ہوئے لکھتے ہیں :

شمس تبریز بابا کمال الدین جنیدی کے مرید تھے - سوداگروں کی وضع میں شہروں کی سیاحت کرتے رہتے - ذریعۂ معاش یہ تھا کہ ازار بند بن لیتے ارر اس کو بیچ کو کفاف مہیا کرتے - ایک دفعہ

مناجات کے وقت دعا مانگی کہ الہی کوئی ایسا بندہ خاص ملتا جو میری صحبت کا متحمل ہو سکتا ۔ عالم غیب سے اشارہ ہوا کہ روم جاؤ ۔ اسی وقت چل کھڑے ہوئے قونیہ پہنچے تو رات کا وقت تھا ، برنج فروشوں کی سرائے میں اترے ۔ سرائے کے دروازے پر ایک بلند چبوترہ تھا ۔ شمس اس چبوترے پر بیٹھا کرتے تھے ۔ مولانا کو ان کی آمد کا حال معلوم ہؤا تو ان کی ملاقات کو چلے راہ میں لوگ قدم بوس ہوتے جاتے تھے ۔ اس شان سے سرائے پر پہنچے شمس نے سمجھا کہ یہی وہ شخص ہے جس کی نسبت بشارت ہوئی ہے ۔ دونوں بزرگوں کی آنکھیں چار ہوئیں اور دیر تک زبان حال میں باتیں ہوتی رہیں ۔ مناقب العارفین کی رو سے یہ ۶۴۲ھ (۱۲۴۴ء) کا واقعہ ہے ۔ اس بنا پر مولانا کی مسند نشینیٔ فقر کی تاریخ اس سال سے شروع ہوتی ہے ۔

سپہ سالار کا بیان ہے کہ چھ مہینے تک دونوں بزرگ اصلاح الدین زرکوب کے حجرہ میں چلہ کش رہے ۔ اس مدت میں آب و غذا قطعاً متروک تھی ۔ اس زمانے سے مولانا کی حالت میں ایک نمایاں تغیر جو پیدا ہؤا وہ یہ تھا کہ اب تک سماع سے محترز تھے ۔ اب اس کے بغیر چین نہیں آتا تھا ۔ چونکہ مولانا نے درس و تدریس اور وعظ و پند کے اشتغال دفعتاً چھوڑ دئے اور حضرت شمس کی خدمت سے دم بھر کو جدا نہیں ہوتے تھے ۔ تمام شہر میں ایک شورش مچ گئی ۔ لوگوں کو سخت رنج تھا کہ دیوانۂ بے سروپا نے مولانا پر ایسا سحر کر دیا ہے کہ وہ کسی کام کے نہیں رہے ۔ یہ برھمی یہاں تک پھیلی کہ خود مریدان خاص اس کی شکایت کرنے لگے ۔ شمس کو ڈر ہؤا کہ یہ شورش فتنہ انگیزی کی حد تک نہ پہنچ جائے ۔ چپکے سے گھر سے نکل دمشق کو چل دئے ۔ مولانا کو اس کا سخت صدمہ ہؤا ۔ اور انہوں نے سب سے قطع تعلق کر لیا اور اس زمانے میں نہایت رقت امیز اور پر اثر اشعار کہے ۔ مدت کے بعد شمس نے مولانا کو دمشق سے خط لکھا جس نے آتش شوق کو بھڑکا دیا ۔ جن لوگوں نے شمس کو آزردہ کیا تھا انہیں سخت ندامت ہوئی ۔ سب نے مولانا سے معافی کی درخواست کی اور شمس کو منا لانے

کا فیصلہ کیا ۔ سلطان ولد جو مولانا کے صاحب زادے تھے ۔ اس قافلہ کے سالار تھے ۔ قافلہ دمشق پہنچا ، بڑی مشکل سے شمس کا پتہ چلا ، حاضر خدمت ہوئے اور پیش کش جو ساتھ لائے تھے نذر کرکے مولانا کا خط دیا ۔ شمس مسکرائے اور فرمایا کہ ان خزف ریزوں کی ضرورت نہیں۔ چند روز انہیں مہمان رکھا ۔ پھر دمشق سے قونیہ روانہ ہوئے ۔ سلطان ولد شمس کی رکاب کے ساتھ پا پیادہ آئے ۔ مولانا نے استقبال کیا ۔ اور بڑے ذوق و شوق کی صحبتیں رہیں ۔

چند روز کے بعد حضرت شمس نے مولانا کی ایک پروردہ کیمیا نامی کے ساتھ شادی کر لی ۔ مولانا نے مکان کے سامنے ایک خیمہ نصب کرا دیا کہ حضرت شمس اس میں قیام فرماویں ۔ مولانا کے ایک صاحب زادے علاؤالدین چلپی جب مولانا سے ملنے آتے تھے تو حضرت شمس کے خیمہ میں سے ہو کر جاتے ۔ شمس کو ناگوار ہوتا چند بار منع کیا لیکن وہ باز نہ آئے ۔ یہاں تک کہ شمس نے عزم کر لیا کہ جا کر پھر کبھی نہ آئیں ۔ چنانچہ دفعتاً غائب ہوگئے اور باوجود تلاش بسیار کے کہیں پتہ نہ چلا ۔ نفحات الانس میں ہے کہ خود مولانا کے صاحب زادے علاؤالدین محمد نے حضرت شمس کو قتل کر دیا اور یہ واقعہ ۶۴۴ - ۶۴۵ھ (۱۲۴۷ - ۴۸ء) کے درمیان ہوًا ۔ گویا حضرت شمس اور مولانا روم کی ملاقات کا عرصہ دو اڑھائی سال ہے ۔

مولانا شبلی فرماتے ہیں:

شمس کی ملاقات سے پہلے مولانا روم کے شاعرانہ جذبات اس طرح ان کی طبیعت میں پنہاں تھے جس طرح پتھر میں آگ ہوتی ہے ۔ شمس کی جدائی گویا چقماق تھی اور شرارے ان کی پرجوش غزلیں ۔ مثنوی کی ابتدا اسی دن سے ہوئی ۔ میاں بشیر احمد صاحب کی تحقیق کے مطابق مثنوی کا دفتر اول ۱۲۵۸ء تا ۱۲۶۱ء (۶۵۶ھ تا ۶۵۹ھ) میں لکھا گیا ۔

شبلی مرحوم لکھتے ہیں :

مدت تک مولانا کو شمس کی جدائی نے بے قرار و بے تاب رکھا ۔

ایک دن اسی جوش و خروش کی حالت میں گھر سے نکلے ، راہ میں شیخ صلاح الدین زر کوب کی دکان تھی - وہ چاندی کے ورق کوٹ رہے تھے- مولانا پر ھتھوڑے کی آواز نے سماع کا اثر پیدا کیا - وھیں کھڑے ھو گئے اور وجد کی حالت طاری ھو گئی - شیخ مولانا کی حالت دیکھ کر اسی طرح ورق کوٹتے رہے یہاں تک کہ بہت سی چاندی ضائع ھو گئی لیکن انہوں نے ھاتھ نہ روکا - آخر شیخ باھر نکل آئے - مولانا نے ان کو آغوش میں لے لیا اور جوش و مستی میں دوپہر سے عصر تک یہ شعر گاتے رہے -

یکی گنجی پدید آمد ازیں دکان زرکوبی
زھی صورت زھی معنی زھی خوبی زھی خوبی

شیخ نے کھڑے کھڑے دکان لٹوا دی - مولانا صلاح الدین کی صحبت میں ۹ برس رہے - جس بات کے لئے مولانا شمس تبریز کو ڈھونڈتے پھرتے تھے ان سے حاصل ھوئی - مولانا نے صلاح الدین کی شان میں نہایت ذوق شوق کی غزلیں اور اشعار کہے ھیں -

مولانا نے اپنے صاحب زادے سلطان ولد کا شیخ صلاح الدین کی صاحب زادی سے عقد بھی کر دیا اور اس طرح اختصاص باطنی کے ساتھ ظاھری تعلقات بھی مستحکم ھو گئے - شیخ نے ۶۶۲ھ (۶۴—۱۲۶۲ء) میں بیمار ھو کر داعی اجل کو لبیک کہا - مولانا کو بہت صدمہ ھوا - اسی حالت میں ایک غزل لکھی - مطلع ھے :

ای ز ھجران در فراقت آسمان بگریستہ
دل میان خون نشستہ عقل و جان بگریستہ

صلاح الدین زرکوب کی وفات کے بعد مولانا حسام الدین چلپی کو جو معتقدان خاص میں سے تھا ھمدم و ھمراز بنایا اور تاحین حیات انہیں سے دل کو تسکین دیتے رہے - حسام الدین ھی کی درخواست اور استدعا پر مولانا نے مثنوی لکھنی شروع کی -

۶۷۲ھ (۱۲۷۳ء) میں قونیہ میں بڑے زور کا زلزلہ آیا اور مسلسل

چار دن تک قائم رہا - تمام لوگ سراسیمہ و حیران پھرتے تھے - آخر مولانا کے پاس آئے کہ یہ کیا بلائے ناگہانی ہے - مولانا نے فرمایا کہ زمین بھوکی ہے - لقمہ تر چاہتی ہے اور انشاء اللہ کامیاب ہوگی - چند روز بعد مزاج ناساز ہؤا - بیماری کی خبر عام ہوئی تو شیخ صدر الدین جو محی الدین اکبر کے تربیت یافتہ اور روم و شام میں مرجع خاص و عام تھے مریدوں کو ساتھ لے کر آئے - مولانا کی حالت دیکھ کر بے قرار ہوئے اور دعا کی کہ خدا جلد شفا دے - مولانا نے فرمایا شفا آپ کو مبارک ہو - عاشق و معشوق میں بس ایک پیرہن کا پردہ رہ گیا ہے کیا آپ نہیں چاہتے کہ وہ اٹھ جائے اور نور نور میں مل جائے - شیخ روتے ہوئے اٹھے - مولانا نے یہ شعر پڑھا :

چہ دانی تو کہ در باطن چہ شاہی همنیش دارم
رخ زریں من منگر کہ پائے آهنیں دارم

مولانا نے حسام الدین چلپی کو اپنا خلیفہ مقرر کیا اور نماز جنازہ پڑھانے کے لئے مولانا صدرالدین کا نام تجویز فرمایا - اور جمادی الثانی ۶۶۲ھ (۱۷ دسمبر ۱۲۷۳ء) کو یک شنبہ کے دن غروب آفتاب کے وقت انتقال کیا - رات کو تجہیز اور تکفین کا سامان مہیا کیا گیا - صبح کو جنازہ اٹھا - ہر طبقہ اور فرقہ کے آدمی جنازے کے ساتھ تھے - عیسائی اور یہودی جنازے کے آگے آگے انجیل و توریت پڑھتے جاتے تھے - بادشاہ وقت جنازے کے ساتھ تھا - صندوق جس میں تابوت رکھا تھا راہ میں چند دفعہ بدلا گیا اور اس کے تختے توڑ کر تبرک کے طور پر تقسیم کئے گئے - شام ہوتے ہوتے جنازہ قبرستان میں پہنچا - شیخ صدر الدین نماز جنازہ پڑھانے کے لئے کھڑے ہوئے لیکن چیخ مار کر بے ہوش ہوگئے - آخر قاضی سراج الدین نے نماز جنازہ پڑھائی -

مولانا کے دو فرزند تھے - علاؤالدین محمد جنھوں نے شمس تبریز کو شہید کیا اور سلطان ولد جو حسام الدین چلپی (متوفی ۶۸۳ھ) کی وفات کے بعد اتفاق عام سے مسند خلافت پر متمکن ہوئے - ان کی

تصنیفات میں قابل ذکر ایک مثنوی ہے جس میں مولانا کے حالات و واردات لکھے ہیں ۔ انہوں نے ۱۲ ۷ھ میں ۹۶ برس کی عمر میں انتقال کیا۔

مولانا روم کا سلسلہ اب تک قائم ہے۔ ابن بطوطہ نے اپنے سفر نامہ میں لکھا ہے کہ ان کے فرقہ کے لوگ جلالیہ کہلاتے ہیں۔ لیکن مولانا شبلی مرحوم کی تحقیق کے مطابق یہ فرقہ مولویہ کہلاتا ہے۔ مولانا مرحوم لکھتے ہیں :

"آج کل ایشیائے کوچک ، شام ، مصر اور قسطنطنیہ میں اسی فرقہ کو مولویہ کہتے ہیں ۔ یہ لوگ نمدے کی ٹوپی پہنتے ہیں ۔ جس میں جوڑ یا درز نہیں ہوتی۔ مشائخ اس ٹوپی پر عمامہ باندھتے ہیں ۔ خرقہ یا کرتہ کے بجائے ایک چنٹ دار جامہ ہوتا ہے ۔"

مولانا کے اخلاق و عادات کے بارے میں شبلی مرحوم رقم طراز ہیں :

مولانا جب تک تصوف کے دائرے میں نہیں آئے تھے ان کی زندگی عالمانہ جاہ و جلال کی شان رکھتی تھی ۔ ان کی سواری جب نکلتی تھی تو امرا اور طلبہ کا گروہ رکاب میں ہوتا تھا۔ مناظرہ اور مجادلہ میں اوروں سے چند قدم آگے تھے ۔ سلاطین اور امرا کے دربار سے بھی ان کو تعلق تھا۔ لیکن سلوک میں داخل ہونے کے ساتھ یہ حالت بدل گئی۔ سپہ سالار کا بیان ہے کہ میں نے کبھی ان کو شب خوابی کے لباس میں نہیں دیکھا۔ قصداً لیٹتے نہ تھے۔ نیند غالب ہوتی تو بیٹھے بیٹھے سو جاتے ۔ روزہ اکثر رکھتے تھے ۔ معتبر رواۃ کا بیان ہے کہ متصل دس دس بیس بیس دن کچھ نہ کھاتے تھے نماز کا وقت آتا تو فوراً قبلہ کی طرف مڑ جاتے اور چہرہ کا رنگ بدل جاتا ۔ سپہ سالار کہتے ہیں کہ بارہا میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ اول عشاء کے وقت نیت باندھی اور دو رکعتوں میں صبح ہوگئی۔ مولانا نے ایک غزل میں اپنی نماز کی کیفیت یوں بیان کی ہے :

بخدا خبر ندارم چو نماز می گزارم
که تمام شد رکوعی که امام شد فلانی

مزاج میں انتہا درجہ کی قناعت و زھد تھا - سلاطین و امرا نقدی و تحائف بھیجتے تھے لیکن مولانا اپنے پاس کچھ نہ رکھتے تھے - جب گھر میں کھانے کا کچھ سامان نہ ھوتا تو بہت خوش ھوتے اور فرماتے کہ آج ھمارے گھر سے درویشی کی بو آتی ھے -

فیاضی اور ایثار کا یہ عالم تھا کہ کوئی سائل سوال کرتا تو عبا یا کرتا جو کچھ بھی بدن پر ھوتا اتار کر دے دیتے - معاش کا طریقہ یہ تھا کہ اوقاف کی مد سے پندرہ دینار ماھوار مقرر تھا - چونکہ مولانا مفت خوری کو ناپسند کرتے تھے اس لئے اس کے معاوضہ میں فتویٰ لکھا کرتے تھے - مریدوں پر تاکید تھی کہ اگر کوئی فتویٰ لائے تو میں گو کسی حالت میں ھوں ضرور خبر کرو تاکہ یہ آمدنی مجھ پر حلال ھو - ایک دفعہ عین وجد و مستی کی حالت میں فتویٰ لکھا - شمس الدین مارونی نے اس کی تغلیط کی - مولانا نے سنا تو کہلا بھیجا کہ فلاں کتاب کے فلاں صفحہ پر یہ مسئلہ موجود ھے - چنانچہ لوگوں نے تحقیق کی تو جو مولانا نے کہا تھا وھی نکلا -

مولانا پر اکثر استغراق وجد اور محویت کی حالت طاری رھتی تھی - بیٹھے بیٹھے یک بارگی اٹھ کھڑے ھوتے اور رقص کرنے لگتے - سماع کی محفلوں میں کئی کئی دن گذر جاتے کہ ھوش میں نہ آتے - معمول تھا کہ وجد کی حالت میں جو کچھ بدن پر ھوتا اتار کر قوالوں کو دے ڈالتے -

تصنیفات : مولانا شبلی مرحوم نے مولانا روم کی تین کتابوں کا ذکر کیا ھے -

۱ - فیہ مافیہ — یہ ان خطوط کا مجموعہ ھے جو مولانا نے وقتاً فوقتاً معین الدین پروانہ کے نام لکھے -

۲ - دیوان — اس میں تقریباً پچاس ھزار شعر ھیں چونکہ غزلوں کے مقطع

میں شمس تبریز کا نام ہے اس لئے عوام الناس اسے شمس تبریز ہی کا دیوان سمجھتے ہیں لیکن یہ درست نہیں۔ مولانا شبلی فرماتے ہیں:

شمس تبریز کا نام تمام غزلوں میں اس حیثیت سے آیا ہے کہ مرید اپنے پیر سے خطاب کر رہا ہے یا غائبانہ اس کے اوصاف بیان کرتا ہے۔ دوسرے ریاض العارفین وغیرہ میں تصریح کی گئی ہے کہ مولانا نے شمس تبریز کے نام سے یہ دیوان لکھا۔ تیسرے اکثر شعرا نے مولانا کی غزلوں پر غزلیں لکھی ہیں اور مقطع میں تصریح کی ہے کہ یہ غزل مولانا کی غزل کے جواب میں ہے۔ مثلاً علی حزیں کہتے ہیں:

ایں جواب غزل مرشد روم ہست کہ گفت
من ببوی تو خوشم نافۂ تا تار مگیر

۳ ۔ مثنوی: یہ وہ کتاب ہے جس نے مولانا کے نام کو آج تک زندہ رکھا ہے۔ اس کے اشعار کی مجموعی تعداد جیسا کہ کشف الظنون میں ہے ۲۶۶۶ ہے۔

مولانا شبلی نے نہ صرف مثنوی بلکہ دیوان پر بھی تنقید و تبصرہ کیا ہے۔ دیوان کے بارے میں فرماتے ہیں۔ دیوان میں اگرچہ کم و بیش پچاس ہزار شعر ہیں لیکن صرف غزلیں ہی غزلیں ہیں قصیدہ یا قطعہ وغیرہ مطلق نہیں۔ مولانا کی شاعری کا دامن مدح کے داغ سے بالکل پاک ہے۔ حالانکہ ان کے معاصرین میں سے عراقی اور سعدی جو ارباب حال میں بھی نامور ہیں اس عیب سے نہ بچ سکے۔ تمام اہل تذکرہ متفق ہیں کہ جن لوگوں نے غزل کو غزل بنایا وہ شیخ سعدی، عراقی اور مولانا روم ہیں۔ مولانا نے بہ ضرورت اور بہ جبر شاعری کا شغل اختیار کیا تھا۔ فرماتے ہیں:

”از بیم آنکہ ملول نشوند شعر می گویم واللہ کہ من از شعر بیزارم
لایت ما و قوم ما از شاعری ننگ تر کاری نبود“

مولانا شبلی غزلیات پر تنقید کرتے ہوئے رقم طراز ہیں :-

”مولانا غزل میں ان غریب اور ثقیل الفاظ تک کو بے تکلف استعمال کرتے ہیں جو غزل تو کیا قصیدہ میں بھی لوگوں کے نزدیک بار پانے کے قابل نہیں - مولانا کے کلام میں حقیقت کا پہلو اس قدر غالب ہے کہ رندوں اور ہوس بازوں کو جو غزل کی اشاعت اور ترویج کے نقیب ہیں اپنے مذاق کے موافق بہت کم سامان نظر آتا ہے -“

مولانا مرحوم کے نزدیک مولانا روم کی غزلیات میں مندرجہ ذیل خصوصیات پائی جاتی ہیں -

۱- عام غزلوں کی طرح ہر شعر الگ نہیں ہوتا -

۲- ان کے کلام میں جو وجد ، جوش اور بے خودی پائی جاتی ہے اوروں کے کلام میں نہیں پائی جاتی -

۳- عشق و محبت کے جوش میں عاشق پر جو خاص خاص حالتیں گزرتی ہیں ان کو اس خوبی سے ادا کرتے ہیں کہ آنکھوں کے سامنے ان کی تصویر کھنچ جاتی ہے -

۴- ان کے کلام میں جلال ، ادعا ، بے باکی اور بلند آهنگی پائی جاتی ہے - مثلاً به زیر کنگرۂ کبریاش مردانند فرشته صید و پیمبر شکار ویزدان گیر نه شبم نه شب پرستم که حدیث خواب گویم چو غلام آفتابم همه ز آفتاب گویم مثنوی معنوی کی تصنیف کا سبب مولانا شبلی کی تحقیق کے مطابق یہ ہے کہ حسام الدین چلپی نے مولانا روم سے درخواست کی کہ منطق الطیر کے طرز پر ایک مثنوی لکھی جائے - مولانا نے فرمایا کہ خود مجھ کو بھی رات یہ خیال آیا اور اس وقت یہ چند شعر موزوں ہوئے -

بشنو ازنی چون حکایت میکند

یہاں یہ کہنا نامناسب نہ ہو گا کہ مولانا روم حسام الدین چلپی کی بہت عزت کرتے تھے - مثنوی کے چھ دفتر ہیں اور بجز دفتر اول کے ہر دفتر ان کے نام سے مزین ہے -

مثنوی معنوی کو جس قدر مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی فارسی کی کسی کتاب کو آج تک نہیں ہوئی ۔ مقبولیت کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ علما و فضلا نے مثنوی کے ساتھ جس قدر اعتنا کی اور کسی کتاب کے ساتھ نہیں کی ۔ مولانا شبلی مرحوم مثنوی کی شہرت عام کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ :

''مثنوی سے پہلے جو کتابیں اخلاق و تصوف میں لکھی گئیں ان کا یہ انداز تھا کہ اخلاق و تصوف کے مختلف عنوان قائم کر کے اخلاقی حکائیتیں لکھتے تھے اور ان سے نتائج پیدا کرتے تھے ۔ منطق الطیر اور اور بوستان کا یہی انداز ہے ۔ حدیقہ میں اکثر مسائل کو مستقل طور پر بھی بیان کیا ہے ۔ مثلاً عمل ، معرفت ، وجد ، توکل ، صبر و شکر وغیرہ کے عنوان قائم کئے ہیں اور ان کی حقیقت بیان کی ہے ۔ لیکن مثنوی کا یہ انداز نہیں ۔ مثنوی میں کسی قسم کی ترتیب و تبویب نہیں ، دفتروں کی جو تقسیم ہے وہ خصوصیت مضمون کے لحاظ سے نہیں بلکہ جس طرح قرآن مجید کے پارے یا ایک شاعر کے متعدد دیوان ہوتے ہیں ۔''

یہاں یہ کہنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مولانا روم کا یہ طریقۂ تحریر بعض طبائع پر ناگوار گزرا اور لوگوں نے مولانا کی حین حیات میں ھی اعتراض کرنا شروع کر دیا کہ مناسب تو یہ تھا کہ فقر و سلوک کے مقامات کو بہ تفصیل و بہ ترتیب الگ الگ بیان کیا جاتا ۔ لیکن مولانا نے اس کے بجائے طفلانہ قصے بھر دئے ۔ مولانا نے اس کا جواب دیا کہ کفار نے قرآن مجید پر یہی اعتراض کئے تھے ۔ فرماتے ہیں :-

چون کتاب اللہ بیامد ہم برآن
این چنیں طعنہ زدند آن کافران

کہ اساطیر است و افسانہ نژند
نیست تعمیقی و تحقیقی بلند

پھر فرماتے ہیں :

حرف قرآن رامدان کہ ظاہر ست
زیر ظاہر باطنی ہم قاہر ست

زیر آن باطن یکی بطنی دگر
خیرہ گردد اندر وفکر و نظر

ہم چنین تا ہفت بطن ای بوالکرم
می شمر تو این حدیث معتصم

مولانا روم نے یہ مثنوی حدیقہ اور منطق الطیر کو سامنے رکھ کر لکھی ہے ۔ خود فرماتے ہیں :-

ترک جوشی کردہ ام من نیم خام
از کلیم غزنوی بشنو تمام

در الٰہی نامہ گوید شرح این
آن حکیم غیب و فخرالعارفین

بعض بعض موقعوں پر باوجود بحر کے مختلف ہونے کے مثنوی میں حدیقہ کے اشعار نقل کئے ہیں اور ان کی شرح لکھی ہے ۔ بعض جگہ حدیقہ کے اشعار سے مضمون میں بالکل توارد ہو گیا ہے لیکن مولانا شبلی نعمانی کے بقول

" مثنوی کو حدیقہ اور منطق الطیر سے وہی نسبت ہے جو قطرہ کو گوہر سے ہے ، سینکڑوں حقائق و اسرار جو مثنوی وغیرہ میں بیان ہوتے ہیں حدیقہ وغیرہ میں سرے سے ان کا پتہ ہی نہیں ۔ جو خیالات دونوں میں مشترک ہیں ان کی بعینہ مثال ہے جس طرح کسی شخص کو کسی چیز کا ایک دھندلا سا خیال آئے اور ایک شخص پر اس کی حقیقت کھل جائے ۔"

مثنوی کے مضامین و مطالب متلق شبلی مرحوم مندرجہ ذیل امور شائستۂ غور و خوص و سزاوار توجہ فرماتے ہیں ۔

۱۔ مولانا کے زمانہ میں تمام اسلامی دنیا میں جو عقاید پھیلے ہوئے تھے وہ اشاعرہ کے عقاید تھے ۔ اس عالمگیر طوفان سے مولانا محفوظ نہیں رہ سکتے تھے ۔ تاہم چونکہ طبیعت میں فطرتی استقامت تھی اس لغزش

گاہ میں بھی ان کا قدم اکثر پھسلنے نہیں پاتا ۔ وہ اکثر اشاعرہ کے اصول پر عقاید کی بنیاد رکھتے ہیں ۔ لیکن جب ان کی تشریح کرتے ہیں تو اوپر کے چھلکے اترتے جاتے ہیں اور اخیر میں مغز سخن رہ جاتا ہے ۔

۲ ۔ مثنوی میں نہایت کثرت سے وہ روایتیں اور حکائتیں مذکور ہیں جو اگرچہ فی الواقع غلط ہیں لیکن اس زمانہ سے آج تک مسلمانوں کا بڑا حصہ ان کو مانتا آتا تھا ۔ مولانا ان روایتوں سے بڑے بڑے نتیجے نکالتے ہیں ۔ یہی روایات عمارت مثنوی کے ستون ہیں ۔

۳ ۔ مولانا قیاس شمولی سے جو منطق میں بہت مستعمل ہے استدلال نہیں کرتے ان کا استدلال قیاس تمثیلی کی صورت میں ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ مثنوی میں نہایت کثرت سے تمثیل اور تشبیہ سے کام لیا ہے ۔ مثلاً ان کو یہ ثابت کرنا ہے کہ وارفتگان محبت آداب شرع کے پابند نہیں ہوتے ۔ تمثیل کے ذریعے اس طرح سمجھاتے ہیں ۔

خون شہیدان زآب اولیٰ تراست
ایں گناہ از صد ثواب اولیٰ تراست

درمیان کعبہ رسم قبلہ نیست
چہ غم ارغواص را پا چپلہ نیست

جہاں تک مثنوی کی خصوصیات کا تعلق ہے مولانا شبلی کے نزدیک مثنوی کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا طرز استدلال اور طریقۂ افہام ہے ۔ مولانا روم نے جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے قیاس تمثیلی سے کام لیا ہے جو عام طبائع کے افہام و تفہیم کا آسان اور اقرب الی الفہم طریقہ ہے ۔ مولانا شبلی فرماتے ہیں :-

" استدلال تمثیلی کے لئے تخیل کی بڑی ضرورت ہے جو شاعر کی سب سے ضروری شرط ہے ۔ مولانا کی شاعری کو جس بنا پر شاعری کہا جاتا ہے وہ یہی قوت تخیل ہے ، تصوف ۔ سلوک اور الہیات کے مسائل عام ادراک بشری سے خارج ہیں ۔ لہذا انہیں سمجھانے کے لئے مثالوں اور تشبیہوں سے کام لینا ضروری ہے ۔ مثلاً یہ مسئلہ کہ مقام فنا میں انسان

صفات الٰہیہ کا مظہر بن جاتا ہے اور اس عالم میں اس کا اناالحق کہنا جائز ہے ۔ اس طرح ثابت کیا ہے :-

رنگ آہن محو رنگ آتش است
ز آتشی می لافد و آہن وش است

چو بہ سرخی گشت ہمچو زرّ کان
پس انا النار ست لافش بی گہان

شد ز رنگ و طبع آتش محتشم
گوید او من آتشم من آتشم

آتشم من گر ترا شک است و ظن
آزمون کن دست را برمن بزن

فرضی حکایات کے دامن میں اخلاقی مسائل کا حل کچھ اس طرح پنہاں ہوتا ہے کہ قاری بدون تکلیف وہ سب کچھ جان لیتا ہے جو کسی اور طریقے سے ذرا مشکل سے ذہن نشین ہوتا ۔ ان دلچسپ قصوں میں کھو کر وہ اخلاقی مسائل کی تعلیم حاصل کرتا ہے اور بغیر غور و غوض کئے تمام گتھیاں سلجھ جاتی ہیں ۔ مولانا شبلی کے نزدیک مولانا روم نے اس فن کو رتبۂ کمال تک پہنچا دیا ۔ شبلی مرحوم فرماتے ہیں کہ اس طریقۂ تعلیم کا کمال امور ذیل پر موقوف ہے :

۱ ۔ نتیجہ فی نفسہ اچھوتا ، نادر اور اہم ہو ۔

۲ ۔ نتیجہ حکایت سے نہایت مطابقت رکھتا ہو ۔ گویا حکایت اس کی تصویر ہو ۔

۳ ۔ حکایت کے اثنا میں نتیجہ کی طرف ذہن منتقل نہ ہو سکے بلکہ خاتمہ پر بھی جب تک خود مصنف اشارہ یا تصریح نہ کرے نتیجہ کی طرف خیال منتقل نہ ہونے پائے ۔ اس سے طبیعت پر ایک استعجاب کا اثر پڑتا ہے اور منصف کی قوت تخیل کی قوت ، ثابت ہوتی ہے ۔

اخلاق و سلوک کے بعض مسائل ایسے ہیں جن میں اہل نظر مختلف

الرائے ھیں - ان مسائل کو مولانا نے فرضی مناظروں کے ذیل میں ادا کیا ہے - تاکہ طرفین کے دلائل قاری کے سامنے آ جائیں اور غلط فہمیاں دور ہو جائیں -

سوانح مولانا روم جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے مولانا شبلی مرحوم کے سلسلہ کلامیہ کی ایک کڑی ہے لہذا علم کلام کے مضامین پر مفصل بحث کی ہے - اور ان کا عقیدہ ہے کہ مسائل عقاید جس خوبی سے مثنوی میں ثابت کئے گئے ھیں اس کی نظیر نہیں ملتی - شبلی مرحوم لکھتے ھیں -

'' مولانا روم جس طریقہ سے استدلال کرتے ھیں وہ دل پر اثر کر جاتا ہے اور گو وہ شک و شبہات کے تیر باران کو کلیۃً روک نہیں سکتا تاھم طالب حق کو اطمینان کا حصار ھاتھ آجاتا ہے جس کی پناہ میں وہ اعتراضات کے تیر باراں کی پروا نہیں کرتا - اس بنا پر ضرور ہے کہ مثنوی کو علم کلام کی حیثیت سے بھی ملک اور قوم کے سامنے پیش کیا جائے -''

مولانا شبلی اس کے بعد علم کلام کے مسائل یعنی الٰہیات ، معجزہ ، جبر و قدر ، توحید وغیرہ کے بارے میں پہلے خود بحث کرتے ھیں پھر جو کچھ مثنوی میں درج ہے اس کا مختصر خلاصہ بیان کرتے ھیں اور بعدہ' مثنوی کے اشعار بطور مثال کے لاتے ھیں اور ان کا اُردو میں ترجمہ بھی ساتھ ساتھ لکھتے چلے جاتے ھیں - تاکہ کم پڑھا لکھا آدمی بھی مثنوی معنوی کے مطالب سمجھ سکے - یہ بھی کتاب کے ایک سو صفحات پر پھیلا ہؤا ہے اور مولانا کے تبحر علمی پر دلیل قاطع ہے - ھم بخوف طوالت قلمزن کرتے ھیں -

مثنوی سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اگر ''سوانح مولانا روم'' کے اس حصہ کو پڑھنے کی زحمت گوارا فرماویں تو بہت سے رازِ سر بستہ ان پر منکشف ھوں گے اور اس مادی دور میں ذات باری ، صفات باری ، نبوت ، معجزہ ، وحدت وجود ایسے بہت سے مسائل کے سمجھنے میں انہیں دقت نہ ھو گی - ان اوراق کے مطالعہ سے یہ بات واضح و لائح ھو جاتی

ھے کہ مولانا نے بحر ذخار مثنوی کی غواصی کر کے بے شمار درآبدار کو سفینہ تحریر میں اس خوبصورتی سے پیش کیا ھے کہ جنھیں دیکھ کر چشم دیدہ ور کو نور اور قلب مضطر کو سکون و سرور میسر ھوتا ھے ۔ چشم بصیرت روشن اور آئینہ دل منجلی ھوتا ھے ۔ یہ وہ درھاۓ شاھوار ھیں جن کی چمک دمک رھتی دنیا تک خاصان ادب کی توجہ کو اپنی طرف منعطف کرتی رھے گی اور دل حق شناس مولانا روم کے ساتھ ساتھ شبلی مرحوم کی بارگاہ میں بھی ستائش و سپاس کے گلہای بوقلموں نثار کرنے میں فخر محسوس کرے گا ۔

الفاروق

شیخ عطاءاللہ

مجھے 'الفاروق' کے مطالعہ کی سعادت کالج کی طالب علمی کے زمانے میں میسر آئی۔ کتاب کو ذوق و شوق سے دیکھا تو آنکھوں کے سامنے

آن مسلمانان کہ میری کردہ اند
در شہنشاہی فقیری کردہ اند

کا وہ نقشہ کھنچ گیا جو چشم فلک نے نہ پہلے کبھی دیکھا تھا۔ نہ امید ہے آئندہ دیکھے گی۔ ایسا معلوم ہؤا کہ وہ کسی عالم قدس کے باشندے تھے جو انسانیت کا درجہ بلند کرنے کو کچھ دیر کے لئے اس تیرہ خاک دان کو روشن کر گئے۔ دل و دماغ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عظمت و جلالت سے معمور اور ان کی فضیلت و کمالات کے نور سے منور ہو گئے۔ انگریزی میں ایک سیر حاصل مقالہ "عمر رض ایک فقیر شہنشاہ" کے زیر عنوان مرتب کیا۔ خواجہ کمال الدین مرحوم ان دنوں لاہور میں تھے۔ انہیں ایک دوست کی زبانی معلوم ہؤا تو خود تشریف لائے اور مقالہ اسلامک ریویو میں اشاعت کی غرض سے لے گئے۔

الفاروق کے مطالعہ سے خیال پیدا ہؤا کہ اس کا انگریزی ترجمہ ہونا چاہئے۔ اختتام تعلیم پر خاموشی سے اپنے طور پر کام شروع کر دیا گیا لیکن ایک ابتدائی مقام پر پہنچ کر ایسا اٹکا کہ پھر پڑھنے نہ پایا اور رفتہ رفتہ فکر معاش اور مصروفیتوں نے ایسا گرفتار کیا کہ اس طرف توجہ نہ دے سکا۔ تا آنکہ ۱۹۴۸ء میں قیام پاکستان کے بعد شیخ محمد اشرف ناشر کتب اسلامیہ نے مولانا شبلی کے شاگرد رشید فدائے ملت مولوی ظفر علی خاں مرحوم مغفور۔ ایڈیٹر زمیندار کے قلم سے الفاروق کا انگریزی ترجمہ شائع کر دیا۔ مولوی صاحب مرحوم نے بھی کتاب کے شائع ہوتے ہی ترجمہ کا تہیہ کر لیا تھا۔ اور اس طرح چالیس پچاس سال

میں ان کی جوانی کی آرزو بڑھاپے میں پوری ہوئی ۔ حق یہ ہے کہ یہ سعادت بجا طور پر ان کے لئے مقرر ہو چکی تھی ۔ ان کی بہار آفریں انشا پردازی ، انگریزی زبان پر ان کا بے مثل عبور اور ملّت کی عظیم‌الشان خدمات کی سند اور کس کے پاس تھی ۔ دل کو ایک گونہ اطمینان ہؤا کہ ایک ضروری خدمت نہایت قابلیت و خوبی کے ساتھ انجام پائی ۔

مولانا شبلی الفاروق کو اپنی غزل مرصع سمجھتے تھے اور اس پر انہیں متعدد اعتبارات سے بجا طور پر ناز تھا ۔ مکاتیب سے معلوم ہوتا ہے وہ اس کا عربی ترجمہ کرنا یا کروانا چاہتے تھے تاکہ عالم اسلام حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی جلالت سے قدرے آشنا ہونے کے ساتھ مولانا کی علمی ، مذہبی اور تاریخی ، اور تحقیقاتی خدمات کے معیار سے بھی روشناس ہو سکے ۔ مولانا مرحوم کی یہ خواهش اب تک تشنۂ تکمیل ہے ۔ کیا پاکستان کے ادبی اور ثقافتی ادارے یا مصر میں پاکستانی سفارت خانہ اس خدمت کی انجام دہی کی سعادت حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرے گا ۔ الفاروق ہماری زبان کا ایک تاریخی شاہکار ہے ایک نہ ایک روز یہ کام ضرور انجام پائے گا ۔ اس کا شرف ابھی کیوں نہ حاصل کرنے کی کوشش کی جائے ۔ بھارت کے مسلمانوں کو تو فی الحال ایسے کاموں کی طاقت و فرصت کہاں میسر ہے اور شبلی مرحوم تو اس عالمگیر ملت کی متاع بے بہا تھے ان کی تمناؤں کی تکمیل کا اہتمام بجائے خود ایک سعادت ہے ۔ دیکھئے کسے میسر آتی ہے ۔

الفاروق کا فارسی ترجمہ جس کا خیال کبھی مولانا کو پیدا نہیں ہؤا تھا البتہ شائع ہو چکا ہے اس کی محرک کوئی افغان شہزادی تھیں اور ترجمہ کرنے والے میرے ہم وطن مولوی نجف علی خاں مرحوم تھے۔ یہ بزرگ مدتوں افغانستان میں رہے ۔ امان‌اللہ خاں کے اتالیق بھی رہے آخر عمر میں پنشن یاب ہو کر وطن واپس آ گئے تھے ۔ الفاروق کے فارسی نسخہ کی ایک جلد انہوں نے میری معرفت غالباً ۱۹۳۳ء میں کتب خانہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی نذر کی ۔ ذرا سی ہمت اور تھوڑے سے خرچ سے الفاروق کا ترکی زبان میں بھی ترجمہ ہو جائے تو بہتر ہے ۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ ایک زمانہ میں ٹرکی میں سیرت النبی کے ترجمہ کی تحریک اٹھی تھی ۔ معلوم نہیں کہ عمل سے ہمکنار ہو سکی یا نہیں اور اگر علمی و مذہبی خدمت کی سعادت سے ہم محروم ہوچکے ہیں تو اقوام متحدہ کے علمی و تعلیمی ادارے کی معرفت اس کام کا انجام پا جانا کچھ مشکل نہیں ۔ اہل علم ارباب اختیار کو دوسروں ہی کو توجہ دلانی چاہئے کہ انسانیت اس لازوال نعمت سے محروم نہ رہ جائے ۔

مولانا شبلی نعمانی مرحوم و مغفور

خان بہادر ڈاکٹر شیخ عبداللہ

مولانا شبلی مرحوم مغفور جو اپنے نام کے ساتھ نعمانی کے لفظ کا بھی اضافہ کیا کرتے تھے وہ میرے استاد بھی تھے اور بعد میں اُن سے میرا ملنا جلنا رہا - میں ۱۸۹۱ء کی مئی میں امتحان انٹرنس یا میٹرک لاہور یونیورسٹی سے پاس کر کے علی گڑھ میں آ کر فرسٹ ایر میں داخل ہوا - ڈاکٹر آرنلڈ مرحوم نے میرا نام رجسٹر میں داخل کیا کیونکہ پرنسپل مسٹر بیک اس وقت موجود نہیں تھے - سر تھیوڈور موریسن اس وقت قائم مقام پرنسپل تھے اور آرنلڈ صاحب داخلوں کا کام کیا کرتے تھے - میں فلاسفی کا مضمون ڈاکٹر آرنلڈ ھی سے پڑھا کرتا تھااور پروفیسر جادو چندر چکرورتی ریاضی کے پروفیسر کے پاس ریاضی کے مضامین پڑھا کرتا تھا - انگریزی سرتھیوڈور موریسن سے پڑھتا تھا جو اس وقت قائم مقام پرنسپل تھے اور سنسکرت پنڈت ترپاٹھی سے پڑھتا تھا لیکن مولانا شبلی مرحوم کالج میں باقائدہ کام شروع ہونے سے قبل لیکچرر روم کے ایک کمرے میں آ کر بیٹھ جاتے تھے اورسب کلاسوں کے طالب علم وھاں جمع ہو جاتے تھے - مولانا نہایت خوش الحانی سے قرآن پاک کے ایک رکوع کی تلاوت فرماتے تھے اور پھر اس کا ترجمہ بھی طالب علموں کے سامنے پڑھ دیتے تھے اور کبھی کبھی کسی آیت یا لفظ کے معنی پر تشریح سے گفتگو بھی فرماتے تھے یہ درس کا سلسلہ میری فرسٹ ایر کی تعلیمی زندگی تک ھی محدود رہا - پھر رفتہ رفتہ مولانا کا یہ درس ختم ہو گیا کیونکہ طالب علم اپنی عدیم الفرصتی کی وجہ سے اس درس میں شرکت کم کرنے لگے تھے اور قریب چھ سات ماہ کے بعد یہ درس ختم ہوگیا - اس وقت مولانا کی حالت ایک اسکول یا کالج کے ماسٹر کی تھی - ابھی تک اپنے میں انہوں نے وہ چمک دمک کی روشنی پیدا نہیں کی تھی جس کا

ظہور بعد میں ہوا ۔ اُن کو کالج میں آئے ہوئے چھ سات ھی سال ہوئے تھے ان کے علوم اور زندگی کا ارتقاء بہت تیزی سے ہو رہا تھا ۔ مولانا نہایت ھی خوش خلق اور زندہ دل بزرگ تھے سب طالب علموں سے وہ نہایت بے تکلفی سے ملتے تھے ۔ اور اُن کا طریقہ گفتگو بہت مؤثر تھا ۔ مولانا کی سکونت سر سید کی کوٹھی سے ملحق ایک چھوٹی سی بنگلیا میں تھی جو طالب علموں میں شبلی کی بنگلیا کے نام سے مشہور تھی ۔ اب نہ سر سید کی کوٹھی رھی نہ بنگلیا رھی صرف نام رہ گیا اور نام لیوا بھی اب کم ہوتے جاتے ھیں ۔

میں شروع ھی میں سر سید مرحوم و مغفور کی خدمت عالی میں ایک تعارفی خط لے کر گیا تھا جو ایک بڑے عالم نے مجھ کو دیا تھا سر سید نے خط پڑھا اور کہا کہ کبھی کبھی آیا کرو اور ہم سے مل لیا کرو ۔ اس حکم کی تعمیل میں ھفتہ عشرہ میں شام کے وقت سر سید کی کوٹھی پر حاضر ہو جایا کرتا تھا ۔ وھاں پر جن لوگوں کو میں نے حاضر باشی میں دیکھا اُن میں مولانا شبلی مرحوم مغفور کا نام خصوصیت سے قابل ذکر ھے ایک مرتبہ مولانا شبلی نے اپنا ارادہ ظاہر کیا کہ میں قرآن پاک کا ترجمہ کرنا چاھتا ہوں ۔ سر سید نے فرمایا کہ ھمیں پوربی زبان میں قرآن شریف کا ترجمہ مطلوب نہیں ھے ۔ ابھی یہ باتیں ہو ھی رھی تھیں کہ سرراس مسعود مرحوم نبیرۂ سر سید جن کی عمر اس وقت پانچ چھ سال کی تھی وہ ھنستے ہوئے سر سید کے پاس آئے اور کہا کہ ہم ایک کونے میں چھپ گئے تھے کسی نے آواز دی تو ہم نہیں بولے پھر ڈھونڈیا پڑی کہ ہم کہاں گئے کونے سے ھنستے ھنستے باھر نکل آئے تو اماں خوش ہو گئیں ۔ وہ ابھی وھیں تھے کہ مولانا شبلی نے کہا کہ مسعود میاں اردو ہم کو بھی سکھا دو انہوں نے حیرت سے مولانا کی طرف دیکھا اور کہا کہ کیا آپ اردو نہیں جانتے ؟ مولانا شبلی نے جواب دیا کہ جانتے تو ھیں لیکن پوربی اردو جانتے ھیں ۔ یہ سن کر سر سید بھی مسکرائے کہ ھمارے اس کہنے کی طرف اشارہ ھے کہ ہم کو قرآن شریف کا ترجمہ پوربی اردو میں

مطلوب نہیں ہے -

جب میں جایا کرتا تھا تو ان موقعوں پر مولانا موجود ہوتے تھے - تاریخ یا دیگر علوم کے کسی مسئلہ پر جب سر سید سے باتیں ہوتی تھیں تو مولانا بھی اس میں حصہ لیتے تھے سر سید ان دنوں جہاں تک مجھے یاد ہے قرآن شریف کی تفسیر لکھ رہے تھے اور اس تفسیر کے لکھنے کا علم جب ملّاں اور مولویوں کو ہؤا تو تمام ملک میں وہی کیفیت ہو گئی جیسے کہ مثل مشہور ہے کہ کسی نے بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ دے دیا ہو - مولوی صاحبان بہت برہم ہوئے اور کفر کے فتوے جو پہلے ہی دے چکے تھے اُن کو پھر تازہ کیا - نہ تفسیر پڑھی اور نہ دیکھی بلا دیکھے پڑھے ہی اس کی مخالفت شروع کر دی -

کسی مولوی نے سر سید کے کسی دوست سے کچھ خواہش کی کہ میری کچھ مدد کیجئے میں نہایت عسرت کی حالت میں ہوں اور مجبور ہوں - سر سید نے سائل مولوی کو مشورہ دیا کہ روپیہ کمانے کی تدبیر میں تمھیں بتاتا ہوں اگر اس پر عمل کیا تو روپیہ بہت مل جائے گا - اُس نے پوچھا کہ وہ کیا تدبیر ہے جواب ملا کہ سر سید احمد خاں کی تفسیر کی ایک جلد منگوا کر اس کی تردید لکھنا شروع کرو اور اشتہار دے دو کہ میں تردید لکھ رہا ہوں جو خریدنا چاہے مجھ سے خط و کتابت کرے - مولانا شبلی مرحوم کی زبان سے بھی ایک مرتبہ نکلا کہ سر سید نے عربی علوم تو پڑھے ہی نہیں اُن کی تفسیر علماء میں کیسے مقبول ہو گی لیکن سر سید نے ملاں اور مولویوں کی مخالفت کی کچھ پرواہ نہ کی اپنا کام کئے گئے - باھر سے جب معترضین کے سوالات آتے تھے تو سر سید یا تو اُن کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھتے تھے اور یا نہایت نرمی اور اخلاق سے اس کا جواب دے دیتے تھے - اپنی طبیعت کو کبھی منغض نہیں ہونے دیتے تھے - اُن کے پاس زیادہ پیش پیش باتیں کرنے والے مولوی وحید الدین سلیم ہؤا کرتے تھے - لیکن حاضر باشی میں میں نے مولانا شبلی مرحوم کو سب سے زیادہ نمایاں پایا - ایک مرتبہ مولانا شبلی مرحوم مولانا عباس حسین

پروفیسر کالج کے پاس گئے یا مولانا عباس حسین خود آن کے پاس آئے مولانا عباس حسین ضلع جگت بولنے میں بڑے شاطر تھے جس وقت مولانا عباس حسین آن سے ملے تو مولانا شبلی اس وقت کیلا کھا رہے تھے۔ انہوں نے ایک پھلی مولانا عباس حسین کو بھی دی ۔ مولانا عباس حسین نے کہا میں نہیں کھاتا آپ اکیلے ہی کھائیے مولانا شبلی بہت محظوظ ہوئے کہ آپ نے یہاں بھی ضلع نہ چھوڑا ۔ کالج میں لڑکے سال میں ایک دفعہ محفل میلاد منعقد کیا کرتے تھے اس میں سر سید بھی آیا کرتے تھے ۔ لڑکے تو معمولی رسالوں میں سے میلاد کے متعلق واقعات بیان کیا کرتے تھے ۔ لیکن مولانا شبلی قرآن شریف کی آیتیں پڑھ پڑھ کر طالب علموں کو اس نعمت بے بہا سے آگاہ کیا کرتے تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک کی وجہ سے مسلمانوں کو نصیب ہوئی ۔

میرے طالب علمی کے زمانے میں مولانا شبلی مرحوم کا سب سے اہم واقعہ یہ تھا کہ وہ قسطنطنیہ تشریف لے گئے ان کو ترکوں سے بڑی محبت تھی وہ یہاں سے چلنے لگے تو ڈاکٹر آرنلڈ سے انہوں نے کہا کہ آپ بھی ولایت جا رہے ہیں میں بھی جہاز سے چلوں گا چونکہ مجھے جہاز کے سفر سے کوئی واقفیت نہیں ہے پورٹ سعید تک دونوں کا ساتھ ہو گا پورٹ سعید سے قبل کسی جگہ ایک طوفان آیا اور لوگ بہت پریشان ہو گئے واپسی کے بعد مولانا نے فرمایا کہ طوفان میں ہر شخص بد حواس ہؤا جاتا تھا میں اپنی کیبن سے نکل کر آرنلڈ صاحب کی کیبن میں گیا کہ دیکھوں ان کا کیا حال ہے میں نے آرنلڈ صاحب کو اُسی حالت میں پایا جس حالت میں روز دیکھتا تھا وہ نہایت سکون اور سکوت کے ساتھ بدستور کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے میں نے ان سے کہا کہ تمام جہاز پریشان ہو گیا اور آپ اب تک کتاب ہی پڑھے جا رہے ہیں۔ جو جواب آرنلڈ صاحب نے دیا وہ خصوصیت کے ساتھ طالب علموں کے ذہن میں بٹھانے کے لئے کہ جن لوگوں کے دل مضبوط ہوتے ہیں وہ اس طریقہ سے کام کیا کرتے ہیں جیسے کہ آرنلڈ صاحب نے اس طوفان کے موقع پر کیا ۔ آرنلڈ صاحب نے مولانا کو جواب دیا کہ مولوی

صاحب اگر دوسرے لوگوں کی طرح سے بدحواس ہو کر میں بھی پڑھنا چھوڑ دوں تو کیا طوفان بند ہو جائے گا اگر جہاز کو ڈوبنا ہی ہے تو سب لوگوں کے ساتھ میں بھی ڈوب جاؤں گا اور اگر یہ طوفان بند ہی ہونا ہے تو اتنے لوگ بد حواس ہیں ان کی وجہ سے بند ہو جائے گا اور اگر بند ہو گیا تو پھر میں لوگوں کی طرح بدحواسی اور پریشانی سے بچ جاؤں گا اور میرا وقت ضائع نہیں ہو گا اس لئے میں اپنے کام میں برابر مشغول ہوں ۔ ہوا تو برابر چلتی ہی رہے گی خواہ میں پڑھنا چھوڑ دوں یا نہ چھوڑوں ۔

مولانا جس کیبن میں سفر کر رہے تھے اس میں ایک نیچے کا برتھ ان کو ملا تھا اور اس برتھ کے اوپر جو برتھ تھا اس میں ایک انگریز سوار تھا ۔ مولانا فرماتے تھے کہ وہ شخص جب نیچے اترتا تھا تو مجھے ایک ٹھوکر لگا کر جاتا تھا ۔ میں خون کے گھونٹ پی کر صبر کر لیتا تھا کیونکہ جہاز انگریزوں کا "ہندوستان انگریز کے بس میں" "جہاز کے کل ملازمین انگریزوں کے ماتحت" اب میں لڑتا تو کس سے لڑتا ۔ اس کے بعد فرمایا کہ جب میں قسطنطنیہ میں تھا تو میں نے ایک بازار میں اپنے برابر چلتا ہؤا ایک انگریز دیکھا میں نے قصد کر کے اس انگریز کے بالکل قریب چلا گیا اور کندھے سے کندھا ملا کر چلنے لگا موقع پا کر اس کو ایک دھکا دیا تو وہ شخص گرتے گرتے بچ گیا اور میں آگے بڑھ گیا اور دل میں کہا کہ خدا کا شکر ہے کہ نہ یہاں انگریزی حکومت ہے اور نہ انگریزی جہاز ہے اس قوم کے ایک بد بخت آدمی کو دھکا دیا کہ کسی روز اسی طرح سے دھکا دے کر ہندوستان سے ان کو نکالیں گے ۔

مولانا مرحوم ترکوں کی بہت تعریف کیا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ ترک بڑے اچھے ہیں اور مہماں نواز ہیں ۔ وہ کسی معزز رئیس سے ملنے گئے دربان سے کہلا بھیجا کہ ہندوستان کے ایک مولوی صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں وہ رئیس سمجھا کہ یہ بھی کوئی ہندوستانی بھک منگا مولوی ہو گا جو اکثر آیا کرتے ہیں اس لئے اس نے دو روپے

نکال کر اپنے دربان کو دے کہ جا کر ان کو یہ روپے دے دو ۔ اُس آدمی نے لا کر روپے مولانا کے سامنے پیش کئے کہ یہ بھیجے ھیں ۔ مولانا نے فرمایا کہ میں روپے مانگنے نہیں آیا بلکہ میں اُن سے ملنے آیا ہوں روپے خدا نے مجھے بھی دیئے ھیں ۔ اس شخص نے روپے جا کر اپنے مالک کو واپس دئے اور جو مولانا نے فرمایا تھا وہ بھی کہا تو اس رئیس کو حیرت ھوئی کہ کوئی مولوی ایسا مستغنی طبیعت کا بھی ھے کہ جو روپے واپس کرتا ھے اس نے آدمی سے کہا کہ جا کر اُن سے کہو کہ آپ تشریف لائیے میں ملوں گا ۔ چنانچہ مولانا اُس رئیس کے پاس پہونچے بڑے تپاک سے رئیس ان سے ملا اور جب گفتگو ھوئی اور مولانا کی غایت سفر کا حال ان کو معلوم ھؤا تو اس کو بے انتہا خوشی ھوئی اور بہت ھی خلق و محبت سے گفتگو کی ۔ اب مجھے یہ یاد نہیں رہا کہ آیا اس ملاقات کا بعد میں کیا نتیجہ ھوا لیکن اس وقت اس رئیس کی نگاہ میں اُن کا درجہ بھک منگے مولویوں کا سا نہ رہا بلکہ معززین ھندوستانیوں میں مولانا کا شمار ھونے لگا ۔ اس واقعہ کا بیان کر کے نہایت افسوس کیا کرتے تھے کہ ھمارے ملک کے لوگوں نے اپنی حالت ایسی کر رکھی ھے کہ ترک جو بہت ھی مخیّر طبیعت کے لوگ ھیں وہ ہر ھندوستانی عالم کو بھک منگا ھی سمجھتے ھیں ھیں خود تو تمہارے عالم لوگ بدنام ھیں اور ذلیل ھوتے ھیں لیکن ان کی وجہ سے ہر شخص خواہ بھک منگا ھو یا نہ ھو ترکوں کی نگاہ میں اور ترکوں کے نزدیک ذلیل و خوار ھے اور شیخ سعدی رحمتہ اللہ علیہ کا ایک شعر پڑھا کرتے تھے ۔ جس کے معنی یہ ھیں کہ قوم میں سے اگر کوئی شخص بیوقوفی کی بات کرتا ھے تو نہ چھوٹے کی عزت قائم رہتی ھے نہ بڑے کی قائم رہتی ھے ۔ مولانا جب وھاں سے واپس آئے تو ترکوں کی تعریف سے رطب اللسان تھے ۔ ھندوستان میں ھندستانیوں کی ذلت کے مظاھر دیکھنے والا آدمی آزاد اور شاھی تزک و احتشام رکھنے والی قوم کی عزت و محبت کو اپنے دل میں جگہ نہ دے تو اور کیا کرے ؟

مولانا جب یہاں واپس آئے تو اسٹاف اور طالب علموں نے ان کا

واپسی پر بہت عزت اور احترام کے ساتھ خیر مقدم کیا - اُن کی آمد کی خوشی میں پر تکلف دعوتیں دیں - ایک بڑی دعوت میں مولانا نے ایک نظم فارسی میں پڑھی جو مجھے یاد نہیں اور نہ اس کی کوئی نقل میرے پاس ھے لیکن " ھمانست کہ بود " کے الفاظ پر تمام شعر ختم ہوتے تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ جب میں یہاں سے گیا تھا جو چیزیں میں نے جس حالت میں چھوڑی تھیں اُسی حالت میں ان کو آکر پایا - اُن کی سوانح حیات میں اس نظم کا کوئی پتہ نہیں چلتا اور نظمیں ھیں جن کو ھر شخص دیکھ سکتا ھے - یہاں آنے کے بعد مولانا اپنے فرض منصبی کے ادا کرنے میں مشغول ھو گئے اور بی - اے کلاس کو فارسی پڑھاتے رھے - اس دوران میں علی گڑھ میں کوئی ایسا عظیم الشان واقعہ نہیں ھؤا جس کی یاد قائم رکھنے کی ضرورت ھو -

۱۸۹۶ء میں مولانا نے ارادہ ظاھر کیا کہ وہ کالج کی نوکری چھوڑ کر ندوہ میں جا کر کام کریں گے - بیک صاحب پرنسپل کالج کو جب یہ معلوم ھؤا کہ مولانا کا ارادہ اس قسم کا ھے تو انہوں نے ایک طرف تو مولانا سے گفتگو کی اور دوسری طرف سر سید کے سامنے ان کے بارے میں ایک تجویز پیش کی - مسٹر بیک نہیں چاھتے تھے کہ مولانا جیسا لائق آدمی ھمارے یہاں سے چلا جائے وہ مولانا کو روکنا چاھتے تھے لیکن مولانا ارادہ کر چکے تھے کہ وہ ندوہ ھی میں جا کر کام کریں گے - مولانا کی مستقل رائے کو توڑنے کے لئے مسٹر بیک نے یہ تجویز کی کہ مولانا صاحب کو ھر سال چھ مہینے کی رخصت پوری تنخواہ پر دی جاوے تاکہ اُس زمانے میں وہ ندوہ کا کام کریں باقی چھ ماہ ھمارے کالج سے اُن کا تعلق رھے گا - مولانا شبلی نے اس تجویز کو با دل ناخواستہ منظور کر لیا تھا اور سر سید نے بھی منظوری دے دی تھی لیکن اس کے بعد ۱۸۹۸ء میں سر سید کا انتقال ھو گیا اور ۱۸۹۹ء میں مسٹر بیک کا بھی انتقال ھو گیا اور مجھے یاد نہیں رھا کہ مسٹر بیک کی تجویز اور سر سید کی منظوری پر ان دونوں صاحبوں کے بعد بھی عمل ھوتا رھا یا نہیں - لیکن یہ ضروری خیال ھوتا تھا کہ ان کی علمی قابلیت کی دھاک کالج

میں ۱۸۹۸ء تک قائم رہی اور اس کے بعد جہاں تک مجھے خیال ہے مولانا نے کالج کی نوکری ترک کر دی ۔ اور یہاں سے چلے گئے وہ اپنے وقار کے نقش کالج پر چھوڑ گئے ۔ اُن کے طالب علم اُن سے بہت خوش تھے نواب محمد اسماعیل خاں صاحب رئیس دتاولی ان کی بے انتہا عزت کرتے تھے نواب محسن الملک مرحوم بھی مولانا کی علیحدگی سے مطلق رضا مند نہیں تھے ۔

مولانا کے اوج پر پہنچنے کا راز اُن کے ندوہ کے کاموں میں پوشیدہ ہے ۔ ندوہ کو انہوں نے ایک نہایت مستقل اور کار آمد ادارہ بنا دیا ۔ اعظم گڑھ میں ایک دارلمصنفین کا ادارہ بھی قائم کیا جو اب تک برابر کام کر رہا ہے ۔ ندوہ العلماء نے جو کچھ بھی کیا اس کا دائرہ فقط علماء تک محدود تھا ۔

مولانا شبلی مرحوم منجملہ ان علماء کے تھے جن کے دل میں ندوۃ العلماء کا خیال پیدا ھؤا اور اس میں سب سے بڑا حصہ مولانا شبلی کا تھا مولانا نے شروع شروع میں ایک مرتبہ کسی دوسرے مولوی کا خط میرے اور دو تین طالب علموں کے سامنے پڑھا اور لکھنے والے کے خیالات اور حالات پر اظہار افسوس کیا ۔ اس مولوی نے ان کو لکھا تھا کہ ندوہ کے خیال کے آپ شروع میں سب سے زیادہ حامی تھے اب آپ کی کچھ تشکیل سامنے دکھائی دے گئی ہے لیکن مولوی محمد علی صاحب کانپوری اس کو اپنی جاگیر سمجھنے لگے ھیں اور آپ کے کاموں پر حادی ہوگئے ھیں ۔ میری رائے یہ ہے کہ اگر آپ اس کو اپنے ھاتھ میں لینے کو تیار ھیں تو میں آپ کے ساتھ شریک ھو جاؤں گا ۔ جب ھم دونوں کا اثر ھوجائے گا تو مولوی محمد علی یا تو خود چھوڑ دیں گے یا انہیں نکال دیں گے ۔ مولانا نے افسوس کیا کہ ھمارے علماء کی یہ حالت ہے ۔ دنیا تو ان کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال نکال کر پھینک رہی ہے لیکن علماء کی نیت اس قسم کی ہے جو کہ اس خط سے ظاھر ھوتی ہے ۔

مولانا نے ایک کانفرنس کے جلسہ میں دھلی میں مجھ سے کہا کہ

میں ندوہ کے انتظام کے لئے قواعد بنانا چاہتا ہوں اور تمہاری نسبت مجھ کو معلوم ہے کہ تم بہت اچھے قواعد بنا سکتے ہو اس لئے میرے پاس گھنٹہ دو گھنٹہ اجمیری دروازہ کے مدرسہ یا اس کی مسجد میں بیٹھ جاؤ تو ہم دونوں ان قواعد کو ٹھیک کر لیں ۔ مجھے شہر میں کچھ کام تھا لیکن میں نے کہا کہ مولانا میں آپ کے کام کو شہر کے کام پر ترجیح دیتا ہوں اور میں ضرور آکر بیٹھوں گا چنانچہ وہ قواعد لے کر میرے ساتھ جہاں تک مجھے یاد ہے اوپر کی منزل میں بیٹھ گئے اور کوئی نو بجے صبح سے ایک بجے دوپہر تک برابر قواعد بناتے ہی گئے اور بنے ہوئے قواعد کو ترتیب بھی دی گئی اور جب بن چکے تو کہا کہ ہمارے کام میں یہ تمہارا حصہ ہے ۔ اس کے لئے میں شکر گذار ہوں میں نے ہنس کر کہا کہ مولانا یہ تو ایک چھوٹے سے گروہ کے لئے آپ اتنا وقت دے رہے ہیں اور نہ معلوم ہندوستان میں کتنے علماء ہوں گے جن کے لئے آپ اس قدر مشقت برداشت کر رہے ہیں اور آپ کے علماء تو ہم لوگوں کو مثل جانورں کے سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عام لوگ مثل جانوروں کے ہیں یعنی ہم لوگ جانور ہوتے ہیں اُن کے کاموں میں دل چسپی لینے کی کوئی وجہ نہیں ہے ۔ مولانا نے کہا کہ ندوہ کا مطمح نظر یہی ہے جو خیالات اس وقت علماء کے دل میں بیٹھے ہوئے ہیں وہ مشترکہ کوشش سے اُن کے دلوں سے نکالے جاویں ۔ اور ان کو قوم کی ایک جماعت بنائی جاوے اور جو خود اپنے کو قوم سے برتر اور اعلیٰ سمجھتے ہیں ان کی یہ بات سخت غلطی پر مبنی ہے ۔ میں نے کہا کہ مولانا اگر یہ مقصد ہے تو آپ کا ندوہ بڑی مفید جماعت ثابت ہو گی ۔ مجھے مطلق معلوم نہیں کہ مولانا مرحوم کی اعلیٰ امیدیں بار آور ہوئیں یا نہیں لیکن اس میں شبہ نہیں کہ جن امیدوں کو سامنے رکھ کر ندوہ قائم کیا گیا تھا وہ امیدیں بہت اچھی ہی تھیں ۔

مولانا شبلی مرحوم ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسوں میں نظم بھی پڑھا کرتے تھے اور ریزولیوشنوں کی بحثوں میں بھی شرکت فرمایا کرتے تھے ایک مرتبہ دھلی میں کانفرنس کا جلسہ ہؤا جس کے صدر ہزھائی نس

سر آغا خاں مرحوم تھے ۔ مولانا نے ایک نظم پڑی تھی جو مجھے یاد نہیں لیکن ایک شعر کا مطلب یاد ہے کہ آغا خاں کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ خوجوں کے خدا ہمارے ناخدا ھیں جس کی نسبت بعد میں ھزھائی نس نے اپنے دوستوں سے کہا تھا کہ شبلی تو بڑا ھوشیار آدمی ھے انہوں نے لفظ کلیور (Clever) استعمال کیا تھا ۔ مولانا سے ایک مرتبہ اله آباد میں میری ملاقات ھوئی جب کہ وہ علی گڑھ کالج سے اپنا تعلق قطع کر کے یہاں سے چلے گئے تھے اور اپنے برادر حقیقی محمد اسحاق صاحب ایڈوکیٹ کے گھر پر مقیم تھے ۔ مولانا مٹھاس کھانے کے بہت ھی زیادہ شوقین تھے ایک آب خورہ میں ان کے پاس دانه دار شکر رکھی ھوئی تھی وہ برابر اس میں سے دانے اٹھا اٹھا کر اپنے منه میں ڈالتے جاتے تھے اور ھر وقت اپنا منه میٹھا رکھتے تھے ۔ میں نے کہا کہ مولانا آپ چیونٹی کی تقلید کر رھے ھیں یا چیونٹی آپ کی تقلید کرتی ھے چیونٹی بھی ھر وقت شکر میں نظر آتی ھے اور اپنا منه میٹھا رکھتی ھے انہوں نے فرمایا کہ یه تو ٹھیک ھے کہ مجھ میں چیونٹی کی سی عادت ھوگئی ھے لیکن وہ شکر کھاتی بھی ھے اور لوگوں کو کاٹتی بھی ھے میں صرف شکر کھاتا ھوں کسی کو کاٹتا نہیں ۔ اسی موقع پر انہوں نے کہا تھا کہ اب سیرت کا کام چھپنا شروع ھوگیا ھے میں نے کہا کہ مولانا جب آپ المامون وغیرہ لکھ رھے تھے اس وقت اگر لکھنا شروع کرتے تو اس وقت مسلمانوں کی قوم ایک بڑے لٹریچر کی مالک ھو جاتی ۔ مولانا نے فرمایا کہ ھر کام کے لئے وقت مقرر ھے اس کام کے لئے یہی وقت ھے لیکن میرا پیٹ اب خراب ھوگیا ھے کھانا ٹھیک ھضم نہیں ھوتا میرے سیرت لکھنے کے کام میں اور میرے پیٹ میں ایک بحث و مباحثه ھو رھا ھے دیکھئے کون جیتا ھارتا ھے پیٹ اگر جیت گیا تو میں اس بڑے کام کی تکمیل نہیں کر سکوں گا اور اگر میرا ارادہ خدا نے پورا کر دیا تو قوم کے لئے ایک چیز پیدا ھو جائے گی ۔

مولانا شبلی مرحوم مولوی تو تھے لیکن کٹھ ملا نہیں تھے ۔ مولوی سلیمان صاحب ندوی نے ان کو سر سید کے مد مقابل اور ان کے خیالات

سے انحراف کرنے والا ثابت کیا ہے لیکن میں واقفیت کی بناء پر کہہ سکتا ہوں کہ ندوی صاحب کی غلطی تھی اس میں شبہ نہیں کہ مولانا کے دل میں کانگرس کی وقعت تھی ۔ ایک مرتبہ محمڈن ایجوکیشن کانفرنس اور کانگریس کے متعلق کچھ بات ہو رہی تھی تو مولانا کی زبان سے یہ نکلا کہ ہاں کانگریس ہندوستان میں ملک کے لئے کسی وقت بہت مفید کام انجام دینے کے قابل ہو جائے گی ۔ سر سید کو جو کانگریس سے اختلاف تھا اس میں مولانا مرحوم سر سید کے ہم خیال نہیں تھے لیکن ندوی صاحب نے اُن کے ان خیالات کو بات کا بتنگڑ بنا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ سر سید میں اور مولانا شبلی میں بہت بڑا اختلاف کانگریس کے بارے میں تھا اور مولانا اُن کی مخالفت کرتے رہے اور دونوں میں کبھی اتفاق نہیں ہؤا اور ندوی صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ سر سید میں اور مولانا شبلی میں بات بات پر نوک جھونک ہؤا کرتی تھی میرے نزدیک سید سلیمان ندوی مرحوم کی یہ جسارت قابل اصلاح ہے اور اگر کوئی شخص محنت کر کے ’’ حیات شبلی ‘‘ یعنی مولانا کی سوانح حیات پر نظر ثانی کرے اور ندوی صاحب کے خیالات کو خارج کر دے تو سر سید کے متعلق جو الفاظ ان کی زبان سے نکلے تھے تو پھر ’’ حیات شبلی ‘‘ قابل عزت ہو جائے گی اور ممدوح قابل محبت کے ہوجائیں گے ۔

دارالمصنفین اور اس کی خدمات

سید صباح الـدین - ایم - اے

دارالمصنفینؔ شبلی اکیڈمی علامہ شبلی مرحوم کی وفات کے بعد ان کی آخری وصیت کے مطابق ان کے پیش نظر علمی کاموں خصوصاً سیرت النبی کی تکمیل کے لئے نومبر ۱۹۱۴ء میں قائم ہؤا - یہ ایک خاص علمی و تحقیقاتی ادارہ ہے - جس کے مقاصد حسب ذیل ہیں :

(۱) ملک میں اعلیٰ مصنفین اور اہل قلم کی جماعت پیدا کرنا -

(۲) بلند پایہ کتابوں کی تصنیف و تالیف و ترجمہ کرنا -

(۳) علمی کتابوں کے طبع و اشاعت کا سامان کرنا -

اس ادارہ سے متعلق ایک وسیع کتب خانہ ، ایک پریس اور ایک دارالاشاعت ہے - کتب خانہ عربی ، فارسی ، انگریزی اور اردو کی تقریباً بارہ ہزار منتخب کتابوں پر مشتمل ہے - جس میں بعض قلمی نوادر بھی ہیں - اور یہاں مشرقی و مغربی علوم کے ماہرین کی ایک جماعت مذہب اسلام ، اسلامی تاریخ ، اسلامی علوم ، اردو زبان و ادب ان کے متعلق تحقیقات ، تالیف و تصنیف ، مغربی زبانوں اور جدید علوم کی مفید کتابوں کے ترجمے وغیرہ کے کام انجام دیتی رہتی ہے - اور کچھ طلبا کی علمی تربیت بھی کرتی ہے - اب تک دارالمصنفین مختلف علوم و فنون کی ۸۸ بلند پایہ کتابیں تالیف و ترجمہ کر کے شائع کر چکا ہے اور یہاں کے تربیت یافتہ مصنفین اور اہل قلم کی ایک جماعت مختلف مقاموں میں مفید علمی و تعلیمی خدمات میں مصروف ہے -

دارالمصنفین کی بعض کتابوں مثلاً سیرت النبی ، سیرالصحابہ اور سلسلہ تاریخ اسلام ، شعرالہند ، گل رعنا - سیرت عائشہ وغیرہ کو پورے ہندوستان میں شہرت و مقبولیت حاصل ہے - سیرت النبی کا جواب دنیا

کی کسی زبان میں نہیں ہے ۔ اس کی تصانیف کو نہ صرف ہندوستان بلکہ اسلامی دنیا میں اس قدر اعتماد و حسن و قبول حاصل ہے کہ اس کی متعدد کتابوں کا ترجمہ دوسری زبانوں میں ہو چکا ہے ۔ سیرت النبی اور الفاروق کا ترکی ترجمہ استنبول سے شائع ہؤا ہے ۔ جامعہ اظہر مصر کے علماء نے سیرت النبی کا ترجمہ عربی میں کرنے کا ارادہ کیا ۔ الفاروق کا ترجمہ انگریزی میں بھی شائع ہو چکا ہے ۔ شعرالعجم کا فارسی ترجمہ افغانستان اور ایران دونوں نے مل کر کیا ہے ۔ مولانا سید سلیمان ندوی کی مشہور کتاب خیام کو فردوسی کی ہزار سالہ برسی کے موقعہ پر حکومت افغانسان نے حکومت ایران کو تحفہ میں پیش کیا تھا ۔ شعرالعجم، شعرالہند، گل رعنا ، تاریخ اسلام ، انقلاب الامم اور ابن خلدون وغیرہ بہت سی کتابیں پاکستان و ہندوستان کی یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہیں ۔

دارالمصنفین کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے مذہب اسلام ۔ اسلامی تہذیب و اسلامی تاریخ اور مسلمانوں کے لائق فخر علمی و تمدنی کارناموں کو ایسے صحیح محققانہ اور دل نشین انداز میں پیش کیا کہ علمائے حق نے بھی اس کو تحسین کی نظروں سے دیکھا اور معترضین و منکرین بھی ان کی عظمت ماننے پر مجبور ہو گئے اور یورپ کے مستشرقین اور مصر و شام کے عیسائی فضلا تک اس کے علمی کاموں کا لوہا مانتے ہیں ۔ اور اسلامی علوم پر اس کی تحقیقات سے فائدہ اٹھاتے ہیں ۔ جس کا ثبوت ایڈورڈ براؤن کی لٹریری ہسٹری آف پرشیا اور مصر کے نامور اہل قلم جرجی زیدان کی کتابوں سے مل سکتا ہے ۔ دارالمصنفین میں نکلسن ، براؤن اور بعض دوسرے مستشرقین کے وہ خطوط محفوظ ہیں جن میں انہوں نے اس کے کاموں کی عظمت کا اعتراف کیا ہے ۔ دارالمصنفین کی تصنیفات نے تالیف و تصنیف کا ایک میعاری نمونہ قائم کر کے ملک کا مذاق بدل دیا ۔ جس سے اردو کے تمام سنجیدہ مصنفین اور اہل قلم متاثر ہوئے اور عام طور سے اس کی تقلید کی جانے لگی ۔

دارالمصنفین کی جانب سے ایک ماہانہ علمی رسالہ معارف نکلتا ہے ۔ جو اپنے بلند پایہ تحقیقی مضامین کے اعتبار سے ہندوستان کے پرچوں میں

امتیازی حیثیت رکھتا ہے اور اس کے لکھنے والے ہندوستان کے مشاہیر اہل علم و قلم ہیں۔ اور ۱۹۱۵ء سے اب تک برابر شائع ہو رہا ہے۔ کسی مہینہ میں بھی اس کی اشاعت رکی نہیں۔

دارالمصنفین کے علمی شعبہ میں مصنفین اور رفقاء علمی خدمات انجام دیتے ہیں۔ مصنفین تو وہ اہل قلم اور اصحاب علم ہیں جو کسی فن میں امتیاز خاص اور فن تصنیف و تالیف میں مہارت رکھتے ہیں اور دارالمصنفین میں قیام پذیر ہو کر تصنیف و تالیف اور دیگر مشاغل علمی میں مصروف ہیں۔ رفقاء وہ اہل علم اور اصحاب علم ہیں جو مجلس کو علمی و قلمی اعانت پہنچاتے ہیں۔ یہ حسب ذیل دو قسموں پر منقسم ہیں۔

(۱) رفیق اعزازی۔ وہ مشاہیر اہل قلم اور ارباب علم جو اپنے فضل و کمال میں ممتاز ہوں اور دارالمصنفین کو اپنے علمی مشوروں اور قلمی اعانتوں سے مستفید فرماتے ہوں۔

(۲) رفیق۔ وہ اصحاب ذوق جو تکمیل علم کے بعد فن تصنیف کے سیکھنے کی غرض سے دارالمصنفین میں بحصول وظائف مقیم ہوں۔

مصنفین اور رفقاء دارالمصنفین سے وظائف صرف اپنی ضروریات کو پورا کرنے کی خاطر لیتے ہیں۔ وہ کوئی بڑی تنخواہ کے امیدوار نہیں ہوتے۔ مثلاً علامہ سید سلیمان ندوی دارالمصنفین میں ۳۲ سال مقیم رہ کر علمی خدمات انعام دیتے رہے۔ لیکن ان کا زیادہ سے زیادہ وظیفہ ۲۵۰ روپے ماھانہ رہا۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے ۳۴ سال تک اس کی خدمت کی۔ لیکن آخر وقت میں ان کا وظیفہ ۱۷۰ روپے ماھانہ تھا۔ پہلے رفقاء کا وظیفہ ۲۵ روپے ماھانہ ہوتا تھا۔ اب گرانی کی وجہ سے ۶۰ روپے ماھانہ ہو گیا ہے۔ مصنفین کچھ زیادہ پاتے ہیں۔ یہاں جو بھی آتا ہے یا قیام کرتا ہے اس سے توقع کی جاتی ہے وہ ایثار و قربانی کر کے خالص علمی خدمت گذار بن کر رہے گا۔

اس ادارہ کے بانی اور پہلے ناظم مولانا سید سلیمان ندوی تھے۔ ان

کی کتاب ارض القرآن جلد اول سے دارالمصنفین کے تصنیفی کام کی ابتدا ہوئی - یہ ۱۹۱۵ءمیں شائع ہوئی ۱۹۱۸ء میں انہوں نے اپنے استاد مرحوم کی سیرت النبی جلد اول کو مرتب کر کے شائع کیا - اسی سال ان کی محققانہ تصنیف ارض القرآن کی دوسری جلد بھی شائع ہوئی - اس کتاب کی دونوں جلدوں کے چار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں - ۱۹۲۰ء میں مولانا شبلی کی سیرت النبی کی دوسری جلد شائع کی - پہلی جلد نبوت کے پرآشوب عہد و غزوات پر مشتمل تھی - دوسری جلد نبوت کے سہ سالہ امن کی زندگی کی تاریخ ہے - اسی سال سید صاحب کی سیرت عائشہ شائع ہوئی - اس کے اب تک چار ایڈیشن نکل چکے ہیں - اس کا فارسی اور ترکی میں بھی ترجمہ ہؤا - ۱۹۲۴ء میں سیرت النبی کی چوتھی جلد لکھ کر شائع کی - یہ معجزات پر مشتمل ہے - اسی سال مسلم ایجوکیشنل ایسوسی ایشن آف سودرن انڈیا کی دعوت پر سیرت نبوی کے مختلف پہلوؤں پر آٹھ خطبے دئے جو بعد میں خطبات مدراس کے نام سے شائع ہوئے - یہ خطبات اپنے مضامین، مباحث، ادب و انشاء اور زور خطابت کے لحاظ سے اردو لٹریچر کے شاہکار سمجھے جاتے ہیں - اس کے سات آٹھ ایڈیشن اب تک نکل چکے ہیں - اس کے چند خطبات کا انگریزی ترجمہ Living Prophet کے نام سے بھی شائع ہؤا ہے - ۱۹۲۹ء میں حضرت سید صاحب ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد میں عرب و ہند کے تعلقات پر لیکچرز دینے کے لئے مدعو کئے گئے - یہ لیکچرز تلاش و تحقیق محنت و کاوش اور حجت و استدلال کے اعتبار سے بے مثل سمجھے جاتے ہیں - ان کا انگریزی ترجمہ اسلامک کلچر حیدر آباد میں کئی سال تک شائع ہوتا رہا - ۱۹۳۲ء میں ان کی مشہور تصنیف سیرت النبی کی چوتھی جلد شائع ہوئی - جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ نبوت محمدی نے دنیا میں کس عظیم الشان اصلاح کا فرض انجام دیا - ۱۹۳۳ء میں ان کی معرکتہ الآرا تصنیف خیام شائع ہوئی - اس سے خیام ایک بالکل نئے رنگ میں ظاہر ہوتا ہے - اس تصنیف کی داد ہندوستان سے لے کر ایران، کابل اور یورپ تک کے فضلاء نے دی - فردوسی کی ہزار سالہ برسی کے موقع پر افغانستان نے ایران کو جو تحائف

دئے ان میں ایک تحفہ 'خیام' بھی تھا - ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد نے اس پر پانچ سو روپے کا انعام دیا - ڈاکٹر سر اقبال نے اس کتاب کو پڑھ کر سید صاحب کو ایک مکتوب میں لکھا " کہ عمرو خیام پر آپ نے جو کچھ لکھ دیا ہے اس پر اب کوئی مشرق یا مغربی عالم اضافہ نہ کر سکے گا -" ۱۹۳۵ء میں ان کی تصنیف سیرت النبی کی پانچویں جلد شائع ہوئی - اس کا موضوع عبادات ہے - اس وقت تک سیرت النبی کی جلدیں ہند اور بیرون ہند میں بہت مقبول ہو چکی تھیں - ہندوستان میں اس کی مانگ بہت بڑھ گئی تھی - اور ہر جلد کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہوئے - ترکی میں اس کی تین جلدوں کا ترجمہ ہؤا - فارسی میں بھی سیرت النبی کی چند جلدوں کا ترجمہ کابل میں کیا گیا - مکہ معظمہ اور مصر میں اس کے عربی ترجمہ کا خیال ہؤا - ۱۹۳۹ء میں ان کی سیرت النبی کی چھٹی جلد بھی شائع ہوئی - جو اسلام کی اخلاقی تعلیمات پر مشتمل ہے - یہ سیرت کے سلسلہ کی بڑی اہم اور آخری جلد ہے - یوں تو تمام جلدیں جدید علم کلام کی اساس ہیں - اسی سال ان کی کتاب نقوش سلیمانی بھی شائع ہوئی - یہ ان خطبوں اور تحریروں کا مجموعہ ہے جو اردو ادب و زبان سے متعلق سید صاحب کے قلم سے نکلے - یہ گویا پچھلی چوتھائی صدی کی ادبی تحریکوں کا ایک مرقع ہے - اس لئے ہندوستان اور پاکستان کی یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہے - ۱۹۴۰ء میں انہوں نے بچوں کے لئے 'رحمت عالم' لکھی - جس میں سلیس اور آسان زبان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک لکھی - ۱۹۴۰ء میں ہی مسلم یونیورسٹی نے ان کو ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری عطا کر کے ان کی وسیع اور گونا گون علمی خدمات کا اعتراف کیا - ۱۹۴۳ء میں انہوں نے ۸۴۶ صفحے کی " حیات شبلی " لکھ کر اپنے استاد کو خراج عقیدت پیش کیا - یہ ضخیم کتاب ایک شخص کی سوانح عمری ہی نہیں بلکہ مسلمانان ہند کے پچاس برس کی علمی ، ادبی ، سیاسی ، تعلیمی ، مذہبی اور قومی واقعات کی تاریخ بھی ہے - اس پر ہندوستان اکیڈمی نے پانچ سو روپے کا انعام بھی دیا - سید صاحب نے مولانا

شبلی کے مختلف مضامین ، خطبات اور مکتوبات کو بھی جمع کر کے گیارہ جلدوں میں شائع کیا ہے - جن کی تفصیل حسب ذیل ہے :-

(۱) مقالات شبلی جلد اول ، مذھبی ۱۹۳۰ء

(۲) مقالات شبلی جلد دوم ، ادبی ۱۹۳۱ء

(۳) مقالات شبلی جلد سوم ، تعلیمی ۱۹۳۲ء

(۴) مقالات شبلی جلد چہام ، تنقیدی ۱۹۳۴ء

(۵) مقالات شبلی جلد پنجم ، تاریخی حصه اول ۱۹۳۶ء

(۶) مقالات شبلی جلد ششم ، تاریخی حصه دوم ۱۹۳۷ء

(۷) مقالات شبلی جلد ھفتم ، فلسفیانه ۱۹۳۸ء

(۸) مقالات شبلی جلد ھشتم ، قومی ۱۹۳۸ء

(۹) خطبات شبلی ۱۹۴۱ء

(۱۰) مکاتیب شبلی جلد اول ۱۹۲۰ء

(۱۱) مکاتیب شبلی جلد دوم ۱۹۳۷ء

مولانا سید سلیمان ندوی کا انتقال ۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء میں کراچی میں ھؤا -

دارالمصنفین اور ملک کے بھی اھم مصنف مولانا عبدالسلام ندوی تھے - جنھوں نے ایک قلیل تنخواہ پر علم و ادب کے خدمت گذار بن کر ۳۴ سال تک دارالمصنفین کی خدمت کی - وہ حسب ذیل کتابوں کے مصنف ھیں - مضامین جو معارف میں شائع ھوتے رھے ان کی تعداد گنی نہیں جا سکتی -

(۱) اسوۂ صحابہ جلد اول و دوم : اس کے اب تک پانچ اڈیشن نکل چکے ھیں - دارالمصنفین کی مقبول ترین کتابوں میں سے یه بھی ہے -

(۲) اسوہ صحابیات : اس میں ازواج مطہرات بنات طاھرات اور عام صحابیات کے اخلاق و معاشرت کے متعلق موثر واقعات ھیں ، اس کے بھی

کئی اڈیشن نکل چکے ہیں (۱۹۳۵ء)

(۳) سیرۃ عمر بن عبدالعزیز ، اس میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کی فقیرانہ زندگی اور عادلانہ حکومت کے واقعات اس مؤثر طریقہ سے بیان کئے گئے ہیں۔ کہ مسلمانوں کے ایمان میں تازگی اور غیر مسلمانوں میں اسلام کی عظمت کا نقش قائم ہو جاتا ہے۔ اس کے بھی کئی اڈیشن شائع ہو چکے ہیں (۱۹۲۹ء)۔

(۴) شعرالہند حصہ اول و دوم : آب حیات کے بعد شعر الہند اردو شعرا کا پہلا جامع تذکرہ ہے جس سے اردو شاعری کے تمام رخ سامنے آجاتے ہیں، یہ وہ کتاب ہے جس نے ملک میں اردو شاعری سے متعلق ذوق بنایا ہے۔ اس کے چھ ایڈیشن نکل چکے ہیں، اور ہند و پاکستان کی یونیورسٹیوں میں نصاب میں داخل ہے۔

(۵) انقلاب الامم : یہ کتاب مشہور فرانسیسی عالم و مفکر گستاولی لی بان کی کتاب کا ترجمہ ہے۔ ان میں نفسیاتی اصول اور اخلاق قوانین کی تشریح کی گئی ہے جن سے قوموں کی ترقی اور ان کا تنزل وابستہ ہوتا ہے۔ یہ ترجمہ بھی بہت مقبول ہؤا اور یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہے۔

(۶) تاریخ فقہ اسلامی : یہ مصر کے ایک فاضل محمد خضری کی کتاب "التشریح الاسلامی" کا خلاصہ ہے۔ یہ فقہ اسلامی کی مکمل تاریخ ہے (۱۳۴۶ء)۔

(۷) ابن خلدون : مصر کے نامور فاضل ڈاکٹر طه حسین کی کتاب کا ترجمہ ہے۔

(۸) القضاۃ فی الاسلام : اس میں اسلام کا نظام عدالت ہے۔

(۹) تاریخ اخلاق اسلامی : اس میں عہد نبوت میں .س طرح اسلامی اخلاق کی تعمیر و تشکیل عمل میں آئی۔ اس کی تفصیل ہے (۱۹۳۹ء)۔

(۱۰) امام رازی : اس میں امام فخرالدین رازی کی تصانیف پر تبصرہ اور ان کے فلسفہ علم ، کلام اور نظریات و خیالات کی تشریح ھے (۱۹۵۰ء)۔

(۱۱) اقبال کامل : یہ کتاب اقبالیات کے ہر پہلو پر حاوی ھے ، اور جن معلومات کے لئے ہزاروں صفحات کی ورق گردانی کرنی پڑتی ھے۔ وہ اقبال کامل میں ایک جگہ مل جاتی ھیں (۱۹۴۸ء)

(۱۲) حکمائے اسلام : حصہ اول و دوم۔ اس میں مسلمانوں کی پوری تاریخ ھے ، ۱۹۵۳ و ۱۹۵۶ء۔

مولانا عبدالسلام ندوی کا انتقال ۴ اکتوبر ۱۹۵۶ء کو اعظم گڑھ میں دارالمصنفین ھی میں ہؤا اور وہ مولانا شبلی کے مزار کے پاس دارالمصنفین کے احاطہ ھی میں مدفون ھیں۔

حاجی مولانا معین الدین ندوی کا قیام دارالمصنفین کے ابتدائی دور میں تھوڑے دنوں تک رہا اور انہوں نے حسب ذیل کتابیں لکھیں:

(۱) خلفائے راشدین : یہ کتاب بہت مقبول ھے ، اس کے تین اڈیشن نکل چکے ھیں ۱۹۴۶ء

(۲) مہاجرین جلد اول ۱۳۴۶ء

وہ آخر زندگی میں مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے پرنسپل ہو گئے تھے۔ اور وھیں ۱۹۴۰ء میں انتقال کیا۔

مولانا ابوالحسنات ندوی بھی دارالمصنفین کے ابتدائی دور میں رہے اور وہ صرف ایک کتاب '' ہندوستان کی اسلامی درسگاھیں'' لکھنے پائے تھے کہ جوانی میں وفات پا گئے۔

دارالمصنفین کے ابتدائی دور میں مولانا سعید انصاری بھی تھے۔ انہوں نے یہاں کے قیام میں سیر انصار جلد اول و جلد دوم (۱۳۴۳ھ) اور سیرالصحابیات (۱۳۴۱ھ) لکھیں ، آج کل وہ لاہور میں انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے لکھے جانے والوں کے اسٹاف میں ھیں۔

جناب سید نجیب اشرف صاحب ندوی ایم - اے ۱۹۲۱ سے ۱۹۳۰ تک دارالمصنفین میں رہے - اور انہوں نے رقعات عالمگیر کی ایک جلد ترتیب دی اور پھر ''مقدمہ رقعات عالمگیر'' لکھا - جس میں عالمگیر کی ولادت سے برادرانہ جنگ تک کے تمام واقعات پر تنقیدی بحث کی گئی ہے - وہ دارالمصنفین سے جا کر اسمعیل کالج اندھیری بمبئی میں پروفیسر ہو گئے - اب وہاں سے ریٹائر ہو کر انجمن الاسلام آردو انسٹیٹوٹ بمبئی کے ڈائرکٹر ہیں - مولانا عبدالباری ندوی بھی دارالمصنفین کے ابتدائی دور میں دو سال تک یہاں مقیم رہے - اور ان کی حسب ذیل کتابیں دارالمصنفین سے شائع ہوئی ہیں:

(۱) برکلے اور اس کا فلسفہ -

(۲) مبادی علم انسانی -

(۳) فہم انسانی: یہ ڈیوڈ ہوم کی مشہور کتاب ہیومن انڈراسٹینڈنگ کا ترجمہ ہے - وہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں فلسفہ کے پروفیسر ہو کر یہاں سے چلے گئے اور وہیں سے ریٹائر ہوئے -

مولانا سید ریاست علی ندوی - وہ دارالمصنفین میں ۱۹۲۴ سے ۱۹۴۹ تک رہے اور حسب ذیل کتابیں لکھیں:

(۱) تاریخ صقلیہ حصہ اول و دوم ۳۷-۱۹۳۶ -

(۲) تاریخ اندلس - آج کل وہ مدرسہ شمس الھدیٰ پٹنہ، پٹنہ یونیورسٹی، کے پرنسپل ہیں -

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی ۱۹۲۴ سے اب تک دارالمصنفین ہی میں مقیم ہیں اور حسب ذیل کتابوں کے مصنف ہیں:

(۱) سیرالصحابہ جلد ششم ۱۹۳۲

(۲) سیرالصحابہ جلد ہفتم ۱۹۳۳

(۳) مہاجرین جلد دوم ۱۹۳۰

(۴) تابعین ۱۹۳۷

(۵) تاریخ اسلام جلد اول ۱۹۳۹ ، دوم ۱۹۴۱ ، سوم ۱۹۴۴ ، چہارم ۱۹۴۶ یہ ہندوستان و پاکستان کی یونیورسٹیوں میں نصاب میں داخل ہیں ، اور اس کے کئی اڈیشن نکل چکے ہیں -

(۶) عرب کی موجودہ حکومتیں ۱۹۳۳ -

(۷) اسلام اور عربی تمدن : شام کے مشہور فاضل علامہ کرد علی کی کتاب کا ترجمہ ہے -

آج کل یہ دارالمصنفین کے ناظم علمی ہیں -

مولانا ابوظفر صاحب ندوی ۱۹۳۵ سے ۱۹۳۹ تک دارالمصنفین میں مقیم رہے - اور تاریخ سندھ لکھی - جو ۱۹۴۷ء میں شائع ہوئی اور ان کی کتاب محمود غزنوی کا مسودہ یہیں ہے جو آئندہ شائع ہوگا -

سید صباح الدین عبدالرحمن ایم - اے - ۱۹۳۵ء سے برابر دارالمصنفین میں مقیم ہیں اور انہوں نے حسب ذیل کتابیں لکھیں :

(۱) " بزم تیموریہ " : اس میں ہندوستان کے مغل بادشاہوں کی علمی سرپرستی کے علاوہ ان کے دربار کے علماء و فضلا کا ذکر ہے - ۱۹۴۸ء -

(۲) " بزم صوفیہ " : اس میں عہد تیموریہ سے پہلے ہندوستان کے صاحب تصانیف صوفیائے کرام کا ذکر ہے - ۱۹۵۰ء -

" بزم مملوکیہ " : اس میں ہندوستان کے غلام سلاطین دربار کے علماء و فضلا کا ناقدانہ مطالعہ ہے - ۱۹۵۲ -

(۴) " ہندوستان کے ازمنۂ وسطیٰ کی ایک ایک جھلک " : اس میں سلاطین دہلی کے متعلق ہندو مؤرخوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کو جمع کر دیا گیا ہے ، جس سے ان کی سیرت ، کردار اور کارناموں کے تمام روشن پہلو سامنے آجاتے ہیں - ۱۹۵۷ء -

مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی ۱۹۴۹ء سے دارالمصنفین میں

مقیم ھیں۔ ان کی ایک کتاب اھل کتب صحابہ ۱۹۵۴ء میں شائع ھوئی ھے۔

مولوی ضیاءالدین اصلاحی ابھی زیر تربیت ھیں۔

دارالمصنفین کے تمام مصنفین اور رفقاء اس کے احاطہ ھی میں رھتے ھیں اور علمی خدمات میں لگے رھتے ھیں۔ پانچ سال کی تربیت کے بعد ایک رفیق مصنف ھوتا ھے۔ رفیق اعزازی کے طور پر وہ مشاھیر اھل علم اور ارباب علم لئے جاتے ھیں جو اپنے فضل و کمال میں ممتاز ھوں۔ ان کا اعظم گڑھ میں مقیم ھونا ضروری نہیں۔ بیرونی مصنفین کی کتابیں بھی معقول معاوضے دے کر سلسلہ دارالمصنفین میں شائع ھؤا کرتی ھیں۔

اس کی نگرانی کے لئے دو مجلسیں ھیں۔ (۱) مجلس ارکان اور مجلس انتظامیہ مجلس ارکان مجلس انتظامیہ کے ماتحت ھے۔ مجلس انتظامیہ کے صدر ڈاکٹر سید محمود ھیں۔ اس کے پندرہ ممبر ھیں۔ مجلس ارکان کے صدر مولانا عبدالماجد دریا بادی ھیں۔ مجلس ارکان کے ممبر مجلس انتظامیہ ھی میں سے منتخب ھوتے ھیں۔ مجلس انتظامیہ جو ھدایت دیتی ھے اس کو مجلس ارکان عمل میں لاتی ھے۔

دارالمصنفین کو تقسیم ھند سے پہلے پانچ سو روپے ماھانہ حیدرآباد دکن اور دو سو روپے ماھانہ بھوپال کی ریاستوں سے ملتے تھے۔ یہ بند ھو گئے تو اس کی آمدنی کا دار و مدار صرف اس کی کتابوں کی بکری پر رہ گیا۔ پاکستان کے سکہ سے تبادلہ کی مشکلات اور تجارتی پابندیوں سے اس کی بکری پر بڑا اثر پڑا۔ پہلے پاکستان کے خریدار وی۔ پی، کے ذریعہ سے کتابیں جب اور جہاں سے چاھتے تھے منگوا لیتے تھے۔ اب یہ سہولت باقی نہیں رھی جس کی وجہ سے اس ادارہ کی تجارتی آمدنی پاکستان سے بہت کم ھو گئی۔ وھاں کی تجارت اب بڑے بڑے شہروں کے تاجروں ھی کے رحم و کرم پر رہ گئی ھے۔ اردو کتابوں کی مانگ اب زیادہ تر پاکستان ھی میں ھے۔ لیکن اس کا مارکیٹ ھاتھ سے نکلتا جا رھا ھے۔ اس لئے اس کی مالی حالت بیچ میں بہت خراب ھوگئی تھی۔

حکومت ہند نے ۱۹۵۳ء میں اس کو ساٹھ ہزار کی رقم عطا کی تو اس نے اپنا مالی توازن کچھ قائم رکھا۔ اب رفتہ رفتہ یہ اپنی مالی دشواریوں پر قابو پانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اگر پاکستان کی تجارتی پابندیوں میں کمی کر دی جائے تو اس کی مالی حالت سدھر جائے۔ اس کے لائف ممبروں میں سے پاکستان کے سابق گورنر جنرل جناب غلام محمد صاحب بھی تھے۔ پنڈت جواھر لال نہرو بھی اس کے لائف ممبر ھیں اور مولانا ابوالکلام آزاد اس ادارہ کے محسنوں میں سے ھیں اور اب بھی اس سے بڑی دلچسپی لے رہے ھیں۔ یہ ادارہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے منفرد ہے۔ ھندوستان و پاکستان میں شاید ھی کوئی ایسا علمی ادارہ ھو جس کے اپنے چوبیس گھنٹے کے مصنفین ھوں۔ اپنا پریس ھو، اپنا کتب خانہ ھو، اپنا دارالاشاعت ھو اور اپنی سب عمارتیں ھوں۔ یہ ادارہ چودہ گلبہ باغ میں ھے۔ یہ باغ مولانا شبلی نے خاص ادارہ کے لئے وقف کیا تھا، اور ۱۹۱۴ء سے ۱۹۵۷ء تک اس کے جو علمی کارنامے ھیں اس پر مسلمانوں کو بجا طور پر فخر ھو سکتا ہے۔ چنانچہ شاہ سعود جب حجاز سے ھندوستان آئے تھے تو اس کے کارناموں کی تفصیل سن کر دس ہزار روپے کا عطیہ بھجوا دیا تھا۔ حالانکہ اس ادارہ کی طرف سے ایسی کوئی خواھش ظاھر نہیں کی گئی تھی۔

مقالاتِ شبلی

عبیداللہ خاں ایم - اے

علامہ شبلی مرحوم نے جہاں بہت سی کتابیں تصنیف کیں اور علمی طور پر کئی ایسے کام انجام دئے جنہیں رہتی دنیا تک فراموش نہیں کیا جا سکتا وہاں انہوں نے بہت سے مقالات بھی سپرد قلم کئے - تاکہ وہ لوگ جو ان کی ان تصانیف کا مطالعہ نہ کر سکیں وہ کم سے کم ان مقالات سے ہی استفادہ کر سکیں - کیونکہ ان کا وہ اصلاحی مقصد اور اسلام سے محبت جس کے لئے وہ سب کچھ کرنے کو تیار نظر آتے ہیں ، ان کا وہ تحقیق و تحسین کا جذبہ جو قدرت نے فطرتاً ان میں ودیعت کیا تھا اور جو بچپن ہی سے ان میں کارفرما نظر آتا ہے اور جو انہیں اعظم گڑھ سے رواں رواں لاہور لے آتا ہے اور مولانا فیض الحسن جیسے علامہ زماں کے سامنے اس وقت زانوئے تلمذ تہہ کرنے پر اکساتا ہے جب وہ اس پیاس کو بجھانے کے لئے صرف پچیس روپے لے کر گھر سے نکل پڑتے ہیں اور لاہور پہنچ کر جب بالکل خالی ہاتھ ہو جاتے ہیں تو اپنے والد ماجد کو یوں لکھنے پر مجبور ہوتے ہیں -

" مرا* دو ماہ می گذرد کہ ترک وطن کردہ ام وبہ بے گانگاں بسر بردہ ام بست و پنج روپیہ عنایت شدہ بود سہ روپیہ بہ کرایہ یکہ از اعظم گڑھ تا جون پور رفت ، ہفت روپیہ ، صرف ریل تا بہ سہارنپور شدہ بود و پنج روپیہ از آنجا تا بہ لاہور ، دو روپیہ باقی می ماند ، اول کہ درین جا رسیدم دو یک روپیہ بہ حوائج ضروریہ کہ در وقت قیام جائے پیش می آمد صرف شد - مکانے بہ کرایہ یک روپیہ گرفتم ، دو ماہ را دو روپیہ کرایہ می شود ، انچہ باقی می ماند بہ صرف طعام آمد اگر

---

* حیات شبلی ص ۸۱ -

انصاف رود به چنداں کفایت بسر برده ام که بیش ازو متصور نیست چوں مزاج عالی اند کے برهمی داشت از تکلیف ارسال صرف باز ماندم اکنوں کار مشکل افتاده است ، دیگر چه گوئم ۔

ان کا یه جذبه ان کی رهنمائی کر رها تها ۔ اگر اس وقت انهیں فقر و فاقه کی زندگی بهی بسر کرنا پڑتی تو وه اسے خنده پیشانی سے قبول کرتے کیونکه وه کسی نه کسی طرح اپنے اصل مقصد کو حاصل کرنا چاهتے تهے ۔

عموماً علامه مرحوم کے بارے میں یه کہا جاتا هے که علی گڑھ کے قیام اور سر سید کی رفاقت نے انهیں شبلی بنایا لیکن میرے خیال میں یه خیال صحیح نہیں ۔ ان کا سن ولادت اور ان کا ماحول هی انهیں حقیقی طور پر شبلی بنانے اور ان مقالات کے لکھنے کا موجب هؤا هے ۔ اگر وه علی گڑھ نه بهی جاتے تب بهی وه اعظم گڑھ اور بندول هی کو علی گڑھ بنا دیتے اور اپنے اصلاحی مقاصد کی وجه سے مرجع خلائق بن جاتے ۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کی اس ناکامی کو جس میں وه انگریزوں کی بربریت کو پورے طور پر مطالعه کر چکے تهے اور جس میں وه اپنی قوم کی ناکامی کا سبب صرف یه سمجھتے تهے که قوم نے اسلاف کے کارناموں کو فراموش کر دیا تها اور قوم اسلام کی راه سے هٹ کر ایک ایسی راه پر گامزن هوگئی تهی جو نجات کا راسته نه تها ۔ وه خلوص سے یه چاهتے تهے که کوئی ایسا طریقه اختیار کریں جس سے قوم کا کهویا هؤا وقار لوٹ آئے ۔ حالانکه کچھ لوگ اس وقت بهی سیاسی طور پر شکست کها کر یه سمجھنے لگے تهے که همیں خاموش بیٹھ کر انگریز کے سامنے هتهیار ڈال دینے چاهئیں لیکن مولانا کا وه جذبۂ اسلامی جو ان کے سینه میں ایک لاوه پکا رها تها اس بات کا متقاضی تها که وه ان هی انگریزوں اور عیسائیوں سے جو طرح طرح سے اسلام کو نشانۂ ملامت بنا رهے هیں ، اس پر اعتراضات کی بوچھاڑ کر رهے هیں ، اس کے ماننے والوں کو عجیب عجیب قسم کے خطابات سے نواز رهے هیں اپنا لوها منوائیں اور اپنے کردار اور قابلیت سے یه ثابت کریں که ان معترضین کا خیال کتنا غلط هے

اور کس طرح غلط طور پر واقعات کو پیش کیا گیا ہے بلکہ حقیقت اور اصل کیا ہے۔ چنانچہ علامہ مرحوم نے علی گڑھ میں رہ کر انگریز پرنسپل اور انگریز اساتذہ سے نہ صرف اپنا لوہا منوایا بلکہ اپنے ان مقالات کے ذریعہ بہت سے ان اعتراضات کا بھی جواب دیا جو عیسائیوں کی طرف سے اسلام پر کئے جاتے تھے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جہاں انقلاب ۱۸۵۷ء کے حالات اور ماحول نے انہیں شبلی بنایا وہاں مسٹر بیک اور پروفیسر آرنلڈ کی رفاقت نے انہیں شبلی بننے اور اپنے قلم سے ایسی چنگاریاں بکھیرنے پر اکسایا جنہوں نے انگریزی ایوانوں میں زلزلہ پیدا کر دیا۔ علامہ مرحوم نے ان عیسائیوں کی موجودگی میں شدت سے محسوس کیا کہ جن کاموں کو ہمیں یعنی مسلمانوں کو انجام دینا چاہئے تھا اسے یہ لوگ انجام دے کر ترقی کی طرف قدم بڑھا رہے ہیں اور ہم اپنے مقام سے ہٹ کر پستی کی طرف جا رہے ہیں۔ لہذا مسلمانوں کو پھر ایک دفعہ ان کے اسلاف کے ان کارناموں سے روشناس کرایا جائے جن کی بدولت وہ تمام دنیا کو اپنا مطیع اور گرویدہ بنا چکے تھے۔ مولانا کا یہ عزم اس وقت اور پختہ ہو گیا جب وہ دوسرے ملکوں کی سیاحت کو گئے اور وہاں جا کر انہوں نے دیکھا کہ دنیا کی دوسری قومیں کیا کچھ کر رہی ہیں اور ہم ۱۸۵۷ء میں اغیار کے ہاتھوں جھنجوڑے جانے کے باوجود بھی خواب غفلت سے بیدار نہیں ہوئے ہیں۔

علامہ مرحوم نے اپنے ان مقالات کے لئے انہیں اخبارات اور رسائل کو چنا جو اس وقت تعلیم یافتہ طبقہ اور خصوصاً مسلمانوں میں پسند کئے جاتے تھے اور اس طرح کے مضامین شائع کرتے تھے۔ ان کے یہ مضامین جن کا میں اگلے صفحات میں جائزہ لینے کی کوشش کروں گا معارف علی گڑھ، دکن ریویو، انسٹی ٹیوٹ گزٹ، تہذیب الاخلاق، الندوہ اور مسلم گزٹ میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے۔ یہ مقالات ۸ جلدوں میں اعظم گڑھ سے شائع ہوچکے ہیں جنہیں اس طرح ترتیب دیا گیا ہے۔

جلد اول (مذہبی)
جلد دوم (ادبی)

جلد سوم (تعلیمی)
جلد چہارم (تنقیدی)
جلد پنجم (تاریخی حصہ اول)
جلد ششم (تاریخی حصہ دوم)
جلد ہفتم (فلسفیانہ)
جلد ہشتم (اصلاحی و سیاسی)

ان مقالات کا جائزہ لینے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان پر ایک تنقیدی طائرانہ نظر ڈال لی جائے۔

اس میں شک نہیں کہ علامہ شبلی مرحوم کا مقصد اصلاحی تھا لیکن ان کا یہ مقصد زبان و بیان پر حاوی نظر نہیں آتا بلکہ وہ بڑی خوبصورتی اور نزاکت سے اپنے مقصد کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ زبان میں مولویانہ اور واعظانہ انداز پیدا نہیں ہوتا بلکہ ان کا محققانہ انداز برابر باقی رہتا ہے اور زبان و بیان کی چاشنی کے ساتھ ساتھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ سمندر کی تہ میں سے نایاب موتی نکال نکال کر ببانگ دھل یہ کہہ رہے ہیں کہ ہے کوئی جو سمندر میں غوطہ لگا کر ہم سے زیادہ قیمتی موتی نکال کر پیش کر سکے۔

اگرچہ ان مقالات کی زبان ایک عالمانہ اور محققانہ زبان ہے لیکن پھر بھی ان میں اس نامانوسیت اور نقل کو دخل نہیں جو ہمارے یہاں کے علماء کے لئے مخصوص ہے۔ ان کا منطقیانہ انداز ان میں برابر جھلکتا نظر آتا ہے۔ وہ کسی بات کو یونہی سطحی اور واجبی طور پر نہیں بیان کرتے بلکہ جو بات کہتے ہیں اس کے لئے اپنے پاس دلائل و براہین رکھتے ہیں اور پڑھنے والا یوں محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک منطقی کی طرح ایک دعویٰ پیش کر کے اس کی دلیل لاتے ہیں اور صغریٰ و کبریٰ قائم کر کے اس طرح نتیجہ نکالتے ہیں کہ ہر ذی عقل اور غیر متعصب شخص اسے ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ مولانا کے قلم میں ایک توازن برابر قائم رہتا ہے۔ وہ اپنوں کے بارے میں لکھ رہے ہوں یا غیروں کے، کسی اعتراض کا جواب دے رہے ہوں یا کسی پر خود اعتراض

کر رہے ہوں وہ اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتے - ان کا کوئی سا مقالہ اٹھا کر دیکھئے اس میں ایک سنجیدگی اور رکھ رکھاؤ برابر نظر آئے گا اور وہ کہیں جذباتی ہوتے نظر نہیں آئیں گے بلکہ یوں محسوس ہو گا کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں بڑے اعتماد اور وثوق کے ساتھ کہہ رہے ہیں - مولانا شرر میں اور ان میں یہی فرق ہے کہ وہ کہیں کہیں جذبات کی رو میں بہ جاتے ہیں اور اپنے مضامین میں کبھی کبھی وہ توازن قائم نہیں رکھتے جو ایک محقق اور سچے مؤرخ اور سوانح نگار کے لئے ضروری ہے لیکن شبلی اس عیب سے بالکل پاک نظر آتے ہیں -

شبلی کا حب الوطنی اور نیشنلزم کا جذبہ بھی ہر جگہ کارفرما نظر آتا ہے - وہ جہاں عربوں کے کارناموں کا ذکر کرتے ہیں اور ترکوں اور عربوں سے محبت کرتے دکھائی دیتے ہیں وہاں وہ اپنے وطن کے لوگوں کو فراموش نہیں کرتے بلکہ بڑے فخر کے ساتھ ان کا تذکرہ کرتے ہیں - انہیں حرم پاک سے محبت ہے اور اس کے لئے اپنی جان تک قربان کرنے کو تیار ہیں لیکن کانپور کی مسجد کا حادثہ بھی انہیں ایک تماشائی کی طرح نہیں بیٹھنے دیتا بلکہ وہ اس کے لئے خون کے آنسو بہانے لگتے ہیں اور یہ کہنے پر مجبور ہوجاتے ہیں ع ہم کشتگان معرکۂ کانپور ہیں - یہی حب الوطنی کا جذبہ انہیں برادران وطن کے ساتھ اشتراک عملی کی طرف مجبور کرتا ہے اور وہ یہ چاہتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح ہمیں ایک بدیسی حکومت سے نجات مل جائے اور اپنے وطن پر اپنے لوگ حکومت کر سکیں -

ان مقالات میں جا بجا انگریزی کے الفاظ مثلاً ریمارک ، آئڈیل ، لکچر ، پوزیشن ، رپورٹ - ڈسکوریز ، پولیٹیکل ، اسپیشلسٹ ، پالیٹکس ، لٹریچر وغیرہ نظر آتے ہیں - اس کی وجہ یہی ہے کہ ایک تو انگریزی حکومت کے پاؤں مضبوط ہونے کے بعد نہ صرف ہماری روز مرہ کی زندگی بلکہ رہن سہن اور بول چال پر بھی اس کا اثر پڑ رہا تھا بلکہ ہر وہ شخص جو تھوڑی بہت انگریزی بھی جانتا تھا یہی کوشش کرتا تھا کہ بیچ بیچ میں انگریزی کے الفاظ بھی استعمال کرے - لیکن علامہ

مرحوم کے پیش نظر غالباً یہ چیز بھی تھی کہ وہ اردو زبان و ادب کو اس طرح وسیع بنا سکیں گے اور اردو کے خزانہ میں جہاں فارسی، عربی، پرتگالی اور سنسکرت وغیرہ کے سکے کھنکھنا کر ایک نئی جھنجھناھٹ پیدا کر رہے ھیں وھاں یہ انگریزی سکے اس خزانے میں مل کر مزید ایک نئی آواز پیدا کرنے کا موجب ھوں گے اور اردو زبان میں ایک نئی دلکشی پیدا ھو گی۔ علامہ شبلی نے جہاں کہیں بھی یہ الفاظ استعمال کئے ھیں وہ وھاں پر بھدے اور بے جوڑ معلوم نہیں ھوتے بلکہ وہ ایسے سلیقہ سے استعمال کئے گئے ھیں کہ انگوٹھی میں نگ کی طرح جڑے ھوئے نظر آتے ھیں اور جملوں کی ساخت اور زبان کی سلاست میں ذرا کمی واقع نہیں ھونے پاتی۔

اس عام بحث کے بعد اب علیحدہ علیحدہ ان مقالات پر بحث کرنا مناسب ھوگا۔ سب سے پہلے مقالات کی پہلی جلد کو لیجئے یہ جلد مذھبی مقالات پر مشتمل ھے۔ ان مقالات میں کچھ تو ایسے ھیں جن میں دوسروں کے اعتراضات کا جواب دیا گیا ھے مثلاً ”یورپ اور قرآن کے عدیم الصحۃ ھونے کا دعویٰ“ ”قرآن مجید میں خدا نے قسمیں کیوں کھائیں؟“ وغیرہ۔ اور کچھ ایسے مقالات ھیں جن میں اپنوں سے خطاب کیا گیا ھے اور ان کی بعض غلط فہمیوں کے ازالہ کی کوشش کی گئی ھے۔

۲۵ اپریل ۱۹۱۴ء کو لندن ٹائمز میں یہ دعویٰ کیا گیا تھا ”کہ قرآن مجید کے کچھ ایسے قدیم نسخے ھاتھ آئے ھیں جو اس قرآن سے مختلف ھیں اور جن کی صحت پر اس قرآن سے زیادہ اعتبار کیا جا سکتا ھے۔“ علامہ مرحوم نے جب یہ پڑھا تو عام مولویوں کی طرح اخبار پر پابندی لگانے اور جمعہ کی نماز کے بعد صرف قرار داد پاس کرنے پر اکتفا نہیں کیا انہوں نے اس کے جواب میں ایک مقالہ سپرد قلم فرما کر یہ ثابت کیا کہ ھمارا یہی قرآن صحیح ھے کیونکہ عرب کی قوت حافظہ، قرآن کے یاد رکھنے کی فضیلت، آنحضرت صلعم کی ترغیب و تاکید، قرآن مجید کی عبارت کی دلاویزی، تعلیم قرآن کا اھتمام یہ سب اسباب ایسے تھے جن کی وجہ سے خود آنحضرت صلعم ھی کے زمانہ میں پورا قرآن مجید

سیکڑوں اشخاص کو یاد تھا ۔ پھر یہ صرف ایک قرآن ہی کا معجزہ ہے کہ کروڑوں لوگ اس کے حافظ ہیں ۔ ایسی حالت میں لوگ کس طرح اصل چیز کو چھوڑ کر دوسری چیز یاد کر سکتے تھے جب کہ حضور صلعم خود زید بن ثابت اور دوسرے صحابہ کو قرآن کی سورتیں لکھایا کرتے تھے اور وہ یاد کر لیا کرتے تھے ۔

مخالفوں نے قرآن شریف پر اور اعتراضوں کے علاوہ ایک یہ بھی اعتراض کیا ہے کہ خدا تعالیٰ نے لوگوں کو قسمیں کھانے سے روکا ہے لیکن خود قسمیں کھائی ہیں ۔ مولانا نے اس کا جواب یہ دیا ہے اور مدلل طریقہ سے ثابت کیا ہے کہ دراصل جہاں جہاں قرآن میں قسمیں آئی ہیں اُن سے مراد شہادت اور گواہی ہے ۔ گویا خدا تعالیٰ چاند سورج اور ستاروں کی جب قسم کھاتا ہے تو اس طرح اُنہیں گواہ ٹھہراتا ہے ۔ گویا یہ چیزیں خدا تعالیٰ کی خدائی پر گواہی دے رہی ہیں اور اُس کی نشانیاں ہیں ۔

اس طرح اس جلد میں ایک مقالہ " علوم القرآن " کے عنوان سے ہے ۔ اس کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ پہلے لوگ کتنی عرق ریزی سے کام کرتے تھے کہ قرآن کریم کی ایک ایک باریکی اور نکتہ پر صفحات کے صفحات لکھ ڈالے تھے اور اُس کے اعجاز پر بڑی بڑی ضخیم کتابیں ملتی ہیں لیکن آج ہم ہیں کہ اور تو اور قرآن جیسی چیز کو جس پر ہماری نجات کا دارومدار ہے ، جو ہمارے لئے لائحۂ عمل کی حیثیت رکھتا ہے اُسے ہم کس طرح آہستہ آہستہ بھولتے جا رہے ہیں ۔ آج قرآنی مسائل پر تحقیق و تدقیق تو درکنار آج تو ہمارے بچے صرف برکت کے لئے بھی کتاب اللہ کو پڑھنے سے محروم رہتے ہیں حالانکہ پہلے لوگ قرآن کی فضاحت و بلاغت اور اس کی باریکیوں پر ایسی ایسی کتابیں لکھتے تھے کہ اُن سے قرآن کریم کے سمجھنے میں بڑی مدد ملتی تھی ۔ جاحظ نے تیسری ہجری میں اس موضوع پر قلم اُٹھایا ۔ پھر محمد بن فرید واسطی ، عبدالقاہر جرجانی ، رمانی ، خطابی ، ابن سراقہ اور قاضی ابو بکر باقلانی وغیرہ نے بسیط اور مفصل کتابیں لکھی ہیں ۔ اُنہیں بزرگوں کے

کارنامے مولانا کو بھی اس طرف توجہ دلاتے ہیں اور وہ اس موضوع پر اپنا قلم اٹھاتے ہیں۔ اس طرح کے مقالات پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ جہاں علامہ مرحوم کو تحقیق سے شغف تھا وہاں انہیں اس طرح کے مسائل سے کس قدر شیفتگی اور عشق تھا۔

تعدد ازواج پر ہمیشہ بحث ہوتی چلی آئی ہے۔ بہت سے اہل ہوس تو قرآن کریم کی آیت کے ایک حصہ کو اپنے لئے کافی سمجھ کر ہمیشہ دوسرے حصہ کو چھوڑ دیتے ہیں اور وہ ہمیشہ عدل سے دور ہی رہتے ہیں۔ اگر یہ کئی کئی شادیاں کرنے والے اپنے کرداروں میں اتنی بلندی پیدا کرتے کہ عدل کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے تو آج یہ ہماری اپوا کی بیگمات اٹھتے بیٹھتے یہ رٹ نہ لگاتیں کہ ایک سے زیادہ شادیوں کو قانوناً ممنوع قرار دیا جائے۔ علامہ نے اپنے مقالہ میں اس مسئلہ پر بھی بڑی احتیاط سے قلم اٹھایا ہے اور قرآن کے صحیح مفہوم کو سمجھانے کی کوشش کی ہے اور عدل پر بار بار زور دیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس سلسلہ میں خلیفہ منصور کی مثال بھی پیش کی ہے کہ جب اس کا ارادہ دوسری شادی کرنے کا ہوا تو اس کی بیوی کو بھی خبر ہو گئی اور اسے بہت رنج ہؤا چنانچہ اس نے خلیفہ سے کہا کہ ایک سے زیادہ شادی نا جائز ہے۔ خلیفہ نے بیوی کی تسلی کے لئے اور مذہبی حیثیت سے خبردار کرنے کے لئے امام ابوحنیفہ کو بلوایا اور ان سے معلوم کیا کہ مسلمان کے لئے کتنی بیویاں جائز ہیں۔ امام صاحب نے فرمایا چار۔ خلیفہ نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا (جو پردہ میں سے سن رہی تھیں) اور کہا امام صاحب کی رائے سن لی۔ حضرت امام ابو حنیفہ نے فوراً فرمایا لیکن خلیفہ منصور کے لیے ایک سے زیادہ شادی جائز نہیں۔ خلیفہ نے معلوم کیا کہ کیوں؟ امام صاحب نے فرمایا کہ تم نے جس انداز سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور جس طرح گفتگو کی اس سے میں قیاس کرتا ہوں کہ تم اس کے ساتھ عدل نہیں کرتے۔ اس لئے میں حکم دیتا ہوں کہ تم اسی پر قناعت کرو۔ اس مثال کو وہ اسی لئے پیش کرتے ہیں کہ ایک عام انسان تو کیا اگر خلیفہ وقت بھی اس شرط کو پور

نہیں کرتا جسے قرآن کریم نے ضروری قرار دیا ہے تو پھر اُس کے لئے حد سے تجاوز کرنا جائز نہیں۔

اسلام کے دشمن اکثر اسلام پر یہ بھی اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام جمہوریت کا قائل نہیں اور آج کی جمہوری دنیا میں اُس کا ذمی بنانے کا مسئلہ مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔ مولانا نے "حقوق الذمیین" کے عنوان سے جو مقالہ سپرد قلم کیا ہے اُس میں بڑی وضاحت سے اس کا جواب دیا ہے۔ اُن کا یہ مقالہ دنیا کی تمام جمہوریت پسند حکومتوں کے لئے ایک چیلنج معلوم ہوتا ہے جہاں آج بھی جمہوریت جمہوریت کی رٹ لگائی جاتی ہے اور اُن کے ملک کا دستور لفظاً مساوات کا وعظ کرتا نظر آتا ہے لیکن وہاں افلاس نے لوگوں کی کمر توڑ دی ہے۔ تعلیم سے وہاں کے باشندے محروم ہیں۔ ضروریات زندگی عنقا ہو کر رہ گئی ہیں۔ طبی امداد کا وہاں قحط ہے۔ پھر ان ملکوں میں اقلیتوں اور دوسرے فرقوں کے ساتھ جو سلوک روا رکھا جاتا ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔ دور کیوں جائیے اپنے ہمسایہ ملک ہندوستان ہی کو دیکھ لیجئے۔ اس کے دستور میں کیا کچھ نہیں لیکن جس طرح وہاں کے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کیا جا رہا ہے اسے آنے والا مؤرخ جب لکھے گا تو اس کی گردن ندامت سے جھک جائے گی اور اس کا قلم تھر تھر کانپنے لگے گا۔ لیکن اسلام کو دیکھئے وہ ذمی بنا کر دوسروں کو اپنی آغوش امن میں جگہ دیتا ہے، ان کی جان و مال کا اسی طرح محافظ بن جاتا ہے جس طرح ایک مسلمان کی حفاظت کا ذمہ لیتا ہے۔ ان کی تعلیم، روٹی کپڑے اور طبی امداد کا انتظام کرتا ہے۔ علامہ مرحوم اس سلسلہ میں حضرت عمر رضؓ کی مثال پیش کرتے ہیں کہ اگرچہ ایک ذمی کے ہاتھ سے شہید ہوئے لیکن پھر بھی انہوں نے وفات کے وقت تین نہایت ضروری وصیتیں جو کیں ان میں سے ایک یہ تھی "کہ ذمیوں کے ساتھ جو اقرار ہیں وہ پورے کئے جائیں۔ ان کی طاقت سے زیادہ کام اُن سے نہ لیا جائے۔ اور ان کے دشمنوں کے مقابلہ میں ان کی طرف سے لڑائی کی جائے۔" صرف اسی ایک مثال سے معترضین کی زبانیں بند ہو جانی چاہئیں کہ دنیا

میں کوئی ایسا مذہب نہیں جو غیر مذہب والوں کے لئے اس قدر مراعات جائز سمجھتا ہو۔ آج یہ جمہوریت کے نعرے بلند کرنے والی حکومتیں اپنی خاص خاص اسامیوں پر دوسرے فرقوں کے لوگوں کا تقرر نہیں کرتیں لیکن اسلام اور مسلمانوں کی وسیع القلبی ملاحظہ کیجئیے کہ حضرت امیر معاویہ رض نے ابن آثال جو کہ عیسائی تھا حمص کا فنانشل کمشنر اور وہاں کا حاکم مقرر کیا۔ عبدالملک بن مروان کا چیف سیکرٹری ابن سرجون نامی ایک عیسائی ہی تھا۔ ہندوستان میں پہنچ کر تو اسلام نے اپنی اس وسعت قلبی کی انتہا ہی کر دی کہ غیر مسلموں کو ملک کی افواج میں بھی بڑے بڑے عہدوں پر مامور کیا۔ اور اس فیاضی کا ثبوت صرف اکبر ہی کے عہد میں نہیں ملتا بلکہ جہانگیر، شاہجہان حتیٰ کہ عالمگیر جیسے کٹر اور متعصب مسلمان کہا جاتا ہے اس نے بھی بڑے بڑے عہدے غیر مسلموں کو دئے اور اس طرح اسلام کی وسعت نظر کو برقرار رکھا۔ غرضیکہ علامہ مرحوم نے اس طرح کے مقالات لکھ کر ایسی زبردست خدمت انجام دی ہے کہ رہتی دنیا تک آنے والی مسلمان نسلیں اس سے مستفید ہوتی رہیں گی۔

مقالات کی دوسری جلد ادبی مقالات پر مشتمل ہے۔ ان مقالات میں مولانا نے ایسے موضوعات پر اپنا قلم اٹھایا ہے جو اگرچہ ایک حد تک کسی اختلاف کا موجب نہیں ہیں لیکن پھر بھی بعض چیزیں ایسی ہیں جن کے بارے میں لوگوں کی معلومات یا تو محدود ہیں یا انہوں نے تعصب کے پردہ میں جان بوجھ کر اپنے آپ کو غافل رکھنے کی کوشش کی ہے۔ مولانا نے خالص ادبی حیثیت سے ان موضوعات پر بحث کی ہے اور ایک صحیح نقطۂ نگاہ پیش کیا ہے۔

سامی زبانوں کے بارے میں اکثر بحث کی جاتی ہے اور عربی سریانی اور عبرانی کو ان کی شاخیں کہا جاتا ہے۔ کچھ لوگ سریانی اور عبرانی کو عربی سے زیادہ قدیم زبانیں سمجھتے ہیں اور کچھ لوگ عربی کو۔ لیکن مولانا نے اپنے اسی منطقیانہ انداز میں "عربی زبان سے یہ ثابت کیا ہے کہ عربی ان زبانوں میں سب سے قدیم زبان" ہے کیونکہ

عبرانی اور سریانی زبان میں جس قدر الفاظ کے مادے ہیں وہ عربی میں سب موجود ہیں بخلاف اس کے عربی زبان میں بہت سے مادے ہیں جو عبرانی اور سریانی زبانوں میں موجود نہیں ہیں - پھر عربی کا اصل ہونا اس بات سے بھی ثابت ہے کہ عربی زبان آج تک اسی طرح سے خالص اور زندہ ہے جس طرح اب سے ہزاروں برس پہلے تھی لیکن سریانی اور عبرانی کا شمار مردہ زبانوں میں ہو چکا ہے - اگرچہ اب پھر اسرائیلی حکومت قائم ہونے کے بعد عبرانی زبان کا احیاء ہؤا ہے اور پھر اس کے مردہ جسم میں روح پھونکی گئی ہے -

فن بلاغت پر بحث کرتے ہوئے علامہ مرحوم نے شعر کے ذکر کو چھیڑا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ شعر کے لئے نغمہ اور راگ ضروری ہے چنانچہ لکھتے ہیں -

" ہر کوئی شعر نغمہ اور راگ سے بالکل خالی نہیں ہو سکتا - خود وزن جو شعر کا ایک ضروری جزو ہے راگ کی ایک قسم ہے اور یہی وجہ ہے کہ اہل عرب ہمیشہ شعر کو گا کر پڑھتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ شعر پڑھنے کو اہل عرب " انشاد " کہتے ہیں جس کے معنی گانے کے ہیں -"

ہو سکتا ہے کہ " حلقہ ارباب ذوق " کے ارکان اس تفریح کے بعد بھی اپنی ضد پر قائم رہیں اور یہ کہیں کہ ہماری روایات ہی میں تحت اللفظ کے طریقہ سے اشعار کا پڑھنا رائج رہا ہے خواہ ایک شعر کا مثلہ ہو جائے - لیکن ہم اپنی روایت پر قائم رہیں گے تو وہ بخوشی اپنی ضد پر ڈٹے رہیں لیکن شعر کے لئے نغمہ ایک لازمی حیثیت رکھتا ہے - اور حلقہ ارباب ذوق والوں کی اپنی خود ساختہ روایت اسے بدل نہیں سکتی-

ایک جگہ " شعرالعرب " کے عنوان سے لوگوں سے گلہ کرتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی بتلاتے ہیں کہ شعرالعجم کا نمبر تو قومی ضروریات میں سینکڑوں نمبروں کے بعد آنا چاہئے تھا - فرماتے ہیں :

" شعرالعرب لکھتا تو سمجھنے والے کہاں سے آتے ؟ مدرسوں میں فن ادب کا مذاق نہیں اور کالج والے عربی خود نہیں پڑھتے بلکہ یہ

لقمہ زبردستی اُن کے منہ میں ڈالا جاتا ہے جس کو امتحان کے بعد وہ اُگل دیتے ہیں۔"

علامہ کی یہ رائے کس قدر صحیح ہے۔ عربی مدارس کے سندیافتہ علماء کو لیجئے تو وہ عموماً صرف اپنی درسی کتابوں کے علاوہ دوسری کتابوں کے ناموں سے بھی ناواقف ہوتے ہیں۔ اُن کے سامنے کسی عرب کے جغرافیہ داں یا مؤرخ کا نام لیجئے تو وہ حیرت سے آپ کی طرف دیکھنے لگیں گے۔ اسی طرح میز اور کرسی پر بیٹھ کر پڑھے ہوئے کالجوں کے "فضلاء" کو لیجئے۔ یہ بیچارے اُن سے بھی گئے گزرے ہوتے ہیں۔ عربی میں گفتگو اور تحریر تو درکنار ان سے اگر قواعد کی کوئی معمولی سی بات پوچھئے تو یہ اُنہیں لاطینی معلوم ہو گی۔ ان دونوں طبقوں کو پیش نظر رکھ کر ہی مولانا نے ندوۃ العلماء کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا، تاکہ وہ قدیم اور جدید کے سنگھم سے ایک ایسا حیوان ناطق تیار کریں جو اپنی ظاہری کروفر کے ساتھ ساتھ معنوی خوبیوں کا بھی حامل ہو۔

علامہ مرحوم کی شعرالعجم کو جو مقام حاصل ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں جس کا اعتراف بڑے بڑے مستشرقین بھی کرتے ہیں لیکن مولانا اپنا یہ کوئی بڑا کارنامہ نہیں سمجھتے بلکہ اگر وہ "شعرالعرب" لکھ سکتے تو یہ زیادہ کام کی چیز ہوتی۔ کیونکہ عربی شاعری کے مقابلہ میں فارسی شاعری کی حیثیت ہی کیا۔ اصلی اور مصنوعی چیز میں یا اُستاد اور شاگرد میں جو فرق ہوتا ہے وہی عربی اور فارسی کی شاعری میں ہے۔ فردوسی کا شاہنامہ لیجئے، وہ ایک قصہ گو کی طرح آپ سے داستان بیان کرتا نظر آتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اُس میں بڑے بڑے معرکے لکھتا ہے لیکن وہ اوروں کے افسانے ہیں۔ لیکن ایک عرب کا شاعر جو کچھ کہتا ہے وہ آپ بیتی بیان کرتا ہے۔ اس لئے جو کچھ اس کا اثر ہوتا ہے وہ شاہنامہ کا نہیں ہو سکتا۔ عرب کے شاعر خود اپنی جگہ پر جنگجو اور بہادر بھی ہوتے تھے۔ وہ صرف پیشہ ور شاعر ہی نہیں ہوتے تھے بلکہ وہ شعر ہی اس لئے کہتے تھے کہ اُن کے ساتھیوں کے سینوں

میں اور خود اُن کے سینوں میں اشعار کے ذریعہ سے آتش انتقام بھڑک اٹھے - وہ جو کچھ زبان سے کہتے تھے اُسے ہاتھوں کے ذریعہ عملی طور پر انجام دیتے تھے لیکن اس کے مقابلہ پر عجم کے شعراء صرف زبان کے مرد تھے - وہ میدان کے مرد نہ تھے - اس سلسلہ میں مولانا شبلی کا ایک پیش کردہ لطیفہ دلچسپی سے خالی نہ ہو گا ، لکھتے ہیں -

" انوری ایک دفعہ ڈاکوؤں میں گھر گیا - ایک حکیم صاحب اور ایک درزی بھی ساتھ تھا - سب جان بچا کر بھاگ گئے - انوری بطور علوم متعارفہ کے کہتا ہے - ع -

حکیم و شاعر و درزی چگونہ جنگ کنند

اس کے برعکس اگر ایک عربی شاعر ہوتا تر وہ اُن ڈاکوؤں سے مقابلہ کرتا یا جان دے دیتا یا جان لے لیتا لیکن بھاگنے کا اُس کے یہاں تصور ہی نہ پایا جاتا -

اسی طرح بہت سی چیزوں کی وجہ سے علامہ نے عربی شاعری کو فارسی پر ترجیح دی ہے - مناظر قدرت پر بھی بحث کرتے ہوئے یہی کہا ہے کہ جس طرح عرب کا شاعر پہاڑ ، صحرا ، جنگل ، سبزہ زار اور آب رواں وغیرہ کی تصویر کھینچ سکتا ہے ایران کے بس کی یہ بات نہیں ہے -

ہندوؤں کو ہمیشہ یہ شکایت رہی ہے کہ مسلمان سنسکرت اور ہندی سیکھنے سے کنی کتراتے رہے ہیں لیکن مولانا نے ایک مقالہ میں اس کا بھی ذکر کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ اور تو اور عالمگیر جسے نہایت متعصب سمجھا جاتا ہے اُس کے زمانے میں بھی مسلمانوں نے بھاشا زبان پر جس قدر توجہ کی پہلے کبھی نہیں کی تھی -

اسی طرح کے اور دوسرے ادبی مقالات اس جلد میں شامل ہیں - تیسری جلد میں تعلیمی مقالات کو جمع کیا گیا ہے - جیسا کہ میں پہلے کہہ آیا ہوں علامہ شبلی کا مقصد اصلاحی تھا اس لئے اُنھوں نے ہر طرح سے قوم اور معاشرہ کی اصلاح کی کوشش کی اور مسلمانوں کو خاص

طور پر جتانے کی کوشش کی کہ جن چیزوں کو تم نیا سمجھ رہے ہو تمہارے آباء و اجداد برسوں پہلے اُن چیزوں کو سر انجام دے چکے ہیں۔ یہ تو اس نسل کی غفلت کی انتہا ہے کہ وہ کچھ اس طرح سوئی ہے کہ بیدار ہونے کا نام ہی نہیں لیتی۔ ان مقالات میں مسلمانوں کے بہت سے وہ تعلیمی کارنامے پیش کرنے کی کوشش کی ہے جن سے علوم و فنون میں گرانقدر اضافے ہوئے ہیں۔ اگر مسلمان وہ کام نہ کرتے تو آج دنیا تعلیمی میدان میں اس منزل پر نہ پہنچ سکتی جہاں وہ پہنچ چکی ہے۔ آج تعلیم کی راہ میں بہت سی چیزیں حائل ہیں۔ تعلیم خود ایک ایسی گراں شے بن کر رہ گئی ہے کہ ادنیٰ انسان تو کیا ایک متوسط درجہ کا انسان بھی تعلیم کے میدان میں قدم اُٹھاتا ڈرتا ہے لیکن آج سے برسوں پہلے جب کہ ذرائع آمدنی محدود تھے کس طرح طلباء کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی اور اُن کے تمام مصارف کا انتظام کیا جاتا تھا۔ نہ صرف اُن کے کھانے کپڑے کا انتظام کیا جاتا تھا بلکہ اُنہیں کھانے کے ساتھ مٹھائی اور پھل بھی دئے جاتے تھے اور ایک اشرفی ماہانہ جیب خرچ ملتا تھا۔ لیکن آج جبکہ دنیا کئی قدم آگے بڑھا چکی ہے علم کے پیاسے کو اپنی تشنگی دور کرنے کے لئے نہ جانے کن کن چشموں اور کنؤوں کے پاس جانا پڑتا ہے لیکن اُن کے مالک تو آج چشموں کے قریب جانے پر بھی ٹیکس لگائے ہوئے ہیں اور اس طرح کتنے ہی نوجوان پیاسے ہی ہمیشہ کی نیند سو جاتے ہیں۔

چوتھی جلد میں علامہ کے تنقیدی مقالات کو جمع کیا گیا ہے۔ عموماً نقاد توازن قائم نہیں رکھتے اور ضرور ٹھوکر کھا جاتے ہیں۔ پھر ہمارے یہاں اردو زبان میں تو عبدالرحمٰن بجنوری یا حکیم احمد جیسے لوگ نظر آتے ہیں جو افراط و تفریط کی بندشوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ ہمارے یہاں ابھی تک ڈاکٹر طہٰ حسین جیسے نقاد بہت کم ہیں جو صحیح بات کہتے ہیں اور صحیح تنقید کرتے ہیں، استادی اور شاگردی کے رشتہ کو بھی ایک طرف رکھ کے جس کی جو خامی ہے اُسے پیش کرتے ہیں۔ مولانا نے بھی اپنے مقالات میں تنقید کے معیار کو گرنے نہیں دیا۔ بلکہ

ہر شخص کے صحیح مقام کو پیش نظر رکھ کر اُس کے کام کی داد دی ھے اور جس میں جو خامیاں نظر آئی ھیں اُنہیں آشکار کرنے کی کوشش کی ھے - مثلاً لوگ عمر خیام کو ایک شاعر اور رباعی گو کی حیثیت ھی سے جانتے تھے لیکن علامہ شبلی نے پہلی دفعہ یہ بتلایا کہ وہ ریاضی دان بھی تھا - چنانچہ اس سلسلہ میں پیرس سے ایک کتاب بھی شائع ہوئی تھی - غالباً علامہ نے اُسی سے استفادہ کیا اور بتلایا کہ عمر خیام صرف شاعر ھی نہیں تھا بلکہ وہ جبرو مقابلہ کا بھی ماھر تھا بلکہ کئی قاعدے اُس نے خود ایجاد کئے تھے -

جرجی زیدان کی " تمدن اسلام " نامی کتاب پر اُن کی تنقید اس بات کا ثبوت ھے کہ وہ جہاں علمی حیثیت سے ھر علم کی قدر کرتے ھیں اور اُس کے مذھب سے قطع نظر وہ اُس کے کارناموں کو سراھتے ھیں اور اُس کی خدمات کا اعتراف کرتے ھیں وھاں وہ یہ بھی گوارا نہیں کر سکتے کہ تاریخی واقعات یا مذھبی حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کیا جائے اور اس طرح دوسروں کے جذبات کو مجروح کیا جائے -

جلد پنجم اور ششم تاریخی مقالات پر مشتمل ھے - علامہ مرحوم کا اصل میدان یہی ھے - اور اُنہوں نے اپنی قابلیت کے جوھر دکھائے ھیں ایک طرف اُن مضامین کو نگاہ میں رکھئے جو مولانا شرر نے تاریخی مضامین کی حیثیت سے لکھے ھیں دوسری طرف یہ مقالات ھیں - انہیں پڑھ کر اندازہ ھوتا ھے کہ ان دونوں مسلمان فاضلوں نے کتنی حقیقت پسندی سے کام لیا ھے اور اپنوں اور غیروں کے واقعات پیش کرنے میں ذرا تعصب کو پاس نہیں آنے دیا ، حالانکہ یہ دونوں فضلاء صرف مؤرخ ھی نہ تھے بلکہ انشا پرداز بھی - تاریخی واقعات کے ساتھ ساتھ ان کی نشاپر دازی برابر جلوہ فگن نظر آتی ھے لیکن ایسا کہیں نظر نہیں آتا کہ علامہ انشاپردازی کی رو میں بہہ کر اصلی واقعات کا خون کر رھے ھوں یا انشا پردازی کے حسن میں تاریخی واقعات دب کر رہ گئے ھوں - ان تاریخی واقعات میں عرب کے لوگوں اور خصوصاً عورتوں کے دو کارنامے پیش کئے گئے ھیں جو آج کے بہادر سے بہادر مردوں میں نظر نہیں آتے - اُن کی بہادری اور

شجاعت کی داد کھل کر دی ہے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ عرب کا شاعر کسی خوف و ہراس کے بغیر یہ کہتا نظر آتا ہے ۔

فاسنا علی الاعقاب تدمی کلومنا
ولکن علی اقدامنا تقطرالدم

ہمارے زخموں کا خون ہماری پیٹھ پر نہیں
بلکہ ہمارے قدموں پر ٹپکتا ہے

ان مضامین میں کچھ ایسی شخصیتوں پر بحث کی گئی ہے جو واقعی اسم بامسمٰی تھے۔ مثلاً ابن رشد ۔ اس کی زندگی اور اس کے تعلیمی کارناموں پر نظر ڈالئے ، یوں محسوس ہوتا ہے گویا اس نے معجزہ کر دکھایا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ والے بھی اس کا فلسفہ اپنانے میں بڑی تیزی سے قدم اٹھاتے نظر آتے ہیں ۔

علامہ ابن تیمیہ پر بحث کرتے ہوئے ان کے صحیح مقام سے دنیا کو روشناس کیا ۔ دنیا نے بڑے بڑے عالم و فاضل اور ماہرین فن پیدا کئے لیکن مجدّد اور مصلح جنہیں کہا جا سکے ان کی تعداد بہت کم ہے ۔ علامہ ابن تیمیہ اس گروہ کے سربراہ نظر آتے ہیں ۔ قیہ خانے چلے جاتے ہیں لیکن سچی بات کہنے سے نہیں جھجکتے ۔ برسوں بعد مجدد الف ثانی رح کا وجود نظر آتا ہے جن میں ابن تیمیہ جیسی صلاحیتیں نظر آتی ہیں اور جو اصلاح دین میں سر دھڑ کی بازی لگاتے نظر آتے ہیں مگر ان کے بعد ان کا کام رک گیا ۔ اقبال نے اسی لئے کہا تھا ۔

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند
اب مناسب ہے ترا اذن ہو عام اے ساقی

اس صدی میں امام الہند مولانا ابو الکلام آزاد میں وہ جھلکیاں نظر آتی ہیں ۔ ان کا وہ کلکتہ کا تاریخی مقدمہ جہاں وہ مجسٹریٹ کے سامنے شیر کی طرح گونجتے نظر آتے ہیں یہ بتلاتا ہے کہ کوئی ابن تیمیہ کا شاگرد ہے جو سچی بات کہنے میں ذرا نہیں جھجکتا بلکہ عدالت میں پابزنجیر ہوتے ہوئے بھی اسلامی نقطۂ نگاہ پیش کرتا

ہے - مشرق سے مغرب تک کے لوگ اُن کے مخالف ہوجاتے ہیں لیکن جسے وہ اپنی نگاہ میں صحیح سمجھتے ہیں اُس پر بڑی مضبوطی سے قائم رہتے ہیں -

مسلمانوں پر ایک یہ بھی اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ علم کے دشمن تھے اس لئے انہوں نے اسکندریہ کا کتب خانہ جلا دیا تھا - علامہ نے تاریخی واقعات سے اس الزام کو غلط ثابت کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتلایا ہے کہ مسلمانوں نے تعلیم کو عام کرنے کے لئے کیا کیا قدم اُٹھائے اور اس سلسلہ میں لوگوں کو بلکہ دوسرے فرقوں تک کو کیا کیا امدادیں بہم پہنچائیں - ان کی تعلیمی محبت کا اس سے ہی اندازہ ہو سکتا ہے کہ جنگ بدر کے وہ قیدی جن کے پاس فدیہ دینے کے لئے نہ تھا اُن کا فدیہ یہ مقرر کیا گیا کہ وہ دس دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں -

ساتویں جلد میں فلسفیانہ مقالات کو جمع کیا گیا ہے - چونکہ علامہ مرحوم کو خود فلسفہ میں دسترس حاصل تھی اس لئے اُن کے یہ مقالات اُن کے شاھکار نظر آتے ہیں - ان مقالات میں اُنہوں نے ہر طرح کے مسائل پر بحث کی ہے اور بعض دوسرے لوگوں کی غلطیوں کو بتلایا ہے -

آج لوگ ڈارون کی تھیوری کا اکثر ذکر کرتے ہیں لیکن علامہ نے ثابت کیا ہے کہ حکمائے اسلام کا دعویٰ اس سلسلہ میں کیا تھا اور انہوں نے ڈارون سے برسوں پہلے یہ ثابت کر دیا تھا کہ انسان ارتقاء کی کتنی منزلیں طے کرنے کے بعد اس مقام پر پہنچا ہے - انسان کا جمادات، نباتات اور حیوانات سے کیا تعلق ہے -

جلد ہشتم میں اُن کے اصلاحی، معاشرتی اور سیاسی قسم کے مقالات جمع کئے گئے ہیں - ان میں مولانا نے بڑی بے باکی سے اپنے نظریات کو پیش کیا ہے - اس سلسلہ میں اُن کا مسلک مولانا رشید احمد گنگوھی، شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب اور دوسرے انقلاب پسند علماء کی طرح ہے - وہ کسی نہ کسی طرح اپنے لوگوں کی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں اس لئے وہ جا بجا اُس وقت کانگریس سے وابستہ ہو جاتے ہیں جب کہ ابھی کانگریس ابتدائی دور سے گزر رہی تھی اور وہ مکمل آزادی کی

حامی بھی نہ تھی ۔ لیکن مولانا کی دور رس نگاہ یہ دیکھ رہی تھی کہ جب تک ہندوستان کے تمام فرقے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر انگریز کے خلاف جد و جہد نہ کرینگے انگریز ہندوستان سے جانے کا نام نہیں لے گا ۔ چنانچہ علامہ نے جا بجا کانگریس کے کام کو سراہا ہے اور اُس وقت کی فرقہ پسند جماعتوں کی مخالفت کی ہے ۔ ۔ علامہ کے یہاں ایک کمال ضرور ہے کہ وہ کانگریس کے مداح ہوتے ہوئے بھی عدم تشدد کے قائل نظر نہیں آتے ۔ اگر وہ زندہ رہتے تو اس مسئلہ پر اور بعض دوسرے مسئلوں پر اُن کا گاندھی جی اور دوسرے لوگوں سے ٹکراؤ ہوتا کیونکہ وہ سیاست ہند کو بھی اسلامی نقطۂ نگاہ سے لیتے تھے اس لیے وہ مولانا حسرت موہانی کی طرح کبھی یہ گوارا نہ کرتے کہ اُن کے اس سیاسی مسلک سے اسلام یا مسلمانوں کو کسی طرح کا نقصان پہنچے ۔

بہر کیف یہ تمام مقالات جو ۸ جلدوں میں مرتب کئے گئے ہیں وہ اس قابل ہیں کہ ہمارے ماہرین تعلیم اُن میں سے کچھ مقالوں کو ثانوی تعلیم کے نصاب میں جگہ دیں ۔ ہمارے ناشرین دارالمصنفین کی اجازت سے اُنہیں اتنے سستے داموں پر فروخت کرنے کا انتظام کریں کہ متوسط درجہ کے لوگ بھی انہیں خرید کر ان سے بہرہ ور ہو سکیں ۔

سفر نامہ روم و مصر و شام

شیخ عطا اللہ

سفر ناموں یعنی سیاحت کے تذکروں کو ادب میں ایک خاص مقام حاصل ھے - انسانوں کے سوانح حیات کی طرح ملکوں کے حالات سے بھی اھل علم میں خاصی دلچسپی پائی جاتی ھے - ھندوستان کے مسلمانوں میں ایسی سیاحت کا کوئی شوق نہ تھا - نہ ھی دور دراز کے سفروں سے ان کو کوئی شغف تھا - مولانا شبلی کا سفر روم و مصر و شام اس زمانے میں بجائے خود ھمت و حوصلہ کی ایک مثال تھا - پھر ان کا مقصد اسلامی ممالک کے کتب خانوں کی سیر اور ٹرکی کی دنیوی سلطنت و شوکت کا اپنی آنکھوں دیکھ لینا تھا - سفر نامہ ۱۳۰۹ھ میں شائع ھؤا - مولانا نے ھر ضروری تفصیل کی طرف توجہ کی ھے اور کامل عقیدت و محبت سے یہ کام انجام دیا ھے - سفر نامہ کا یہ سرسری جائزہ ملاحظہ فرمائیے تو ثابت ھوگا کہ مولانا کیا کیا خیالات لے کر گئے - وھاں ان کی دلچسپیاں کیا کچھ تھیں - ترکوں کے داغھائے 'بدنامی' دھونے کے لئے انہوں نے کیا کچھ کوششیں کیں اور دشمنوں کی ان سازشوں اور پیہم کوششوں کو کیونکر بے نقاب کیا - میں نے اقتباسات پیش کئے ھیں اور ان کے عنوانات جو اصل میں کم موجود ھیں تجویز کر دیے ھیں تا کہ نفس مضمون سے پڑھنے والے کو آگاھی رھے - مولانا نے اس سفر نامہ میں معلومات کی ایک دنیا بھر دی ھے - سفر کا ارادہ ، تیاری ، آغاز ، سمندری سفر کے جسمانی اور دماغی فوائد - طبیعت کی موزونی - سویز میں اردو بولنے والے عربوں سے ملاقات - تمام اسلامی ممالک میں دولت اور تجارت کا غیر مسلموں کے ھاتھ میں ھونا - جس جس ملک سے گذر ھؤا ، جہاں جہاں پہنچے وھاں کی تاریخ بیان فرما دی ھے - قبرص میں ایک مکتب میں پہنچے جس کے متعلق لکھتے ھیں " ایک لڑکے نے قرآن مجید کی چند مختصر

آئتیں پڑھیں - میرے دل پر عجیب اثر ہؤا - خیال آتا تھا کہ کہاں وہ حجاز کا ریگستان کہاں بحیرۂ روم کے دور دراز جزیرے - اس مقدس کلام میں کیا تاثیر تھی کہ مشرق سے مغرب تک برق قوت بن کر دوڑ گئی اور آج تک باقی ھے - وہ معصوم لڑکا خوش لحن تھا اور اصول قرأت کے مطابق پڑھتا تھا - اتفاق سے آئتیں بھی موثر تھیں - ان باتوں نے مجھے بالکل مدھوش کر دیا۔''

قسطنطنیہ کے لباس اور وضع ، جامع اور شاھی ایوانات ، عدالتوں ، ترقی تعلیم - جدید و قدیم درسگاھوں کی حالت ، تعلیم پر مصارف ، بورڈنگ ھاؤس ، طلباء کا لباس ، سب کا مطالعہ فرمایا ھے - سفر نامہ کو قسطنطنیہ سے لکھے ہوئے مکاتیب کے ساتھ پڑھا جائے تو ترکوں کی زندگی کی مکمل تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ھے - سلطان المعظم کے نماز جمعہ پر سلاملق کی تقریب کی کیفیت ایک وجد انگیز جوش سے لکھی ھے - جون ۱۸۹۲ء کو مثنوی عیدیہ لکھی - ترکوں کی فیاضی و مہمان نوازی کے قصے لکھے ھیں - ان کے رھنے سہنے کے ڈھنگ ، لباس ، طریقۂ ملاقات ، قسطنطنیہ میں ھندوستانی مسلمانوں سے ملاقات ، شیر پلونا غازی عثمان پاشا سے ملاقات کی کیفیت اور عطائے تمغۂ مجیدیہ کے حالات لکھے ھیں۔

قسطنطنیہ سے بیروت - وھاں سے بیت المقدس اور مصر پہنچے - ھر جگہ کتب خانوں کی سیر کی - اھل علم اور ارباب کمال سے ملے - تعلیمی حالت کا جائزہ لیا - چیدہ چیدہ حالات اور واقعات نموتناً پیش کئے جاتے ھیں -

حامداً و مصلیاً

در موسم گل گر بگلستاں نرسیدیم
از دست ندادیم تماشائے خزاں را

سفر نامہ کے اسباب

''رمضان المبارک ۱۳۰۹ھ میں ، میں نے قسطنطنیہ وغیرہ کا جو سفر کیا وہ محض ایک طالب العلمانہ سفر تھا - اور چونکہ نہ یہ کوئی غیر معمولی امر تھا ، نہ واقعات سفر میں چنداں ندرت تھی سفر نامہ لکھنے

کا میرا ارادہ نہ تھا لیکن وہاں سے واپس آ کر جن بزرگوں اور دوستوں سے ملنے کا اتفاق ہؤا سب سفر نامے کے متقاضی تھے۔ میں نے خیال کیا کہ چونکہ ایک مدت سے ہماری جماعت میں سیر و سیاحت کا طریقہ بند ہے اور اس وجہ سے اسلامی ممالک کے صحیح حالات سے بالکل اطلاع حاصل نہیں ہوتی لوگوں کا یہ تقاضا کچھ بیجا نہیں۔ مجھ کو خود اپنی حالت یاد آئی کہ سفر سے پہلے قسطنطنیہ وغیرہ کا کوئی سیاح مل جاتا تو میں گھنٹوں وہاں کے حالات پوچھا کرتا۔

سفر نامہ کے لوازم

یہ اسباب تھے جنہوں نے مجھ کو اوراق پریشاں کی ترتیب پر آمادہ کیا ورنہ ایسے عاجلانہ اور معمولی سفر کے حالات قلمبند کرنے اور ان کو سفر نامہ یا کتاب الرحلۃ کا لقب دینا تنگ ظرفی سے خالی نہ تھا۔ سفر نامہ میں جس قسم کی اطلاعیں لازمی اور ضروری ہیں، یعنی ملک کی حالت، انتظام کا طریقہ، عدالت کے اصول، تجارت کی کیفیت، عمارتوں کے نقشے، ان میں سے ایک بھی چیز اس سفر نامہ میں نہیں۔ البتہ معاشرت اور علمی حالت کے متعلق معتدبہ واقعات ہیں۔ اگرچہ وہ بھی اس تفصیل کے ساتھ نہیں ہیں جس قدر ہونے چاہئیں۔ غرض جو شخص سفر نامہ کو سفر نامہ کی حیثیت سے دیکھنا چاہتا ہے وہ اس کتاب سے پورا لطف نہیں اٹھا سکتا۔ جن لوگوں کو اسلامی ممالک کے معمولی واقعات میں بھی مزہ آتا ہے ان کی دعوت میں ماحضر پیش کیا جا سکتا ہے کہ مالا یدرک کلہ لا یترک کلہ۔

اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرنے کی سازش

میں نے اگرچہ اس کتاب میں ترکوں کی تمدنی یا ملکی حالت سے کچھ بحث نہیں کی ہے اور نہ اس قسم کی بحث میرے منصب و حالت کے لحاظ سے مناسب تھی تاہم اس کتاب کو پڑھ کر ناظرین کے دل میں ترکوں کی تہذیب و شائستگی کا جو درجہ قائم ہوگا وہ اس سے مختلف ہوگا جو یورپ کے عام لٹریچر سے ظاہر ہوتا ہے۔ یورپ نے کسی زمانے میں

مسلمانوں کے خلاف جو خیالات قائم کر لئے تھے ایک مدت تک وہ علانیہ اس طریقے سے ظاہر کیے جاتے تھے - کہ مذہبی تعصب کا رنگ صاف نظر آتا تھا اور اس وقت قبول عام کا بڑا عمدہ ذریعہ تھا ، لیکن جب یورپ میں مذہب کا زور گھٹ گیا اور مذہبی ترانے بالکل بے اثر ہو گئے تو اس پالیسی نے دوسرا پہلو بدلا - اب یہ طریقہ چنداں مفید نہیں سمجھا جاتا کہ مسلمانوں کی نسبت صاف صاف متعصبانہ الفاظ لکھے جاویں - بلکہ بجائے اس کے یہ دانشمندانہ طریقہ اختیار کیا گیا ھے کہ اسلامی حکومتوں ، اسلامی قوموں ، اسلامی معاشرت کے عیوب ، تاریخی پیرایہ میں ظاہر کئے جاتے ھیں اور عام تصنیفات ، قصوں ، ناولوں ، ضرب المثلوں کے ذریعے سے وہ لٹریچر میں اس طرح جذب ہو جاتے ھیں کہ تحلیل کیمیاوی سے بھی جدا نہیں ہو سکتے - اگر چہ یہ طریقہ کل اسلامی قوموں سے برتا جاتا ھے لیکن اس وقت ھمیں خاص ترکوں سے بحث ھے - یورپین لٹریچر پڑھ کر ترکوں کی نسبت تحقیر کے خیالات نہ پیدا ہونے بعینہ ایسا ھے جیسا خواب آور دوا کھا کر نیند کا نہ آنا - یورپ میں مصنفین کا دائرہ بہت وسیع ھے اور اس وجہ سے ان میں متعصب ، نیک دل ، ظاھربین ، دقیق النظر ، ہر درجہ اور طبقے کے لوگ ھیں - لیکن ترکوں کے ذکر میں وہ اختلاف مدارج بالکل زائل ہو جاتا ھے اور ہر ساز سے وھی ایک آواز نکلتی ھے -

ترکوں کی پستی کا اعلان اور ترقی سے انکار

مثلاً آج کل کے سچے سے سچے یورپین مصنف کی راست بیانی یہ ھے کہ وہ ترکی حکومت کے ذکر میں قرضہ کی گرانباری - صنائع و فنون کا بقدر کافی موجود نہ ہونا ، اضلاع میں تعلیم کی عدم وسعت ، آلات و اسلحہ میں یورپ کی احتیاج ، ان تمام امور کو بالکل راست راست لکھتا ھے - لیکن جو اصلاحیں حال میں ہوئی ھیں اُن کے ذکر سے اس طرح دامن بچاتا ھے کہ گویا اصلاح کا سرے سے وجود ھی نہیں - خزانہ کا انتظام ، تمام اضلاع میں زراعتی بنکوں کا قائم ہونا - اور مدارس رشدیہ کی تعداد کا ۹۶ سے ۵۰۰ تک ترقی کر جانا - بڑے بڑے کالجوں کا جاری ہونا -

ریلوے کی وسعت ، ادائے قرضہ کے انتظام ، فوجی قوت کی ترقی ، ان واقعات کو بھول کر نہیں لکھتا ۔ کسی قوم یا کسی شخص کے قابل مدح یا ذم ثابت کرنے کا یہ نہایت آسان طریقہ ہے کہ اُس کے حالات اور واقعات کی یک رخی تصویر کھینچی جائے اور انصاف یہ ہے کہ یورپ نے اس فریب آمیز طریقے کو دنیا کی تمام قوموں سے زیادہ برتا ہے ۔ بے شبہ یورپ میں ایسے فیاض دل بھی ہیں جن کو تعصب سے کچھ واسطہ نہیں لیکن بچپن سے جس قسم کے خیالات میں انہوں نے پرورش پائی ہے اُن کے گرد و پیش معلومات کا سرمایا ہے۔ جو آوازیں ہر طرف سے اُن کے کانوں میں آئی ہیں ۔ اُن چیزوں کے مقابلہ میں اُن کی بے تعصبی کچھ کام نہیں دیتی ۔ ایک صاحب جو نہایت ہی بے تعصب اور عالم شخص ہیں اور مجھ کو ان کی خدمت میں نیاز حاصل ہے ۔ قسطنطنیہ و مصر وغیرہ کا سفر کر کے واپس آئے تو میں نے اُن سے برسبیل تذکرہ پوچھا کہ آپ نے قاہرہ میں جامع ازہر کی سیر بھی کی ؟ بولے مجھ کو اُس سیر کا بہت شوق تھا ، لیکن میرے رہنما نے کہا کہ عیسائیوں کو وہاں جانے کی اجازت نہیں ہے اگر چہ واقعہ محض غلط ہے میں خود جامع ازہر میں ایک مہینے سے زیادہ مقیم رہا میرے عیسائی احباب بے تکلف مسجد ہی میں مجھ سے ملنے آتے تھے ۔ لیکن چونکہ یورپ میں مسلمانوں کا تعصب اور تنگ خیالی علوم متعارفہ کے قریب ہے اُن صاحب کو اپنے رہنما کی بات کے یقین کرنے میں کیونکر تامل ہو سکتا تھا ؟

حق سے انکار اور باطل پر اصرار

طرہ یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے عام شاہراہ سے الگ ہو کر کچھ کہا یا لکھا تو یورپ کے نقار خانے میں اس کی آواز طوطی کی آواز سمجھی جاتی ہے کہ انگلش شہزادی نے پندرہ سولہ برس قسطنطنیہ میں رہ کر ” دوازدہ سالہ حکومت عبدالحمید ثانی “ کے نام سے جو کتاب لکھی ہے ، اگرچہ اس کے اعتبار کے لئے مصنفہ کی علمی لیاقت پندرہ ، سولہ برس کا تجربہ دریافت حالات کے صحیح وسائل یہ تمام قرائن موجود تھے ۔ لیکن چونکہ ترکوں کی عیب گوئی میں یورپ کی ہم زبان نہ تھی ،

اُس کو استناد اور اعتماد کا درجہ نہ حاصل ہو سکا - ہم نے تعلیم یا فتہ اشخاص کو اُس کی نسبت یہ کہتے سنا ہے کہ عجب نہیں یہ کتاب فرضی مصنف کے نام سے خود ترکوں نے لکھی ہو یا اُس انگلش شہزادی کو سلطانی انعامات نے ایسی کتاب لکھنے پر مجبور کیا ہو - لیکن اگر یہ کتاب ترکوں کے مصائب میں ہوتی تو (ان اشخاص کے نزدیک) اُس کا ہر حرف قطعی و یقینی ہوتا - پروفیسر ویمبری نے اپنے محققانہ تجربہ سے ترکوں کی تہذیب وشائستگی پر جو مضامین لکھے وہ بھی اُسی وجہ سے بے اثر رہے کہ پروفیسر مذکور نے ترکوں کی موجودہ علمی ترقی کا اعتراف کیا تھا -

ترکوں کی نسبت اگرچہ یورپ کے عام لٹریچر کی یہ حالت ہے لیکن ہم کو موقع کے لحاظ سے ترکی کے سفر ناموں کا خاص طور پر ذکر کرنا چاهئے کیونکہ یورب کی تاریخی تصنیفات کا سرمایہ بھی بہت کچھ انہیں سفر ناموں سے لیا گیا ہے سفر نامہ اگرچہ تاریخی سلسلہ کا ایک دلچسپ حصہ ہے لیکن جس قدر دلچسپ ہے اسی قدر غلطیوں کے احتمالات سے مملو ہے - ایک بڑی غلطی جو عموماً سفر نامے لکھنے والوں کو ہوتی ہے - جزئیات سے کلیات کا قائم کرنا ہے - سفر میں انسان کو جن اشخاص سے سابقہ پڑتا ہے وہ ان کے اخلاق ،عادات ، خیالات سے تمام قوم کی نسبت عام رائے قائم کر لیتا ہے حالانکہ ممکن ہے کہ وہ امور انہی چند اشخاص کے ساتھ مخصوص ہوں - اس طرح وہ ہرایک واقعہ سے ایک عام نتیجہ نکالنا چاہتا ہے - اورواقعہ کے خاص اسباب کی جستجو میں نہ وہ اپنا وقت صرف کرنا چاہتا ہے نہ اُس کو اس قدر فرصت ملتی ہے -

غلطی کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ جو شخص کسی ملک کا سفر کرتا ہے اس کی نسبت پہلے سے اس کے خیالات دوستانہ یا مخالفانہ ہوتے ہیں - وہاں پہنچ کر اول اول جو کچھ وہ دیکھتا ہے اور سنتا ہے وہ محض سرسری ہوتا ہے اور چونکہ ایسی اجمالی واقفیت استنباط نتائج کے لئے کافی نہیں ہوتی اور وہ نتیجہ کے قائم کرنے میں دیر تک انتظار نہیں کر سکتا اس لئے وہ ہر واقعہ کے ساتھ قیاسیات کو داخل کرتا جاتا ہے - ان قیاسیات کے ساتھ وہ حسن ظن یا

سوءظن جو پہلے سے اُس کے دل میں موجود تھا چپکے چپکے اپنا کام کرتا ہے اور اس کو خبر تک نہیں ہوتی - اس قسم کی غلطی کا احتمال اگرچہ دنیا کی تمام قوموں سے متعلق ہے لیکن یورپ والوں کو اس میں خاص ترجیح حاصل ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ استنباط نتائج میں یورپ والوں کو جو بے صبری ہے اور کسی قوم کو نہیں ہے - اسی کا اثر ہے کہ اگر یورپ کا عام سیاح پولیٹیشن اتفاق سے ہندوستان میں آ نکلتا ہے تو صرف ہفتہ یا دو ہفتہ کے تجربے کی بنا پر یورپ کے اخباروں اور میگزینوں میں اس دعوے کے ساتھ بڑے بڑے آرٹیکل شائع کرتا ہے کہ گویا ہندوستان کی معاشرت و تمدن کے تمام راز اُس پر کھل گئے ہیں -

ایک اور بڑا سبب یہ ہے کہ چونکہ سیاح کو حالات کے دریافت کا نہایت شوق ہوتا ہے اس لئے وہ ہر شخص سے جو اس کو ملتا ہے کچھ نہ کچھ معلومات کا سرمایا حاصل کرنا چاہتا ہے - اس تعمیم میں وہ ان تحقیقات کی کہ وہ شخص ثقہ ہے یا غیر ثقہ ، روشن ضمیر ہے یا متعصب ، دقیق النظر ہے یا ظاہر بین کچھ پروا نہیں کرتا اگر کرنا بھی چاہے تو کامیابی نہیں ہو سکتی - یورپ والے اس باب میں اور بھی بے احتیاط ہیں - اکثر یورپین سیاح جو قسطنطنیہ کا سفر کرتے ہیں معمولاً بیوعلی اور غلطہ کے ہوٹلوں میں ان کو ٹھیرنے کا اتفاق ہوتا ہے وہ جہاں کہیں جانا چاہتے ہیں ایک گائیڈ (رہنما) ان کے ساتھ ہوتا ہے جو نہ صرف ان کو عمارات اور مقامات کی سیر کراتا ہے بلکہ ان کے تمام سوالات کا جو موقع بموقع پوچھے جاتے ہیں جواب دیتا ہے - یہ گائیڈ عموماً عیسائی ہوتے ہیں اور روپیہ دو روپیہ ان کی روزانہ اُجرت ہوتی ہے - ان گائیڈوں کی معلومات جس قسم کی ہو سکتی ہے اس کا ہر شخص اندازہ خود کر سکتا ہے -

فاطمہ خانم نے اپنی کتاب کے دیباچہ میں لکھا کہ " یورپ کی معزز خاتونیں جن سے مجھ کو ملنے کا اتفاق ہؤا ہے جب ترکی خاتونوں کے متعلق واقعات کے طور پر کچھ بیان کرتی ہیں تو مجھ کو گمان ہوتا ہے کہ یہ کسی اور قوم کا تذکرہ ہے یا ناول کے قصے ہیں " فاطمہ خانم نے اس

پر رائے دی کہ " ان بے چاروں کا کوئی قصور نہیں ہے - گائیڈ جو کچھ سیاحوں سے کہہ دیتے ہیں وہ یقین کر لیتے ہیں" ہمارے دوست جو جامع ازہر کی سیر سے محروم رہ گئے تھے ان کو بھی گائیڈ نے ہی دھوکا دیا تھا - ترکوں کی حالت سے ، اگر سلطنت کی حیثیت سے قطع نظر کی جائے تو مسلمانوں کی حالت وھاں بھی کچھ زیادہ مسرت اور اطمینان کے قابل نہیں ہے بلکہ یہ کہنا چاھئے کہ بہت سی باتوں میں ہندوستان کے مسلمانوں کے قریب قریب ہے - صنعت سے ان کو کچھ واسطہ نہیں ، تجارت میں ان کا بہت کم حصہ ہے - معمولی دکاندار تک یہودی یا عیسائی ہیں - پرانی تعلیم ابتر ہے اور ہوتی جاتی ہے - نئی تعلیم کے متعلق جو شکایات یہاں ہیں وہاں بھی ہیں - پرانی تہذیب اور نئی تہذیب میں رقابت ہے اور دونوں سے مل کر مرکب مزاج پیدا نہیں ہؤا ہے پرانے خیال والے ابھی تک زمانہ کی رفتار سے بے خبر ہیں نئے مذاق کے لوگ جس قدر کہتے ہیں کرتے نہیں، ہمت ، غیرت ، جوش ، عزم ، استقلال کے بجائے کل قوم پر افسردگی سی چھائی ہوئی تھی - جو شخص جس حال میں ہے اس پر قانع ہے - موجودہ حالت تو یہ ہے "و لعل اللہ یحدث بعد ذلک امراً"

ترکی زبان ذریعہ تعلیم ہے

پاکستان میں آج انگریزی ہی کا دامن نجات تھامے رکھنے والوں کے لئے مولانا نے ۱۸۹۲ء کی ٹرکی میں ذریعۂ تعلیم اور قومی زبان کی ترقی سے متعلق جو کچھ دیکھا وہ ایک تازیانۂ عبرت ہے - مولانا فرماتے ہیں "میرے ایک ترک دوست نے جو متعدد زبانوں کے ماہر ہیں مجھ سے بیان واقعہ کے طور پر نہ (فخریہ) بیان کیا کہ فرنچ زبان کی تاریخیں ڈرامے - ناول - سفر نامے کتب انشا و بلاغت اس کثرت سے ترکی میں ترجمہ ہوگئی ہیں کہ یہ کہنا کچھ مبالغہ نہیں کہ فرانس کا پورا علم ادب ترکی زبان میں آگیا ہے علوم و فنون جدیدہ کی بھی سینکڑوں کتابیں ترجمہ ہو چکی ہیں اور اسی کا اثر ہے کہ ٹرکی کے تمام کالجوں میں بجز کتب سلطانیہ کے ان علوم و فنون کی تعلیم ترکی زبان ہی میں ہوتی ہے اور

اعلیٰ درجہ پر ہوتی ہے ۔

ترکی چھاپے خانے

چھاپے خانے یہاں کثرت سے ہیں اور خوش خطی ۔ صفائی موزونی میں اُن کا جواب نہیں ۔ عربی خط کا جو ٹائپ ہے اور جو ایک ترکی عالم ابوالضیا کی ایجاد ہے تمام دنیا میں بے نظیر خیال کیا جاتا ہے ۔ عربی کتابیں آج دنیا میں جہاں جہاں چھپتی ہیں اُن میں بیروت کی چھپی ہوئی کتابیں سب سے عمدہ تر تسلیم کی جاتی ہیں ۔ لیکن خود بیروت والوں نے مجھ سے بیان کیا کہ اصل میں یہ ٹائپ ترکوں کی ایجاد ہے اور ہم اُن کے مقلد ہیں چونکہ قسطنطنیہ میں عموماً ترکی کتابیں چھپتی ہیں اور وہ اُن ملکوں میں نہیں آتیں اس لئے عام طور پر بیروت ہی کی شہرت ہو گئی ہے ۔

ترکی کتب خانے

فرماتے ہیں ۔ " ترکوں کے علمی کارنامے میں جو سب سے زیادہ قابل فخر ہے وہ یہی کتب خانے ہیں ۔ اسلامی دنیا کے جن حصوں میں آج تعلیم کا چرچا ہے ۔ وہ ہندوستان ، عرب ۔ مصر ۔ شام ۔ بلاد مغرب ۔ فارس و ایران ہیں ۔ اُن میں اکثر مقامات کا علمی سرمایہ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے ۔ اور جو نہیں دیکھا وہ ایسے قومی وسائل سے معلوم ہؤا ہے کہ دیکھنے کے برابر ہے ۔ اس بنا پر میں کافی یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ تمام اسلامی دنیا میں قسطنطنیہ عربی تصانیف کا سب سے بڑا مرکز ہے ۔

ان امور کے لحاظ سے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ علمی فیاضی میں ترکوں کا درجہ اسلامی قوموں سے بالا تر ہے ۔ ہندوستان میں مدتوں تک اسلامی حکومت رہی اور بڑے اوج و شان سے رہی ۔ بڑے بڑے نامور وزراء اور امراء گذرے لیکن آج اُن کی ایک بھی علمی یادگار موجود نہیں ۔ "

ترک امراء اصحاب ذوق تھے ۔

" اُن کتب خانوں سے اس بات کا ثبوت بھی ملتا ہے کہ ترکوں

میں امراء کا گروہ (جو نسبتاً ایک جاہل گروہ ہوتا ہے) تعلیم یافتہ تھا۔ اکثر کتب خانوں کے وقف کرنے والوں کی ذاتی تصانیف یا آن کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتابیں موجود ہیں۔ آن کے مذاق اور وسعت نظر کی شاہد ہیں۔ اس کے علاوہ جس قسم کی عمدہ اور نایاب کتابیں ڈھونڈ کر جمع کی گئی ہیں خود آن سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ جمع کرنے والوں کا علمی مذاق، معمولی مذاق نہ تھا۔"

کتب خانوں کا جائزہ

مولانا نے کتب خانوں کا مکمل جائزہ لیا ہے اور ہر ایک کتب خانہ کی کتابوں کی خصوصیات تحریر کی ہیں۔ نسخوں کی صحت و عمدگی سے بحث کی ہے۔ خط کی خوش سوادی اور کاغذ کی زر افشانی کے تذکرے کئے ہیں۔ یونانی کتابوں کے تراجم سے بحث کی ہے۔ تاریخ و ادب کی نادر کتابوں کی پر شوق نشان دہی کی ہے۔ لیکن کوئی ان موتیوں کا رولنے والا نہیں۔ فرماتے ہیں " کتب خانوں کے ذکر میں مجھ کو نہایت ہی افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ نایاب کتابیں بالکل بیکار ہیں۔ اولاً تو یہ کتب خانے دن میں دو تین گھنٹے کے لئے کھلتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ سال میں تین مہینے تعطیل رہتی ہے۔ ان باتوں کے ساتھ اعلیٰ مذاق کی کمی ہے۔ کہ نایاب اور قدیم کتابیں یوں ہی پڑی رہتی ہیں۔ کوئی شخص ان کو آلٹ کر بھی نہیں دیکھتا البتہ کبھی کبھی غیر ملکوں کے نامور علماء آ نکلتے ہیں۔ ان کو نایاب اور عمدہ کتابوں کی جستجو رہتی ہے۔"

اوقاف کا انتظام

کتب خانے اوقاف کے ساتھ ملحق ہیں۔ اس لئے ان کا اہتمام حکومت کے محکمۂ متعلقہ سے ہے۔ اس وجہ سے کتابوں کے نادر ذخیرے صحیح سلامت چلے آرہے ہیں لیکن شرائط وقف کا احترام انتہا تک پہنچا ہؤا ہے۔ کتب خانہ عاشر آفندی کے لائبریرین کو معمولی خوراک اور دو روپے ماہوار سے زیادہ نہیں مل سکتے۔ لیکن مہتم کتب خانہ کی دیانت بقول مولانا

" حد تک پہنچی ہوئی ہے ۔ کتب خانہ کی دیوار پر انگور کی بیلیں چڑھی ہیں ۔ ایک دن میں نے اس سے کہا اگر تم انگوروں کو بیچ ڈالو تو معقول آمدنی ہو سکتی ہے ۔ کہا کہ واقف کی شرط کے موافق یہ انگور ان لوگوں کے لیے ہیں جو کتب خانہ میں کتابیں پڑھنے کی غرض سے آئیں ۔ اس لئے میں ان سے کسی طرح کا فائدہ نہیں اٹھا سکتا "

ورود مصر

مصر میں پہنچے تو ہر چیز بالخصوص کالجوں ، مکتبوں اور مدرسوں اور ہر قسم کی تعلیم کی نوعیت کا جائزہ لیا ۔ اور دارالعلوم اور جامعہ ازھر پر اپنے خیالات قلم بند فرمائے ۔

جامعہ ازھر

" مجھ کو اپنے تمام سفر میں جس قدر جامع ازھر کے حالات سے مسلمانوں کی بد بختی کا یقین ہوا کسی چیز سے نہیں ہوا ۔ ایک ایسا دارالعلوم جس میں دنیا کے ہر حصے کے مسلمان جمع ہوں ۔ جس کا سالانہ خرچ دو تین لاکھ سے کم نہ ہو ۔ جس کے طالب علموں کی تعداد بارہ ہزار سے متجاوز ہو اس کی تعلیم و تربیت سے کیا کچھ امید ہو سکتی تھی ۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ وہ بجائے فائدہ پہنچانے کے لاکھوں مسلمانوں کو برباد کر چکا ہے اور کرتا جاتا ہے ۔ تربیت معاشرت کا جو طریقہ ہے اور جس کا میں ابھی ذکر کر چکا ہوں اس سے حوصلہ مندی ۔ بلند نظری ۔ جوش ہمت غرض تمام شریفانہ اوصاف کا استیصال ہو جاتا ہے ۔ میں نے یہاں ایسے طلبا دیکھے ہیں جن کے عزیز اور نہایت قریب (چچا ۔ ماموں وغیرہ) خواہ اس شہر میں بڑے بڑے معزز عہدوں پر ہیں اور ان کی تمام ضروریات کے متکفل ہیں ۔ تاہم چونکہ یہ طلبا ازھر میں رہتے ہیں اس لئے ان کو عام بازاروں میں ہاتھ پھیلا کر روٹیاں لینے میں ذرا شرم نہیں آتی ۔ طالب علموں کی ذھانت اور پست حوصلگی کا یہ حال ہے کہ بازاروں میں پیسہ کی ترکاری خریدتے ہیں تو قسم دلاتے جاتے ہیں کہ براس سید نا الحسین یعنی تجھ کو امام حسین کے

سر کی قسم واجبی قیمت بتانا - کیا اس قسم کے تربیت یافتہ لوگوں سے یہ امید ہو سکتی ہے کہ وہ اسلام کی عظمت و شان بڑھائیں گے - ہمارے ملک میں جو اس قسم کے مدرسے ہیں ازھر ان سے بھی گیا گزرا ہے -

ازھر میں نصاب کی نوعیت

اس سے زیادہ تر افسوس تعلیم کی ابتری کا ہے - یہاں مستقل اور اصلی طور پر فقہ اور نحو کی تعلیم ہوتی ہے - اور دونوں کے لئے آٹھ آٹھ برس مقرر ہیں - منطق ، فلسفہ ، ریاضی اور دیگر علوم عقلیہ تو گویا درس میں داخل ہی نہیں - اصول فقہ ، تفسیر ، حدیث ، ادب ، معانی ، بیان کی تعلیم ہے - لیکن اس قدر کم کہ اتنے بڑے دارالعلوم کے کسی طرح شایاں نہیں - نحو اور فقہ جس پر ایک مدت صرف کر دی جاتی ہے ان کی تعلیم محققانہ اور مجتہدانہ نہیں ہوتی - کافیہ وغیرہ کی شرحیں شرحوں کے حواشی اور حواشی کے حواشی پڑھائے اور یاد کرائے جاتے ہیں - شیخ طبان حال میں ایک بزرگ گزرے ہیں - ان کی ایک شرح ہے - اس شرح کو اس قدر مہتم بالشان سمجھا گیا ہے کہ اس کی شرحیں، اور شرحوں کے حاشیے درس میں داخل ہیں - اس تمام سلسلہ کا ضبط و حفظ کرنا بڑا کمال خیال کیا جاتا ہے - چونکہ میں نے خود ازھر میں قیام کیا تھا - اکثر طلباء سے صحبت رہتی تھی - میں ان کو نہایت معمولی اور نا قابل التفات نحو کی بحثوں میں مصروف دیکھتا تھا - اور افسوس کرتا تھا کہ اس لغو تعلیم کا اثر ہے کہ ایک مدت سے ازھر نے کوئی قابل قدر عالم اور مصنف نہیں پیدا کیا - میں نے طلباء سے دریافت کیا کہ شیخ ازھر جو استاد الکل خیال کئے جاتے ہیں ان کی کوئی تصنیف بھی ہے - انہوں نے بڑے فخر سے کہا طبان پر بڑے معرکہ کے حاشئے لکھے ہیں -

زیادہ افسوس یہ ہے کہ تعلیم کسی اصول پر نہیں نہ جماعت بندی ہے نہ کوئی خاص نصاب ہے - نہ امتحان ہوتا ہے - نہ ترقی پانے کے لئے کوئی قاعدہ مقرر ہے - افسوس پر افسوس یہ کہ ان ابتریوں کی اصلاح کی کوئی

تدبیر نہیں - علی پاشا مبارک نے جو ایک زمانہ میں سررشتہ تعلیم کا افسر تھا۔ کچھ اصلاح کرنی چاہی تھی - اس پر ازھر کے تمام علماء اس کے دشمن بن گئے - اور چونکہ شیخ ازھر کا اثر طلباء پر منحصر نہیں ہوتا بلکہ تمام ملک اس کو مذہبی پیشوا تسلیم کرتا ہے۔ اس لئے پاشائے موصوف کو حذر کرنا پڑا - ازھر حقیقت میں ایک ملکی طاقت ہے - اور خود سلطنت اس کی مخالفت پر باآسانی جرآت نہیں کر سکتی -''

دارالعلوم

مصر اور نہ صرف مصر بلکہ تمام ممالک اسلامیہ میں جو کالج مجھ کو سب سے زیادہ پسند آیا اور جس کو میں نے مسلمانوں کے درد کے لئے کافی سمجھا وہ یہی کالج ہے - اور میرا ہمیشہ یہ خیال ہے اورمیں نہایت مضبوطی سے اس پر قائم ہوں کہ مسلمان مغربی علوم میں گو کسی رتبہ تک پہنچ جائیں لیکن جب تک ان میں مشرقی تعلیم کا اثر نہیں ان کی ترقی مسلمانوں کی ترقی نہیں کہی جا سکتی - بے شبہ مشرقی تعلیم کی جو موجودہ اسکیم ہے وہ نہایت ابتر اور غیر ضروری ہے - لیکن اس تعلیم میں ایسی چیزیں ہیں جو مسلمانوں کی قومیت کی روح ہیں اور جس تعلیم میں اس روحانیت کا مطلق اثر نہ ہو وہ مسلمانوں کے مذہب ، قومیت ، تاریخ کسی چیز کو بھی زندہ نہیں رکھ سکتی - جس مصیبت کا ھندوستان میں رونا ہے وہی قسطنطنیہ - بیروت اور مصر میں بھی موجود ہے - یعنی نئی تعلیم اس قابل نہیں کہ دنیا کی موجودہ ضرورتوں کا ساتھ دے سکے - صرف یہ ایک دارالعلوم ہے - دونوں ڈانڈوں کو ملانا چاہتا ہے - اگرچہ افسوس ہے کہ پورا کامیاب نہیں ہؤا - اس کالج کا اول جس کو خیال آیا وہ علی پاشا کا مبارک روشن ضمیر ہے - جس نے مشرقی اور مغربی تعلیم دونوں حاصل کی ہیں اور یورپ کی متعدد زبانیں جانتا ہے - وہ کئی دفعہ مصر کے سر رشتہ تعلیم کا افسر رہ چکا ہے - اس کی تاریخی تصنیفات تمام ممالک اسلامیہ میں پھیلی ہوئی ہیں اور درحقیقت نہایت مفید ہیں - اس نے جامعہ ازھر کی یہی اصلاح کرنی چاہی تھی لیکن ازھر کے شیوخ راضی نہ ہوئے غالباً اس کے بعد اس نے کالج کی بنیاد ڈالی -''

مفتی محمد عبدہ، سے ملاقات

مولانا مصر کے اہل کمال سے ملے - شیخ محمد عبدہ' کے متعلق لکھتے ہیں جو پرانے تعلیم یافتہ ہیں فن ادب میں تمام مصر و شام آن کو استاد الفن تسلیم کرتا ہے - مقامات بدیع کی شرح نہایت قابلیت سے لکھی ہے - روشن ضمیری کے ساتھ نئے مذاق سے آشنا ہیں جس کا سبب جمال الدین افغانی کا فیض صحبت ہے - سید موصوف کا ایک رسالہ عربی میں ترجمہ کیا ہے اور آس کے دیباچہ میں مختصر طور پر آن کی سوانحعمری لکھی ہے - میں اس کے بعض فقرے اس مقام پر لکھتا ہوں جس سے شیخ موصوف کی مہارت فن اور زور تحریر کا اندازہ ہوگا - ہمارے ملک میں جو لوگ فن ادب کو لئے بیٹھے ہیں آن کو اس طرز کی تقلید کرنی چاہیے اور واقعات نگاری کا یہ اسلوب اختیار کرنا چاہیے جہاں سید موصوف جمال الدین افغانی کے حلیہ اور اخلاق و اوصاف کا ذکر آ گیا ہے وہاں لکھتے ہیں (اس کے بعد مفتی صاحب مرحوم کی عربی تحریر کا نمونہ نقل کیا گیا ہے)

میں آن سے ملا تھا - دیر تک لطف صحبت رہی - ازہر کی ابتری' تعلیم پر افسوس کرتے تھے لیکن آس کے ساتھ نئی تعلیم کے بھی شاکی تھے اور کہتے تھے ''ھؤلاء اصل سبیل -'' افسوس ہے کہ گورنمنٹ مصر نے ان کو عہدہ قضا پر مامور کیا ہے - وہ سررشتہ تعلیم کے لئے زیادہ موزوں تھے - چنانچہ خود ہی اس کا افسوس کرتے تھے -

سفر نامہ اور سرسید کی مصلحت کوشی

سید سلیمان ندوی مرحوم نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سفرنامہ چٹ پٹا نہیں روکھا پھیکا ہے تو اس کی ذمہ داری بھی سرسید پرھی عائد ہوتی ہے - فرماتے ہیں کہ روم و یونان کی ۱۸۸۰ کی جنگ میں جب یونان کو شکست ہوئی تو ہندوستان کے مسلمانوں نے روم کی فتح کی خوشی میں خوب دھوم دھام کے جشن منائے گویا انگریزوں کا منہ چڑایا گیا - '' اسی لیے سر سید نے جو ہر حال میں انگریزوں کو راضی رکھنا

چاہتے تھے مسلمانوں کی اس حرکت سے بہت ناراض ہوئے اور اس کے خلاف بہت سخت مضمون لکھا اور اس کی کوشش کی گئی کہ مسلمانوں کے دلوں سے ٹرکی کی یہ عقیدت جاتی رہے اور اتحاد اسلامی کی جو تحریک جڑ پکڑ رہی ہے وہ کمزور پڑ جائے"۔ " جب مولانا واپس آئے تو اسلامی ہندوستان کے حلقہ میں یہ سمجھا گیا کہ معلوم نہیں اس سفر نامہ میں کیا کیا زہر ہو اور اس کا اثر کالج کی زندگی پر جو ہر چیز سے زیادہ عزیز تھی کیسا پڑے ؟ بہرحال جب یہ طے ہو گیا کہ اس سفرنامہ میں شہد ہی شہد رہے گا کوئی زہریلی چیز نہیں ہوگی تو اس کے لکھنے کی اجازت ملی اور وہ لکھا گیا ۔" مولانا شبلی لکھتے ہیں " معلوم نہیں اس سفر نامے سے لوگوں کو کہاں تک دلچسپی ہو گی ۔ اس کا اندازہ ہوتا تو اس قدر جلدیں چھپتیں ؟" جس کا خیال ہر مصنف کو اس مرحلہ پر لازماً پیدا ہوتا ہے ۔ سید سلیمان مرحوم اس سید ہی سے بات پر بھی کالج کو جلی کٹی سنانے سے باز نہ رہ سکے ۔ فرماتے ہیں " مولانا کو خیال تھا کہ اس ادھ کٹے سفرنامہ سے لوگوں کو پوری دلچسپی نہیں ہوگی اس لئے اس کی مقبولیت کی طرف سے دل میں شبہ تھا "مزید فرماتے ہیں؟ " اب تک مولانا کی ساری تصنیفات کالج نے اپنی طرف سے چھپوائی تھیں مگر یہ سفرنامہ ان احتیاطوں کے باوجود بھی شائد اس بارگاہ میں پسندیدہ نہیں ٹھہرا یہی وہ کتاب ہے جس سے کالج اور مولانا کی تصنیفات میں ھذا فراق بینی و بینک کا اصول جاری ہؤا ۔"

مولانا کا یہ شش ماھہ سفر نومبر ۱۸۹۲ء میں ختم ہؤا ۔ بلاشبہ سرسید کو کالج ہر چیز سے عزیز تھا لیکن کیا یہ اشد قومی ضرورت تھی یا سر سید کے ذاتی شوق و نفع کا معاملہ تھا ۔ ہندوستان کے مسلمان اگر شبلی مرحوم کے سفرنامہ میں مولانا کی جادو نگاریاں اور سحر آرائیاں دیکھ بھی پاتے تو کیا ہوتا ۔ کیا اس واقعہ کے بائیس برس بعد عالمگیر جنگ اول میں انگریزوں کی ترکوں سے براہ راست جنگ پیش آ گئی تو تعلیم و ترقی کے میدان میں ۱۸۹۲ء کے مقابلے میں بہت آگے نکل گئے ہوئے ہندی مسلمانوں نے ترکوں کی کوئی خدمت انجام دی ؟ پورا ملک انگریز کی

فوج میں بھرتی ہؤا اور ترکوں کے سینے چھلنی کرتا رہا ۔ انگریز سے کچھ ٹکر لی توکالج کے ان مصلحت شناس کی معنوی اولاد ھی نے لی ۔ مولانا شوکت علی ، محمد علی ، ظفر علی اور دوسرے بہت سے علیگ انگریزوں کی مخالفت میں سر دھڑ کی بازی لگا چکے تھے اور ان لوگوں کی تیس پینتیس سالہ کوششوں نے انگریز کی حکومت کا خاتمہ کر دیا اور آج ہم ترکوں کے اور وہ ھمارے صحیح معنوں میں دست و بازو ھیں کیا اگر یہ سارا قصہ درست ھے تو سفر نامہ کے اسی طرح چھپ جانے سے جیسا مولانا چاھتے تھے یا جیسا اس کا نقشہ سید سلیمان مرحوم کے ذھن میں قائم تھا اس وقت کے اسلامی ھندوستان میں کوئی انقلاب پیدا ھوسکتا تھا ؟ اور پھر جب مولانا سفر نامہ اپنے طور پر شائع کرا رہے تھے تو ان پر کیا پا بندی تھی کیوں انہوں نے جس چیز کو ضروری سمجھا اس سے دست بر دار ھو گئے ؟

سر سید کو یقیناً انگریزوں سے کوئی عشق نہ تھا ۔ انگریز ملک پر مسلط تھے ۔ انتظامی امو ر میں ان کی حکومت مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی برائے نام بادشاھت سے بہتر تھی سر سید نے اپنی قوم کو مصائب سے نجات دلانے کا ایک طویل مدت منصوبہ تیار کیا اور اس پر عمل پیرا ھوئے ۔ جہاں تک ان کی بیباکی کا تعلق ھے غدر کے بعد کس کی ھمت تھی کہ اسباب بغاوت پر کوئی کتاب لکھتا اور اس میں اس صاف گوئی سے کام لیتا جس سے سر سید نے کام لیا ۔

کمشنر کے دربار سے صف اول میں ھندوستانیوں کو جگہ نہ ملنے کے خلاف احتجاج پر آٹھ آنا سر سید ھی کا کام تھا ۔ سر سید یقیناً پین اسلامک پراپیگنڈا کو اس وقت نا مناسب اور غیر مفید سمجھتے ھوں گے ۔ مولانا شبلی کے پیچھے سی ۔ آئی ڈی لگا دی جاتی ۔ طالب علموں کے اعمال نامہ کھل جاتے اور حاصل کچھ نہ ھوتا ۔ لہذا سر سید نے بالفرض مصلحتاً ایسا کیا بھی تو یقیناً اس سے ترکوں کی مخالفت لازم نہیں آتی یہ تو نا مساعد حالات میں بے بسی کا اعتراف تھا ۔ اس سلسلہ میں سر سید کے جو جذبات اور خیالات ترکوں کے متعلق تھے وہ شیخ

محمد عبد اللہ صاحب ایڈ وکیٹ ۔ علی گڑھ کے گرامی نامہ میں جو درج ذیل ہے ملاحظہ فرمائیے ۔کاش دارالمصنفین کے ارباب اختیار مزید ریسرچ سے یہ بتا سکیں کہ مولانا شبلی مرحوم نے سفر نامہ کے وہ چٹ پٹے یا تلخ حصے مرتب بھی فرمائے تھے جو ناپسند اور حذف کئے گئے یا دل و دماغ کے وہ طوفان داستان سرائی کے دفتروں میں مدفون رہے یا سر سید پر تیر اندازی کے لئے کمان کا چلہ؛ بنے رہے آن کا وجود ہے تو انہیں شائع کیوں نہیں کیا گیا قیام پاکستان اور آزادیٔ ہند کے بعد سید سلیمان کو ان رازھائے سر بستہ کی چھرہ نمائی میں کیا دقت در پیش تھی ۔ حیات شبلی میں دس بیس صفحات کی گنجائش نکل آتی ۔ دارالمصنفین کے معزز کارکنوں کو توجہ فرمانی چاہئے اور اگر سفر نامہ کے وہ حصے جو مولانا حذف کرنے پر مجبور ہو گئے تھے مل جائیں تو ان کی اشاعت سے ایک بڑی کمی پوری ہو جائے گی ۔

شبلی — مفکر و مبلغ

شیخ عطا اللہ

جب اقبال کا سورج اقوام کی پیشانیاں اپنے نور سے منور کر دیتا ہے - تو اُن کی نگاہیں دنیا کی تاریخ نہیں تقدیر بھی پلٹ دیتی ہیں - لیکن جب اُن پر ادبار کی گھٹائیں اس قدر گھری چھا جاتی ہیں کہ اُن کے چہروں کی سیاہیاں اور اُن کی بد بختی کی ہولناکیاں انہیں دنیا کے سامنے عبرت مجسم بنا کر پیش کرتی ہیں - جو پتھر چبا ڈالتے تھے، فالودہ اُن کے دانت توڑ دیتا ہے - اگر دور اقبال میں اُن کے سامنے پہاڑ سمٹ کر رائی بن جاتے تھے تو عہد ادبار میں رائی اُن کے سامنے پھیل کر پربت بن جاتی ہے - اگر پہلے موت انہیں دیکھ کر لرز جاتی تھی تو اب موت کا خوف انہیں زندہ درگور رکھتا ہے - یہی دنیا کا آئین ہے - قومیں صفحۂ روزگار پر اپنی قوت و سطوت اپنی حکومت و شرافت، اپنے علم و اخلاق اور اپنی فضیلت و ذہانت کی اسٹ یادگاریں چھوڑ جاتی اور تاریخ کے آغوش میں سو جاتی ہیں - لیکن مسلمان کو اللہ تعالیٰ نے ایک دوام اور ایک ہمیشگی بخشی ہے - اگر وہ ایک زمانہ میں اور دنیا کے ایک حصہ میں شومیٔ اعمال سے سو جاتا ہے تو رحمت ایزدی اسے دوسرے زمانہ اور دوسرے حصہ میں پھر جگا دیتی ہے -

بر صغیر پاکستان میں صدیوں کی فرمان روائی کے بعد ہمارا یہی حال ہوا - عین جس روز ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کی حکومت کا مہتاب گہنا رہا تھا اعظم گڑھ کے افق سے ایک نیا آفتاب ابھرا جو تاریکی کے لئے نور اور مایوسی کے لئے اُمید کی بشارت ثابت ہونے والا تھا -

شبلی مرحوم ہندو راجپوت کے اسلاف میں سے کوئی چار سو سال پہلے ایک بزرگ کو مشرف بہ اسلام ہونے کی سعادت نصیب ہوئی - شیو راج سنگھ ایک نیک بخت مسلمان کی صحبت سے فیض یاب ہو رہے

تھے اور اسلام انہیں اسی طرح کھینچ رہا تھا جس طرح مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے ۔ ایک روز جب گرمی اور لُو کے ستائے ہوئے تھکے ماندے بھوکے پیاسے دوپہر کو گھر پہنچے تو جوتیوں سمیت چوکے میں گھس گئے جہاں اُن کی بھاوج اُن کے لئے کھانا تیار کر کے اُن کے انتظار میں بیٹھی تھی ۔ یہ صورت حال دیکھ کر شیوراج سنگھ پر برس پڑی اور کہا " دیکھتے نہیں ! جوتیوں سمیت گھس آئے ۔ کھانا بھرشٹ کر دیا ۔ تم تو نرے نرک ہو گئے ہو ۔ "

اس طعنہ کا تیر شیوراج سنگھ کی روح میں پیوست ہو گیا وہ خاموش اُلٹے پاؤں اس گھر سے نکلا اور ساتھ ہی مسجد میں جا کر کلمہ پڑھا اور مشرف بہ اسلام ہو گیا یعنی سچ مچ نرک ہو گیا اور دنیا اور آخرت کی تمام شادابیاں اور سیرابیاں اُس کے حصہ میں آ گئیں ۔

جب قوموں پر برا وقت آتا ہے تو اُن کے بچ نکلنے کی اُمید صاحب تدبیر اور جانباز لیڈروں اور عوام کی قربانیوں پر موقوف ہوتی ہے ۔ اور اس کام کے لئے ایک تربیت کی ضرورت ہے ۔ خدا کا شکر ہے پرانی تعلیم نے سلطنت مغلیہ کے مٹ جانے پر اور اس سے کچھ پہلے ایسے لوگ پیدا کر دئے جنہیں روشن ضمیری کے ساتھ ساتھ خدمت ملت کی لگن بھی لگی ہوئی تھی ۔

خوش آں قومے پریشاں روز گارے
کہ زاید از ضمیرش پختہ کارے

نمودش سرے از اسرار غیب است
بروں ناید ز ہر گردے سوارے

غدر کے بعد مسلمانوں کا قافلہ لٹ چکا تھا اُن کی جرأت اور جانبازی اور تدبر کی فوجیں ختم ہو رہی تھیں اور قافلہ کے گذر جانے کے بعد صرف ایک گرد اڑ رہی تھی یہ اُن کی خوش قسمتی تھی کہ اُس گرد میں سے کتنے ہی سوار نہیں شہ سوار نمودار ہو گئے سر سید ، محسن الملک ، وقارالملک ۔ نذیر احمد ، حالی ، شبلی ، مولانا محمد علی ، اقبال اور سب سے آخر اور

سب پر مقدم حضرت قائد اعظم - ان شہ سواروں میں شبلی کو ایک بڑا مرتبہ حاصل تھا اور متعدد اعتبارات سے وہ ایک ہمہ گیر بیداری اور دعوت اسلام کے سب سے موزوں مبلغ تھے -

مولانا شبلی نے اسلام اور مسلمان کی جو گوناگوں اور گراں قدر خدمات انجام دی ہیں اُن میں سے میں اس وقت صرف ولولۂ اشاعت اسلام کا مختصر سا ذکر کروں گا -

دھلی اور یو - پی کے ایک بہت بڑے علاقہ میں ایک زمانہ میں جو ھندو مشرف بہ اسلام ہو گئے تھے - آریہ لوگوں نے انہیں تر نوالہ سمجھ کر ۱۹۰۸ء میں مرتد کرنے کی مہم شروع کی - یہ مہم ۱۹۲۲ء کے لگ بھگ اُسی علاقہ میں دوبارہ شروع کی گئی اور آج بھی ھندوستان میں چپکے چپکے ارتداد کی یہ مہم اُس سیکولر حکومت کے زیر سایہ سیاسی و مذھبی اغراض کے پیش نظر جاری ھے -

بہر حال جب یہ جھکڑ شبلی کی زندگی میں اٹھا تو اُسے شبلی کے دم قدم سے ایک آندھی کا مقابلہ کرنا پڑا - راجپوتوں کی کانفرنس میں پہلے پہل مولانا نے یہ سوال اٹھایا اور مقابلہ کا منصوبہ تیار کیا - میں نے جس قدر مولانا کی زندگی کا مطالعہ کیا ھے اس قدر شدت کے ساتھ مجھ پر یہ حقیقت روشن ہوتی گئی ھے کہ مولانا اس طریق سے جسے آج ہم کامیابی کی کنجی اور حل مسائل کا موثر ترین طریقہ سمجھتے ھیں- یعنی منصوبہ بندی ، خوب واقف تھے اور اُسے ھمیشہ برتتے تھے-

شدھی کے مقابلہ میں بھی اُنہوں نے یہی طریق اختیار کیا - ارتداد کے اسباب کا تجزیہ کیا اور اُس کے انسداد کے طریقے مرتب کئے اور مقابلہ کے لئے ساز و سامان بہم پہنچایا - ارتداد کا سبب اُن کی نظر میں یہ تھا کہ ان لوگوں کی مسلمان ہو جانے کے بعد صحیح اسلامی تربیت ھی نہیں ھوئی بلکہ اسلامی معلومات سے بھی وہ صدیوں سے بے بہرہ چلے آتے ھیں- نام کے مسلمان ھیں بلکہ اکثر اوقات ھندوانہ ذھنیت رسم و رواج اور طور طریقوں کے ساتھ اُن کے ھندو نام بھی اب تک قائم

ہیں۔ اگر یہ لوگ آریہ جال میں پھنس جائیں تو اُن کا کیا گناہ ہے۔ صدیوں کی اسی غفلت کی تلافی اب ہونی چاہئے اور ان لوگوں کی اسلامی تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا جانا چاہئے۔

اس کا فوری علاج تو یہ ہے کہ سمجھدار علماء حضرات میدان میں کود پڑیں اور جہاں جہاں آریہ لوگ یہ فتنہ پھیلا رہے ہیں وہاں وہاں مسلمانوں کو مناظرہ کر کے اس جال سے بچائیں۔ ان لوگوں کو یہ نہ محسوس کرنے دینا چاہئے کہ اُن کا پرسان حال کوئی نہیں یا پھر مسلمانوں کے پاس اسلام پر آریوں کے اعتراضات کا کوئی جواب نہیں۔

چونکہ کام ایک بہت بڑے علاقہ میں اور لاتعداد دیہات میں پھیلا ہوا ہے اس لئے مبلغین کی ایک مستقل جماعت تیار ہونی چاہئے جو نہ صرف مسلمانوں کو بچائے بلکہ مخالف کے مذہب کی ایسی خامیاں بیان کر سکے جسے راجپوت بہ آسانی سمجھ سکیں۔ مستقل انتظام کے لئے ایسے مبلغ تیار کئے جائیں جو سنسکرت سے واقف اور ہندوؤں کی مذہبی کتابوں کا ایسا علم رکھتے ہوں کہ اُن کے پرچارکوں کے چھکے چھڑا سکیں۔

تمام کام خاموشی سے ہونا چاہئے تاکہ دشمن جس کے پاس فوج اور سامان زیادہ ہے بھڑک نہ اٹھے۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ اشاعت اسلام کا نام لیا جائے۔ مسلمانوں کی دینوی تعلیم کے پردے میں دیہات میں معمولی پڑھے لکھے معلم بھیجے جائیں جو وہاں مستقل مکاتب قائم کریں اور ساتھ ہی ساتھ اہل دیہات کو روزہ نماز اور دوسرے ارکان اسلام سے باخبر کرتے رہیں۔ لہٰذا ایسے لوگوں کے لئے دو تین ماہ کا ایک تربیتی کورس تیار کرایا اور خدام الدین کی ایک جماعت کی بنیاد ڈالی راجپوت نومسلم جن دیہات میں رہتے تھے وہاں سے معلومات فراہم کرنے کے لئے ایک فرد مرتب فرمایا جس کے ماتحت گاؤں گاؤں سے مسلمانوں کی تعداد، اُن کی عورتوں بچوں کی تعداد، پڑھے ہوؤں اور ان پڑھوں کی تعداد؛ اُن کے پیشے، اُن کی مالی حالت اور اُن کی مذہبی معلومات کا ایسا نقشہ خود مرتب کر کے دکھایا کہ

کوئی سپہ سالار جنگ کے لئے بھی ایسی تیاری نہیں کرتا - خود دورے کئے - ایک تنظیم استوار کی اور اس کام میں لگ گئے اور اسی سلسلہ کے پیش نظر اور ھندوستان میں مسلمانوں کے مستقبل سے متردد ھو کر فرمایا ” میں نے مسلمانوں کی تیرہ سو سال کی تاریخ کا نہایت احتیاط سے مطالعہ کیا ھے - میں اس کے مختلف ملکوں اور دوروں کی تاریخ سے بخوبی واقف ھوں لیکن میں پوری ذمہ داری سے یہ اعلان کر سکتا ھوں کہ مجھے نہیں معلوم کہ مسلمانوں پر کسی ملک اور اپنی تاریخ کے کسی دور میں وہ مصیبت آئی ھو جو آج ھندوستان میں اُن پر مسلط ھے اور اگر اس کے خلاف اُن کی حفاظت کا اہتمام نہ کیا گیا تو اس ملک میں اُن کا مذھب ختم ھو جائے گا اور اُن کی ثقافت برباد ھو جائے گی - “

مولانا نے انگریزی پڑھے مسلمانوں کے لئے جو انگریزی کتابوں سے زھر حاصل کرتے تھے قرآن کریم کے انگریزی ترجمہ کی طرف مسلمانوں کو توجہ دلائی اور اس کا اہتمام کیا - کئی سال عماد الملک بلگرامی محنت کرتے رھے لیکن ترجمہ سولہ پارہ سے آگے نہ بڑھ پایا -

مولانا کے ارادے نہایت بلند تھے - وہ دوسرے ممالک میں بھی مبلغین اسلام بھیجنا چاھتے تھے لیکن موت نے مہلت نہ دی -

نظم علامہ شبلی مرحوم

جسے عزیزی فیاض احمد (سال دوم) نے علامہ شبلی مرحوم کے صد سالہ جشن ولادت کے جلسہ میں پڑھ کر سامعین سے داد و تحسین حاصل کی۔

تم کسی قوم کی تاریخ اٹھا کر دیکھو
دو ہی باتیں ہیں کہ جن پر ہے ترقی کا مدار

یا کوئی جذبۂ دینی تھا کہ جس نے دم میں
کر دیا ذرۂ افسردہ کو ہم رنگ شرار

ہے یہ وہ قوت پر زور کہ جس کی ٹکر
سنگ خارا کو بنا دیتی ہے اک مشت غبار

اس کی زد کھا کے لرز جاتی ہے بنیاد زمیں
اس سے ٹکرا کے بکھر جاتے ہیں اوراق دیار

یہ اسی کا تھا کرشمہ کہ عرب کے بچے
کھیلنے جاتے تھے ایوانگۂ کسریٰ میں شکار

وہ الٹ دیتے تھے دنیا کا مرقع دم میں
جن کے ہاتھوں میں رہا کرتی تھی اونٹوں کی مہار

اس کی برکت تھی کہ صحرائے حجازی کی سموم
بن گئی دھر میں جا کر چمن آرائے بہار

یہ اسی کا تھا کرشمہ کہ عرب کے رہزن
فاش کرنے لگے جبریل امیں کے اسرار

شبلی اور سیرۃ النبی

شیخ عطا اللہ

متحدہ ہندوستان کے جن مسلمانوں نے اپنے ہم مذہبوں کی مصیبت میں دستگیری و رهنمائی کی اُن میں سے ہر ایک کو حضور سرور کائنات صؐ سے عشق تھا اور وہی عشق اُن کے لئے خدمت و عشق ملت کا محرک بنا - سر سید اور اقبال عاشقان رسول صؐ تھے اور اسی عشق کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے اپنی زندگیاں اپنے اپنے طریق پر مسلمانوں کی بہتری و خدمت میں صرف کیں - شبلی بھی اُسی جام سے سرشار تھے - جس زمانہ میں 'الکلام' زیر تصنیف تھی اپنے ایک قابل شاگرد سے فرمایا "وجود باری تعالٰی پر اپنے قوی سے قوی دلائل پیش کرو -" وہ ایک ایک کر کے متداول عقلی دلیلیں پیش کرتے رہے - مولانا ہر دلیل کا نہایت معقول منطقی توڑ بیان فرماتے رہے اور جب شاگرد کے پاس دلائل کا ذخیرہ ختم ہو گیا تو اُس نے جھلا کر کہا تو "پھر کیا جو کچھ محمد رسول اللہ ہمیں لکھا گئے ہیں وہ نعوذ باللہ جھوٹ تھا" مولانا نے منطق کے تمام ہتیار ڈال دئے اور دیر تک آنسوؤں کی جھڑی بندھ گئی- جب طبیعت سنبھلی تو فرمایا -

با خدا دیوانه باش و با محمد هوشیار

مجھے باوجود تلاش ان کی کوئی نعت نہیں ملی اور شاید انہوں نے نعت لکھی بھی نہیں کیونکہ عرفی کی زبان سے اس کی ہم خیالی اور تائید میں فرمایا کرتے تھے -

عرفی مشتاب ایں رہ نعت است نہ صحراست
آہستہ کہ رہ بر دم تیغ است قدم را
ہشدار کہ نتواں بیک آہنگ ستودن
نعت شہ کونین و مدیح کے و جم را

اور سیرت کے متعلق اتنا اونچا خیال تھا کہ سمجھتے تھے کہ یہ فرشتوں سے بھی بالاتر ہستی کا کام ہے ۔ چنانچہ ایک موقعہ پر اپنے پیش نظر معیار کی بلندی کی بنا پر فرماتے ہیں ۔

فرشتوں میں یہ چرچا ہے کہ حال سرور عالمؐ
دبیر چرخ لکھتا یا کہ خود روح الامیں لکھتے

صدا یہ بارگاہ عالم قدوس سے آئی
کہ ہے یہ اور ہی کچھ چیز لکھتے تو ہمیں لکھتے

علی گڑھ کی محفلوں میں جب میلاد کے چرچے ہوئے تو شبلی نے بدءالاسلام کے زیر عنوان سیرۃ پر ایک مختصر رسالہ لکھا ۔

دوران قیام حیدر آباد میں مولانا نے سیرۃ لکھنا شروع کی اور تین ہجری تک کے واقعات قلمبند بھی کر لئے ۔ لیکن اس کا تذکرہ کبھی کسی سے نہیں کیا ۔ ارباب نظر کا کہنا ہے کہ یہ مسودہ جو اب بھی دارالمصنفین میں موجود ہے مولانا کے معیار پر پورا نہ اترا اور ادھورا چھوڑ دیا گیا ۔

آکسفورڈ کے پروفیسر مارگولیتھ نے ۱۹۰۵ء میں محمد ص کے زیر عنوان ایک زہریلی کتاب لکھی ۔ ۱۹۰۶ء میں مولانا شبلی مسٹر محمد علی جوہر کی درخواست پر اُن کے پاس بڑودہ پہنچے تو مسٹر محمد علی نے تالیف سیرۃ کی ضرورت پر زور دیا اور وعدہ لے لیا ۔

شبلی مرحوم کے دل و دماغ میں معلوم نہیں کیا کاوشیں کروٹیں لے رہی تھیں اور کیا کیا تامل دامن گیر ہوتے تھے ۔ کیا کیا تیاریاں زیر غور تھیں ۔ آخر ۱۹۱۲ء میں مولانا نے اپنے عزم تالیف سیرۃ کا اعلان فرما دیا اور اس ضرورت کی علت خود بیان فرما دی ۔

”سیرت نبوی کی ضرورت اس لحاظ سے اور بڑھتی جاتی ہے کہ قوم میں جدید تعلیم وسعت سے پھیلتی جاتی ہے اور یہی جدید تعلیم یافتہ گروہ ایک دن قوم کی قسمت کا مالک ہوگا ۔ یہ گروہ آنحضرت صلی اللہ

علیه و سلم کے حالات زندگی اگر جاننا چاهتا هے تو اردو میں کوئی مستند کتاب نہیں ملتی۔ اس لئے اس کو چار و ناچار انگریزی تصنیفات کی طرف رجوع کرنا پڑتا ھے جن میں یا تعصب کی رنگ آمیزیاں ھیں یا ناواقفیت کی وجه سے هر موقع پر غلطیاں هیں۔ میں ایک مدت سے ان باتوں کا احساس کر رها تها لیکن اس بناء پر قلم اٹھانے کی جرأت نہیں ہوتی تھی که آنحضرت صلی الله علیه و سلم کے واقعات میں ایک حرف بھی صحت کے معیار سے ذرا اتر جائے تو سخت جرم ہے۔ قوم کی طرف سے ایک مدت سے تقاضا ہے که میں سب کام چھوڑ کر سیرت نبوی کی تالیف میں مصروف ہو جاؤں۔ خود میں بھی اپنی پہلی رائے سے رجوع کر چکا هوں اور اس شدید ضرورت کو تسلیم کرتا ہوں۔

مولانا نے اس اعلان کے بعد ایک سوچے سمجھے منصوبے کے ماتحت کام شروع کیا۔ مولانا نے پچاس هزار روپے یکمشت یا اڑھائی سو روپیه ماهوار کے عطیه کا مطالبه کیا۔ کتابوں کی خریداری کے لئے علیحده فنڈ کی ضرورت تھی۔ مولانا کے اراده کے اعلان کی دیر تھی غلامان محمد آگے بڑھے اور چاها که سونے چاندی کا ڈھیر ان کے قدموں میں جمع کر دیں لیکن مولانا کا اضطراب بڑھتا جاتا تھا۔

نواب سلطان جہاں بیگم والیۂ بھوپال نے دنیا اور عاقبت کی سرخروی دو سو روپیه ماهوار کی امداد سے خرید لی۔ ان کے جواں بخت و جواں سال بیٹے نواب حمید الله خان نے کتابوں کے لئے دو هزار روپیه دیا اور جب دو سال کا ابتدائی وظیفه ختم هوا تو وظیفه تا تکمیل بڑھا دیا گیا۔ مولانا کو اطمینان نصیب هوا اور انہوں نے لکھا:

مصارف کی طرف سے مطمئن هوں میں بہر صورت
که ابر فیض سلطان جہاں بیگم زر افشاں ہے

وهی تالیف و تنقید روایت هائے تاریخی
تو اس کے واسطے حاضر مرا دل ہے مری جاں ہے

غرض دو ہاتھ ہیں اس کام کے انجام میں شامل
کہ جس میں اک فقیر بے نوا ہے ایک سلطاں ہے

اب مولانا نے کام شروع کیا۔ یورپین زبانوں کی کتابوں کا ترجمہ کرانے کے لئے نئے تعلیم یافتہ طبقہ کے لوگ جمع کئے اور ایک ایک کتاب بانٹ دی۔ جب کچھ مدت بعد دیکھا کہ یہ معاملہ بہت مہنگا اور اس کی تکمیل کی رفتار بہت سست ہے تو مکمل ترجمہ کے بجائے یہ طے پایا کہ دین سے محبت رکھنے والے قابل انگریزی دانوں میں مختلف کتابیں بانٹ دی جائیں اور ان سے کہا جائے کہ پڑھ کر قابل اعتراض مقامات پر نشان لگا دیں۔

عربی کے مدد گار مقرر کئے گئے جن کا کام حوالوں کی تلاش اور واقعات اور حالات کی جستجو تھی۔ مولانا نے زندگی کے ہنگاموں سے دور بمبئی میں پر سکون مقام پر کام شروع کیا۔ بیچ میں دوسرے کاموں کے لئے کلکتہ، ڈھاکہ لکھنؤ اور حیدرآباد تک آنا جانا ہوتا رہا۔ لیکن کام جاری رہا۔

سو صفحات لکھ چکے تو دیکھا کہ وہ نظر ثانی میں کچھ کا کچھ ہو گئے۔ فرماتے ہیں:

" یورپ کی غلط بیانیوں کا ایک دفتر ہے۔ ان کے ایک ایک حرف کے لئے سینکڑوں اوراق آلٹنے پڑتے ہیں۔ یہ کمبخت لکھتے تو جھوٹ ہیں لیکن یہ پتہ نہیں لکھتے۔ یہاں ہمارے سیرت نگاروں نے خود بہت بے احتیاطیاں کیں۔"

بالاخر ایک جلد انہوں نے ختم کر لی۔ نمونہ الہلال میں چھپا تو مخالفین نے آسمان سر پر آٹھا لیا۔ بیگم بھوپال کے پاس شکایتیں پہنچیں۔ شبلی ۱۹۱۴ء اکتوبر میں اپنے بھائی کی وفات پر اعظم گڑھ لوٹ آئے اور کتاب کی ناتمامی کا داغ حسرت لئے ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کو راھی ملک عدم ہوئے۔ بستر مرگ پر اپنے شاگرد رشید کو نصیحت اور وصیت فرمائی۔ "سیرت میری تمام عمر کی کمائی ہے۔ سب کام چھوڑ کر سیرت تیار کر دو۔"

سیرت ہی کو سرمایۂ آخرت سمجھتے تھے - اپنی زندگی کو اس تعلق سے کس قدر مطمئن سمجھتے تھے :

عجم کی مدح کی ، عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چندے مقیم آستانِ غیر ہونا تھا

مگر اب لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبر خاتم
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

علامہ شبلی بحیثیت فارسی شاعر کے

مرزا احسان احمد

بیاورید گر این جا بود سخن دانے
غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد

یہ وہ ذات گرامی ہے جو جامعیت کمالات کے لحاظ سے نہ صرف ہندوستان ، بلکہ تمام دنیائے اسلام کے لئے سرمایۂ فخر و ناز تھی ۔

واقعہ یہ ہے کہ قدرت نے علامۂ مرحوم کو ایک غیر معمولی دماغ عطا کیا تھا ، جس میں گونا گوں صلاحیتیں پنہاں تھیں ۔ ان صلاحیتوں نے علم و فن کی جو گراں قدر اور مہتم بالشان خدمات انجام دی ہیں ، ان کے اعتراف میں کسی صاحب نظر کو تامل نہیں ہو سکتا ۔ اور نہ ان کی کوئی مثال موجودہ دور کے ارباب فن کے علمی کارناموں میں نظر آسکتی ہے ۔

گو سیرۃ نبوی ، الفاروق ، الغزالی ، الکلام ، سیرۃ النعمان ، سوانح مولانا روم کے مصنف کے لئے شاعری کوئی خاص نشان فخر نہیں ہے تاہم علامہ مرحوم کی زبان سے جو ترانہ ہائے موزوں ادا ہوئے ہیں مشکل ہے کہ من حیث الفن نظر انداز کر دئے جائیں ۔

علامہ مرحوم کا مذاق سخن بالکل فطری تھا ، اس میں تصنع و تکلف کا قطعاً شائبہ نہ تھا ۔ وہ شاعری اس لئے نہیں کرتے تھے کہ کوئی مستقل دیوان مرتب کریں ۔ قدرت نے ان کو اس سے بلندتر کاموں کے لئے پیدا کیا تھا لیکن چونکہ فطرتاً شدید الاحساس تھے ، اور طبیعت میں شاعرانہ رنگینی اور لطافت موجود تھی ، اس لئے جب کوئی مؤثر واقعہ یا منظر سامنے آتا تھا تو بے اختیار ان کا قلم گہر باری کرنے لگتا تھا ۔ شاعر کی حقیقی شان کمال یہی ہے کہ جو کچھ اس کی زبان سے

ادا ہو اس سے خود اس کا دل بھی متاثر ہو ۔ ورنہ محض لفظی بازی گری اور صناعی سے شعر میں کوئی تاثیر اور دلکشی پیدا نہیں ہوسکتی ۔ چنانچہ ایسی شاعری جو قلب و روح کے لئے کوئی سامان کیف و لذت پیش نہ کر سکتی ہو کیا چیز ہے ؟ اس کو خود علامہ مرحوم ھی کی زبان سے سننا چاہئے ۔ فرماتے ھیں :

شعر اگر دامن دل می نکشد بانگ خراست
نغمہ گر نیست دل آشوب بغوغا ماند

علامہ مرحوم اگرچہ اُردو کے اعلیٰ ترین انشاء پرداز تھے ، لیکن ابتداء میں اُردو میں شعر گوئی کی طرف بہت کم توجہ تھی ، البتہ اواخر عمر میں علامہ مرحوم نے تاریخی ، سیاسی ، قومی اور اخلاقی نظمیں لکھ کر اردو ادب میں جو گراں قدر اور عدیم المثال اضافہ کیا ھے وہ کسی بحث و اثبات کا محتاج نہیں ، لیکن حقیقت یہ ھے کہ علامۂ مرحوم کی شاعرانہ رنگینی ، لطافت اور نازک خیالی کی اصلی تماشا گاہ ان کی فارسی شاعری ھے ، جو اپنی گوناگوں خصوصیات کے لحاظ سے اھل زبان اساتذہ کے کلام کےمقابلہ میں نہایت فخر کے ساتھ پیش کی جا سکتی ھے ۔ علامہ مرحوم کو خود اپنی اس عظمت کا احساس تھا چنانچہ ایک غزل کے مقطع میں فرماتے ھیں :

روشنم شد زنواسنجیٔ شبلی امروز
ہند را نیز قمی ھست و صفاھانی ھست

یہ صرف شاعرانہ تعلی نہیں ھے بلکہ ایک ناقابل انکار حقیقت ھے جس کی تائید خود کلام سے ھوتی ھے ۔

علامہ نے جس زبان میں اپنے خیالات و جذبات کا اظہار کیا ھے ، اس کی پاکیزگی اور لطافت کی داد کچھ اھل ایران ھی صحیح طور پر دے سکتے ھیں چنانچہ اھل ھند سے مایوس ھو کر کس حسرت سے فرماتے ھیں :

شبلیا کیست کزو داد سخن می خواهی
گر نظیری نبود ، شیخ حزیں می باید

علامہ مرحوم کو انکسار بے جا کی عادت نہ تھی ۔ غالباً قافیہ کی رعایت سے شیخ حزیں کا نام لے لیا ہے ورنہ جہاں تک کلام کا تعلق ہے علامہ کا درجہ بہت بلند ہے لیکن یہ موازنہ کرنے کا موقع نہیں ۔ اس وقت ہم علامہ کے کلام پر صرف ایک اجمالی نظر ڈالنا چاہتے ہیں جس سے ارباب ذوق کو اندازہ ہو جائے گا کہ علامہ کے قندپارسی میں کس حد تک شیرینی اور لطافت کا عنصر موجود ہے اور وہ اہل ایران کے کام و دہن کو کہاں تک سیراب کر سکتا ہے ۔

علامہ مرحوم کا فارسی کلام پہلے متفرق طور پر دیوان شبلی ، دستۂ گل ، بوئے گل و برگ گل کے نام سے شائع ہؤا تھا جن کو علامہ کی وفات کے بعد معارف پریس نے یکجا کر کے کلیات شبلی کے نام سے شائع کیا ہے ۔

یہ کلیات قصائد ، غزلیات ، مراثی اور دیگر مسلسل نظموں کا مجموعہ ہے جس سے علامہ مرحوم کی قادرالکلامی کا کافی طور پر اندازہ ہوتا ہے ۔

یوں تو اس کلیات میں جو کچھ ہے اس کے محاسن سے کون انکار کر سکتا ہے ، لیکن واقعہ یہ ہے کہ علامہ مرحوم کی شاعرانہ رنگینی ، زندہ دلی ، جوش و مستی ، نازک خیالی ، اور شوخی و رعنائی کا دلفریب منظر کچھ غزلیات ہی میں نظر آتا ہے ، جو اکثر بمبئی کی ولولہ انگیز آب و ہوا کی مرہون اثر ہیں ۔ ظاہر ہے کہ چوپاٹی اور اپالو کے دلکش مناظر ایک رنگیں مزاج شاعر کے احساسات کو مشتعل کئے بغیر نہیں رہ سکتے ۔ چنانچہ علامہ مرحوم کے دل و دماغ پر بمبئی کے آشوب گہ حسن و جمال نے جو اثر کیا ہے اس کا اندازہ ذیل کی غزل سے ہوسکتا ہے ۔

نثار بمبئی کن ہر متاع کہنہ و نورا
طراز مسند جمشید و فر تاج خسرو را

بہر سو از هجوم دلبران شوخ و بے پروا
گذشتن از سر رہ مشکل افتادست رهرو را

فغان از گرمئی هنگامۂ خوبان زردشتی
بہم آمیخته از زلف و عارض ظلمت و ضو را

بده ساقی مئے باقی که در جنت نخواهی یافت
کنار آب چوپاٹی و گلگشت اپالو را

یہ خواجہ حافظ کے آب رکنا باد اور گلگشت مصلیٰ کا جواب ہے۔ مقطع ملاحظہ ہو۔

بیا شبلی بیاد پنجہ گیرائی مژگانش
دگر رہ پارہ سازم ایں قبائے زهد صد تورا

ایران کے غزل گو شعرا میں سے علامہ مرحوم خواجہ حافظ کے خاص طور پر مداح اور معتقد تھے اور یہ ان کی صحت مذاق کی بہت بڑی دلیل تھی۔ ایک غزل میں اپنے جوش عقیدت کا اظہار ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

گر خدا وندی هوس داری در اقلیم سخن
بندگیٔ حافظ شیراز می بایست کرد

یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ خواجہ حافظ کی طرح علامہ مرحوم بھی فطرتاً نہایت شگفتہ مزاج ، رنگیں طبع اور بلند حوصلہ تھے اور اپنے پہلو میں ایک زندہ اور بیدار دل رکھتے تھے ، جس کے احساسات میں بجز بلندی و رعنائی اور جوش و مسرت کے کسی قسم کی روحانی پستی یا ابتذال کا شائبہ نہ تھا ، یہی وجہ ہے کہ خواجہ صاحب کی طرح علامۂ مرحوم کی غزلیات میں بھی یاس و حسرت ، گریہ و زاری وغیرہ کے ولولہ شکن جذبات کی آلائش نظر نہیں آتی ، بلکہ ہر قدم پر ایک زندہ اور کیف آشنا روح کی آتش فشانیاں محسوس ہوتی ہیں اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ سرور و انبساط کی ایک موج گہر پاش اپنی نظر افروز تابانیوں اور ولولہ انگیز رعنائیوں کے ساتھ رقص کرتی ہوئی چلی جا رہی ہے علامۂ مرحوم

نے کیا خوب اور کس قدر سچ کہا ہے :

بر چین زروئے صفحہ کہ شبلی بہ سر خوشی
از ہم گسست سلک گہرہائے راز را

حقائق نگاری

ایک زندہ دل اور عالی دماغ شاعر ہی ارباب ذوق کو یہ دعوت دے سکتا ہے ۔ علامہ مرحوم علاوہ ایک شاعر غزل خواں ہونے کے فلسفی، حکیم اور نقاد بھی تھے ، اس لئے ان کی نظر غارت گران عقل و ہوش کی سحر آفریں اداؤں کے علاوہ اسرار و حقائق کی بھی جلوہ شناس تھی ۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں ۔

عالم کائنات کی حقیقت کا انکشاف فلسفی کے بس کی چیز نہیں ۔ وہ ایک راز کھولتا ہے تو وہ بجائے خود ایک دوسرا مستقل راز بن جاتا ہے ۔ اس سلسلۂ تحقیقات کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اصل حقیقت کی تہہ تک پہنچنے سے عقل قاصر رہتی ہے اور آخر میں اس کو اپنی عاجزی اور درماندگی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے :

فلسفی سر حقیقت نتوانست کشود
گشت راز دگر آن راز کہ افشا می کرد

عشق و محبت کی راہ میں دو دل ہونا سالک کے لئے بہت بڑا عیب ہے یعنی انسان جس رنگ میں ہو وہ پختہ اور کامل ہو اور اس میں کسی اور رنگ کی آمیزش نہ ہو ۔ کفر ہو یا ایمان ، اگر یک رنگی نہیں تو وہ ایک بے کیف عالم ہے ۔

دو دل بودن دریں رہ سخت تر عیبے ست سالک را
خجل ہستم زکفر خود کہ دارد بوئے ایماں ہم

اس لطیف حقیقت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے؟ طلب صادق کا یہی تقاضا ہے کہ قدم جس راہ میں آٹھ گیا ہے اس کو چھوڑ کسی اور طرف رخ نہ کرنا چاہئے ۔ ذوق پرستش کا یہی کمال ہے کہ جبین نیاز نے جس کو اپنا معبود بنا لیا ، اس کے سوا کسی اور کی بندگی کی طرف مائل نہ

ہونے پائے - غرض دو رنگی سے قلب و روح میں کیف و انبساط اور محویت و استغراق کی وہ کیفیت پیدا نہیں ہوسکتی ، جس کے بغیر ادعائے عبادت بالکل بے سود ہے -

یہ وہ شعر ہے جس کی داد خاص طور پر مولانا حالی نے اپنے ایک خط میں علامۂ مرحوم کو دی تھی اور یہ لکھا تھا کہ " خواجہ حافظ کے کلام کا وہ حصہ جو رندی و سرمستی پر مشتمل ہے ممکن ہے کہ اس کے الفاظ میں دلربائی ہو لیکن جہاں تک جذبات کا تعلق ہے آپ کی غزلیں کہیں زیادہ گرم ہیں -" اس اظہار خیال کے بعد مولانا نے شعر مذکور نقل کیا ہے اور لکھا ہے کہ ہر شخص اس کی داد نہیں دے سکتا اور نہ اس سے صحیح طور پر لطف اٹھا سکتا ہے -

عشقیہ شاعری

علامہ مرحوم نے عشق و محبت کو جس نگاہ سے دیکھا وہ ایک بندۂ ہوس کی سطحی اور عامیانہ نگاہ نہ تھی بلکہ ایک صاحب ذوق کی بلند اور نکتہ سنج نظر تھی جس کو ہر قسم کا جلوہ فریفتہ نہیں کر سکتا تھا چنانچہ علامہ نے اپنی اس بلند نگاہی کا اظہار خود اس شعر میں کر دیا ہے -

ہر جلوۂ مرا نتواند فریب داد
پروانۂ چراغ سر طور بودہ ایم

یہ محض شاعرانہ تعلی نہیں ہے بلکہ اس کا ثبوت کافی طور پر خود کلام سے ملتا ہے - چند مثالیں ملاحظہ ہوں -

عشق و محبت ایک نہایت بلند اور نازک مقام ہے جس کے ہمت آزما اور پر پیچ مراحل کو ہر شخص کامیابی کے ساتھ طے نہیں کر سکتا - اس کے لئے قلب و نگاہ کی مخصوص استعداد و صلاحیت درکار ہے جو ظاہر پرستوں کا کام نہیں ہے -

در کار عشق، دیدہ وری شرط بودہ است
ہر کس نظر کشود و تماشا بما رسید

یعنی یوں تو ہر شخص جمال محبوب پر نظر اٹھاتا ہے لیکن اس کا

حقیقی جلوہ صرف چشم بصیرت ہی کو نظر آ سکتا ہے ۔ اسی خیال کو ایک دوسری جگہ اس سے لطیف تر طریقہ پر ادا کیا ہے ۔ فرماتے ہیں ۔

چشم ہر آں چہ دید نہ ہر دیدہ بنگرد
نظارۂ جمال تو عام است و عام نیست

غور کرو کتنا صحیح اور لطیف خیال ہے اور اس کو ”عام است و عام نیست“ کے ٹکڑے نے کس مؤثر انداز سے ادا کر دیا ہے یعنی جمال محبوب کی مخصوص اداؤں کا نظارہ صرف اہل نظر کا کام ہے اس لئے اس کو عام نہیں سمجھنا چاہئے ۔ اگرچہ بظاہر عام معلوم ہوتا ہے ۔ جلوہ گاہ کائنات پر اصحاب ظاہر کی بھی نگاہیں پڑتی ہیں لیکن اس ظاہری آب و رنگ کی تہ میں محرمان حقیقت کو جمال ازل کی جو ضوفشانیاں نظر آتی ہیں وہ ان بزرگوں کو کہاں نصیب ہو سکتی ہیں ۔

محبوب کی نگاہ لطف و کرم سے لذت اندوز ہونا نہایت آسان ہے اور یہ عشق کا کوئی کمال نہیں ۔ ارباب ظاہر تو صرف اسی کے آرزو مند رہتے ہیں ۔ چشم عتاب آلود کی کرم فرمائیوں کا تحمل اور ان سے ذوق و لذت حاصل کرنا ان کی استعداد سے باہر ہے ۔ یہ صرف ایک طالب صادق کا کام ہے اور عشق کے حقیقی کمال و عظمت کی شان یہی ہے کہ جب محبوب کی برق ستم کی شرر افشانیوں کا سامنا ہو تو اپنے ذوق و شوق کا دامن مستانہ وار پھیلا دے اور آنکھوں سے درد و غم کے آنسو ٹپکنے کے بجائے چہرے پر کیف و سرور کی ایک موج تبسم رقص کرتی ہوئی نظر آئے ۔ ایک قابل دل پر محبوب کے خشم و عتاب کا کیا اثر ہوتا ہے ؟ اس کی کیفیت علامہ مرحوم نے ان الفاظ میں پیش کی ہے ۔

ذوق ہا بردم ہم از چشم عتاب آلود او
آتشے بود است و من بر خود گلستاں کردہ ام

اگر عاشق میں اتنی بھی صلاحیت اور بلند حوصلگی نہیں ہے تو وہ اور جو دعویٰ چاہے کرے لیکن کم از کم عشق کا دعویٰ اس کے لئے کسی طرح جائز نہیں ہے ۔ مجھ کو عام غزل گو شعراء سے خاص شکایت

یہی ہے کہ ان میں عشق و محبت کی اخلاق و روحانی عظمت و بلندی گا احساس مطلق نہیں ہوتا ، یہی وجہ ہے کہ جب محبوب کے جور و ستم کا ذکر کرتے ہیں تو صدائے مرحبا نکلنے کے بجائے زبان نوحہ خوانی کرنے لگتی ہے حالانکہ تشنگان ذوق کے لئے یہی جور و ستم تسکین و راحت کا بہت بڑا سرمایہ ہے جس کی طرف علامہ مرحوم نے سہل پسندوں کو خاص طور پر توجہ دلائی ہے ۔

همیں تنہا نگاہ لطف را لذت شناس استی
بپرس از تشنہ کامان ستم ذوق عتابش را

اور بے صبروں اور خام کاروں کو یہ نصیحت کی ہے ۔

زنیش عشق هنوز ار نمی بری ذوقے
بباش تاقدرے آشنائے جان گردد

محبت انسان کے دل و دماغ کو زمین سے آسمان تک پہنچا دیتی ہے ۔

محبت پایۂ بالا برد دل را
زمینے را ربود و آسماں کرد

لیکن یہ کون سی محبت ہے؟ کیا یہ شاهدان لب بام کی محبت ہے جو صرف جذبات هوس کو مشتعل کر کے رہ جاتی ہے یا یہ وہ محبت ہے جس کے کشتگان ذوق کی خاک کی بلند پایگی کا سماں علامہ نے اس شعر میں دکھایا ہے ۔

بلند پایگی خاک کشتگاں ایں است
کہ با نسیم رہ دوست ، هم عناں گردد

علامہ کی نکتہ سنج نگاہ جس ذوق محبت کی دلدادہ ہے وہ تمام تر ایثار و جان بازی کا مظہر ہے ۔

محبت را بود هر شیوۂ آئینے زجاں بازی
بمژگاں اشک خوں منصور بردار است پنداری

تشبیہہ کی لطافت و طرفگی بھی خاص لحاظ کے قابل ہے ۔ حقیقی محبت کا تقاضا ہے کہ محبوب کی تیغ جفا سو بار بھی آٹھے تو سر نیاز کو جھکنے میں تامل نہ ہو ۔

من نہ آنم کہ سر از تیغ جفا بردارم
گرچہ صد مرتبہ چوں شمع مرا سرزدۂ

ایک مخلص اور وفار پرست عاشق کی شان عقیدت یہی ہے ۔

اہل ہوس کا مقصد صرف ذوق نظر سے لطف اٹھانا ہے اور اسی کو وہ اپنے مذاق عاشقی کی معراج سمجھتے ہیں حالانکہ محبت کی حقیقی لذت دل کی اندرونی کاوش ہی میں پوشیدہ ہے جس کو محسوس کرنے کے لیے وجدان سلیم کی ضرورت ہے اس لیے علامہ کو افسوس ہے کہ آنکھ کو دل نہیں بنایا جا سکتا ۔

ذوق نظر بہ لذت کاوش نمی رسد
داغم از ینکہ دل نتواں کرد دیدہ را

اس شعر میں جو جذبہ ادا کیا گیا ہے اس کی نزاکت اور بلندی پر صرف ان ہی ارباب ذوق کی زبان سے صدائے آفرین بلند ہو سکتی ہے جن کے چمنستان قلب و روح کے لیے برق ستم کی شرر افشانیاں کوثر و تسنیم کی تردستیوں کا کام دیتی ہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ شبستان عیش و نشاط کی جلوہ آرائیاں کتنی ہی مسرت آفریں اور نظر افروز ہوں لیکن جس چیز کا نام زندگی اور حقیقی زندگی ہے اس کے ولولوں کو صرف نشتر غم ہی کی خلش بیدار کر سکتی ہے اور اس کی روحانی استعداد و صلاحیت کے نشوونما کا سامان صرف آلام و مصائب ہی کے آشوب گاہ میں نظر آ سکتا ہے اس لیے راز آشنا طبیعتیں محبوب کے جور و ستم کی کبھی گلہ مند نہیں ہوتیں ۔ بلکہ ان کے کام و دہن کو ہمیشہ اس جرعۂ تلخ کی آرزو رہتی ہے کہ بغیر اس کے وہ کیف سرمدی ، سرور مستقل جو عشق کا اصلی مقصود ہے نصیب نہیں ہو سکتا ۔

رقیب پر محبوب کے ظاہری لطف و عنایت کی نگاہیں پڑ رہی ہیں ،

عاشق کو بظاہر رنجیدہ ہونا چاہیے لیکن وہ خوش ہے کہ یہ غریب محبوب کی نوازش ہائے پنہاں کی اداؤں سے بے خبر ہے :

به لطف ظاهرش دشمن بخود نازان و من شادم
که مسکین ذوق نشناسد نوازش هائے پنهاں را

بالکل سچ ہے غریب کو خبر ہو تو کیوں کر ہو؟ اس میں اتنا حوصلہ کہاں کہ محبوب کے قہر و ستم کا ناز اٹھا سکے، اور اتنی بصیرت و نکتہ سنجی کہاں کہ اس قہر و ستم میں لطف خاص کی جو لطیف و نازک ادائیں پنہاں ہیں ان کو سمجھ سکے اور ان سے لذت اندوز ہو سکے -

علامہ کو اس کا شکوہ نہیں کہ ان کا محبوب دوسروں کے ساتھ مہربانی سے پیش آرہا ہے اور وہ خود مورد عتاب ہیں - کیونکہ ان کو معلوم ہے کہ محبوب کوئی بازاری فتنہ گر نہیں ہے جس کو نیک و بد اور اہل و نا اہل کی تمیز نہیں ہوگی بلکہ ہر شخص کی استعداد کا اندازہ شناس ہے - ظاہر ہے کہ قہر و عتاب کا تحمل صرف بلند حوصلہ عشاق ہی کر سکتے ہیں - یہ کم نظر بند گان ہوس کی طاقت سے باہر ہے، اس لیے مورد عتاب ہونا در اصل عاشق کی عالی ہمتی کی بہت بڑی سند ہے جو بارگاہ حسن سے صرف خاصان محبت کو عطا ہوتی ہے -

اندازه داں حوصلۂ هر کسے ست دوست
با دیگراں به لطف و به ما در عتاب بود

بزم گاہ دہر میں صدہا افسانوں کی صدائیں اٹھیں اور خاموش ہو گئیں، ہزاروں بار نظام عالم درہم برہم ہوگیا، لاکھوں مرتبہ انسان کے قصر حیات کی بنیادیں موج حوادث کی زد سے ہل کر رہ گئیں، خیالات و افکار میں ہمیشہ انقلاب و تغیر ہوتا رہا - غرض اس فریب گاہ رنگ و بو کا کوئی منظر کبھی ایک حالت پر قائم نہیں رہا - لیکن عشق ہی کا ایک ایسا افسانہ ہے جو باوجود اعادۂ پیہم کے اب تک بے کیف نہ ہو سکا - یہی وہ چمن ہے جس کی بہار ہمیشہ خزاں سے نا آشنا رہی -

یہی وہ آتش کدہ ہے جس کے شعلہ ہائے عالم‌فروز کی حرارت و تابانی کبھی کم نہ ہو سکی - یہی ساز فطرت کا وہ نغمۂ جاں نواز ہے جس کے ذوق و لذت سے روح انسانی کبھی آسودہ نہیں ہوئی اور نہ آیندہ ہو سکتی ہے اس لیے حیرت و استعجاب کے عالم میں علامہ کا یہ کہنا :-

ہرگز حدیث شوق بہ پایاں نیامد است
یا رب کدام جا سر ایں رشتہ بند بود

بالکل بجا اور درست ہے لیکن یہ پر کیف داستان ختم ہو تو کیونکر ہو؟ عشق و محبت انسان کی فطرت کا ازلی خاصہ ہے اس لیے جب تک اس کا وجود قائم ہے یہ نغمہ ہمیشہ اس کی زبان سے ادا ہوتا رہے گا اور اس کی تازگی و دل آویزی میں کوئی کمی نہ آنے پائے گی -

عاشقانہ تخیل کا معیار

علامہ کے عشق کا تخیل ایک رسوائے سر بازار کا سطحی اور عامیانہ تخیل نہیں ہے جس میں بلندی اور ایثار و شرافت کی کوئی شان نہیں بلکہ ان کی نگاہوں کے سامنے وہ عشق بلند حوصلہ ہے جس کے اسرار نہانی کی تعلیم گاہ محراب و منبر نہیں بلکہ دار و رسن کا وہ مقدس مقام ہے جہاں سے شہیدان محبت کی حقیقی زندگی کی ابتدا ہوتی ہے -

منبر و محراب درس عشق ار شایستہ نیست
شرح اسرار نہاں بر دار می بایست کرد

یہ اسی ذوق محبت کی داستان ہے کہ سو بار دھرانے پر بھی مکرر نہیں ہوتی - یعنی جب کبھی کوئی مطرب رنگین نوا اس ساز آتشیں کے پردوں کو چھیڑ دیتا ہے تو ہر مرتبہ قلب و روح کو ایک نئی لذت محسوس ہوتی ہے -

ذوق حدیث عشق تواں دید کایں سخن
صد بار گفتہ ایم و مکرر نگشتہ است

"مکرر نگشتہ است" کے ٹکڑے نے غور کیجئے شاعر کے ذہن میں

جو خیال تھا اس کو کس خوبی سے ادا کر دیا ہے ۔

خلوت سرائے راز میں عاشق ومعشوق کے درمیان جو ماجرا گزرتا ہے اس کی نزاکت شرح و بیان کی متحمل نہیں ہو سکتی ۔ اور علامہ تو اس کو اپنے سے بھی پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں ۔ یہ لطافت مذاق کی انتہا ہے ۔

نہ ہمیں دل کہ ہم از خویش نہاں داشتہ ام
ماجرائے کہ میان من و آں یار گذشت

آسمان اور معشوق دونوں کو شعرا نے ستمگر قرار دیا ہے لیکن دونوں کے جور و ستم میں بہت بڑا فرق ہے جس کی شناخت کا طریقہ علامہ کے نزدیک یہ ہے ۔

از لذت ادائے ستم می تواں شناخت
کایں جور از تو بودہ و از آسماں نبود

یعنی جس ستم میں لذت محسوس ہوتی ہو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ محبوب کا کرشمہ ہے ، لیکن اس لذت کو محسوس کرنے کے لیے خاص استعداد کی ضرورت ہے ، یہ اسی احساس کا فقدان ہے جس نے عالم غزل گوئی کو بالکل بے کیف بنا دیا ہے ۔ نالہ و شیون ، گریہ و زاری وغیرہ کے مضامین جو عام طور پر غزل میں داخل ہو گئے ہیں اس کا اصلی سبب یہی ہے کہ عام طبیعتیں محبوب کی ادائے قہر و ستم کی لذت شناس نہیں ہوتیں ۔ ان کو تو صرف اس سے غرض ہے کہ کوئی پیکر ناز و ادا ان کے کنار شوق کو ہر وقت گرماتا رہے ۔ ان کو علامہ کا یہ نازک احساس محبت نصیب نہیں ہو سکتا ۔

یا جگر کاوئی آں نشتر مژگاں کم نشد
یا کہ خود زخم مرا لذت آزار نماند

اہل ہوس کو حیرت ہو گی کہ آزار میں لذت کیسی اور زخم کا نشتر سے کیا تعلق ؟ اس کے لیے تو مرہم اور چارہ گر کی ضرورت ہے

لیکن ان کو سمجھنا چاہیے کہ یہ تیر ہوس کا زخم نہیں ہے بلکہ حقیقی محبت کا زخم ہے جس کو صرف نشتر مژگاں ہی کی جگر کاوی میں تسکین و راحت محسوس ہو سکتی، ہے افسوس ہے کہ عام غزل گو شعراء کی نگاہ اب تک احساس محبت کے اس مقام بلند سے نا آشنا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کو اپنے زخم ہائے دل کے لیے ہمیشہ مرہم اور چارہ گر کی تلاش رہتی ہے، حالانکہ جذبۂ محبت کی اس سے زیادہ اور کوئی توہین نہیں ہو سکتی۔ محبوب کی تیغ ستم کا زخم کوئی مرض نہیں ہے کہ جس کا علاج کیا جائے بلکہ وہ خود قلب و روح کے امراض کا علاج ہے پھر جو چیز خود علاج ہے اس کے علاج کی تدبیریں سوچنا اگر ابلہی اور دیوانہ پن نہیں تو پھر کیا ہے؟

شعر مذکورہ بالا میں جو احساس محبت ظاہر کیا گیا ہے اس کی لذت سے ابھی قلم سیر نہیں ہؤا تھا کہ علامہ کی لطافت احساس کا ایک دوسرا منظر سامنے آ گیا جس سے صرف ارباب حال ہی لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

لطفے نہ کردۂ و گرانبار منتیم
ما از تو می خریم متاع نبودہ را

محبوب کا کوئی عنایت نہ کرنا اور پھر بھی عاشق کا گرانبار منت رہنا بظاہر تعجب انگیز ہے لیکن در اصل حیرت و استعجاب کی کوئی وجہ نہیں۔ محبت میں درد مند قلوب پر اس قسم کی نازک اور بلند کیفیتیں اکثر طاری ہوتی ہیں اور غور کیجئے تو غایت محبت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ بغیر کسی لطف و عنایت کے عاشق کے ہر بن مو سے شکر و سپاس کی صدا بلند ہوتی ہے ممکن ہے کہ عنایت نہ کرنا ہی محبوب کی کوئی پراسرار ادائے لطف ہو۔

نا انصافی ہو گی اگر "متاع نبودہ" کی لطافت ترکیب کی داد نہ دی جائے۔ غور کیجئے اس ایک ترکیب نے خیال کو صحیح اور موثر طریقہ پر ادا کرنے میں کس حد تک مدد کی ہے۔ موزوں اور موثر الفاظ کا

انتخاب بھی ایک کامل الفن شاعر کے لیے ضروری ہے ورنہ شعر ایک نغمۂ بے آہنگ ہو کر رہ جائے گا۔

مذکورہ بالا مثالوں سے علامہ مرحوم کے احساس محبت کی بلندی، نزاکت، پاکیزگی اور حقیقت شناسی کا کافی طور پر اندازہ ہو گیا ہو گا اور اب غالباً علامہ کے اس قول سے اختلاف نہ ہو گا۔

شبلی سخن اگرچہ زراہ فسانہ بود
لختے ز راز نیز بیاں کردہ ایم ما

اب دیکھنا یہ ہے علامہ کی چشم و نگاہ کا جو محبوب ہے اس کی اداؤں کا کیا عالم ہے؟ ظاہر ہے کہ ایک حقیقت آشنا اور لطیف المذاق عاشق اپنے ذوق محبت کی متاع گراں ارز کو فتنہ گران لب بام کی عامیانہ اداؤں کی نذر نہیں کر سکتا۔ اس کا محبوب وہی ہوگا جس کی ادائیں قلب و نظر کے لطیف اندرونی احساسات کو شگفتہ اور مشتعل کر سکتی ہوں۔ سب سے پہلے اس کے حسن و جمال کا عالم ملاحظہ ہو فرماتے ہیں۔

پیکر آرائے ازل طلعت زیبائے ترا
نقش می ابست و ہم از ذوق تماشا می کرد

ایسے محبوب کے نظارہ جمال سے قلب و نظر کو انبساط اور سرور کی جو دولت سرمدی حاصل ہو سکتی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ اس قسم کے نقش قدم کی پاکیزگی کا یہ حال ہے کہ جو خاک اس کے اثر سے فیضیاب ہوتی ہے وہ بجز سجدۂ نیاز کے اور کوئی نذر قبول نہیں کرتی۔

جز سجدۂ متاع دگر ازکس نہ پذیرفت
خاکے کہ زنقش قدم او اثرے داشت

اس کا جلوۂ جمال وہ فتنہ ہے جو سبحہ و زنار، کفر و ایمان کی تمام ہنگامہ آرائیوں کو درہم برہم کر دیتا ہے۔ اور اصل حیقیقت نے نقاب ہو کر سامنے آ جاتی ہے۔

قتنه حسن تو از بسکه جہاں برهم زد
در میان تفرقۂ سبحه و زنار نماند

اس کی خاکِ در وہ صیقل ہے جس سے چشم و نگاہ کا آئینہ چمک اٹھتا ہے۔

چه عجب جلوه گه دوست شود دیدۂ من
که ز خاک درش این آئینۂ پرواز گرفت

اس کی زلف دراز کا سایہ سکون و قرار کی وہ جگہ ہے جہاں سودا زدگانِ محبت کا تمام ذوق تگ و دو ختم ہو جاتا ہے۔

وحشی دلم به سایۂ زلف دراز او
آسود آں چناں که دگر هیچ رم نه‌داشت

ظاہر ہے کہ حقیقی سکون سے ہمکنار ہونے کے بعد ذوق رم کیونکر باقی رہ سکتا ہے لیکن یہ سکون مستقل صرف انہی وحشیوں کو نصیب ہو سکتا ہے جن کے قلوب محبت کے جذبۂ خالص سے بیتاب ہیں۔

وہ کوئی بے شعور اور بد مذاق شاہد بازاری نہیں کہ ستم کرنے پر آیا تو ستم ہی کرتا چلا جاتا ہے اور کبھی عنایت کی طرف مائل ہوا تو ادائے ستم بھول گئی بلکہ وہ ہر چیز کا اندازہ شناس ہے چنانچہ جور و ستم کے جام تلخ میں وہ لطف و کرم کی کچھ شیرینی بھی شامل کر دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ پر کیف معتدل نسخہ بیماران محبت کے لیے کس قدر تسلی بخش ہو گا۔

چیزے زلطف نیز بیا میخت در ستم
تا اعتدال داد ، مئے تند ناز را

شرم و غیرت کا یہ عالم ہے کہ خلوت سرائے وصال میں بھی عاشق اپنے مقصد میں نا کام رهتا ہے۔

در وصالم نیز کام دل ازو حاصل نه شد
بسکه شرم خویش را بر خود نگہبان کرده بود

لیکن علامہ کو اس ناکامی پر افسوس نہ کرنا چاہئے ۔ ذوق محبت کی شرافت کا یہی تقاضا تھا ورنہ بوالہوس ایسے موقع پر محبوب کی شرم و غیرت کا کیا احترام کر سکتا تھا ۔

اس کا خندۂ شیریں باوجود لطافت کے عاشق کے دل سے درد و غم کا بار گراں اٹھا دیتا ہے ۔

با آں لطافتے کہ شکر خندۂ تو داشت
بار غمے کہ بر دل ما بود بر گرفت

لیکن واقعہ یہ ہے کہ ''غمزۂ پنہاں'' کی ستم طرازیوں کے ذوق شناس کو شکر خندۂ لطف و عنایت سے تسلی نہیں ہو سکتی

بہ شکر خندۂ لطف تو تسلی نشوم
منکہ خو کردۂ آں غمزۂ پنہاں باشم

زلف مشکیں کی خوشبو سے عشاق عام طور پر صرف دل و دماغ کو معطر کر کے رہ جاتے ہیں لیکن علامہ کے جیب و آغوش پر اس کا یہ اثر ہوتا ہے ۔

سنبلستان می دمد از جیب و آغوشم ہنوز
زلف مشکیں در برم روزے پریشان کردہ بود

زلف مشکیں کی فیض بخشیوں سے کس کو انکار ہو سکتا ہے لیکن علامہ کے جیب و آغوش کی یہ قابلیت بھی کچھ کم حیرت انگیز نہیں ہے ۔ اس کی نگاہ ناز کی ہر جنبش ایک راز ہے جس کو صرف نکتہ دان عشق ہی سمجھ سکتا ہے اس لیے علامہ کو یہ گوارا نہیں کہ یہ نگہ ہائے راز غیروں پر ضائع کی جائیں ۔

بیچارا نکتہ دان ادا ہائے عشق نیست
ضائع مکن بغیر نگہ ہائے راز را

ایسے محبوب کی گلی کی رونق کے لیے علامہ کے نزدیک نظر بازوں کی نہیں بلکہ تڑپتے ہوئے قلوب کی ضرورت ہے ۔

رونق کوئے تو از ارباب تماشا نشود
بسملے چند در اں راھگزر می بایست

اسی خاک آستاں میں وہ روحانی جذب و اثر ھے کہ جبین نیاز بلا کسی سعی و ارادہ کے سر بسجود ھو جاتی ھے -

آستان کہ باشد ایں کہ مرا
سجدہ بے خواست از جبیں بچکد

اس موقع پر علامہ کا پیام اخلاص و عقیدت بھی سن لینا چاھیے جس سے اندازہ ھو گا کہ جذبۂ محبت کی پاکیزگی کا کیا عالم ھے اور ان کی نگاہ شوق کس حد تک اس خاک آستاں کی عظمت شناس ھے - فرماتے ھیں -

نسیم صبح بیا ، راحتے بجاں برساں
پیام بندہ بہ آں خاک آستاں برساں

متاع جان زھم ارپائے مزد می خواھی
وگر نہ لطف بفرمائے و رائگاں برساں

و فور شوق شکیبا نمی تواند شد
روا مدار درنگ و ھمیں زماں برساں

حدیث شوق نہ چنداں کہ در بیاں گنجد
اگر نہ جملہ تواں آں چہ می تواں برساں

تصرفے مکن از پیش خود درو چیزے
چناں کہ با تو بگویم تو ھم چناں برساں

بہ آستانہ او سرنہ ، وز روئے ادب
درود گوئے و دعایم زماں زماں برساں

بگو کہ برطبق وعدھائے بے در بے
بیاد مرتبۂ من بہ آسماں برساں

سلام شوق و تمنا ز بندہ نعمانی
بہ ساکنان در او ، یگاں یگاں برساں

پیام رسانی کی اجرت میں متاع جاں پیش کی جا رہی ہے - سر نیاز مودبانہ جھکا ہوا ہے - زبان پر درود و دعا کا سلسلہ برابر جاری ہے - غور کرو کیا عاشقانہ خلوص و ایثار کا اس سے زیادہ اور پر کیف منظر ہو سکتا ہے ؟ معلوم نہیں کہ علامہ کے ذوق آشنا قلب نے کس عالم وجد و حال میں یہ پر سوز پیام دیا تھا - جذبات کی پاکیزگی سے کس کو انکار ہو سکتا ہے لیکن زبان کی شیرینی اور لطافت بھی خاص لحاظ کے قابل ہے - علامہ نے خود نہایت سچ کہا تھا -

در حیرتم کہ پاکیٔ گفتارش از کجاست
شبلی مگر زمرِدم ہندوستاں نبود

عشق کی روحــانی عظمت کا مظــاهــرہ

اب تک جو کچھ کہا گیا ہے اس کا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ حسن و عشق کی اخلاق اور روحانی عظمت ، بلندی اور پاکیزگی ،احساس جو ایک باکمال غزل گو شاعر کے لیےسب سے زیادہ ضروری اور مقدم شرط ہے اس کا اثر علامہ مرحوم کے مذاق تغزل میں نمایاں طرر پر نظر آتا ہے - حسن سے نیاز و عقیدت کا اظہار عشق کا اولین فریضہ ہے لیکن اس کے ساتھ بلند حوصلگی ، عزت نفس اور خود داری کی شان بھی قائم رکھنا اس کے لیے ضروری ہے - لیکن یہ شان بھی اتنی بلند نہ کی جائے کہ بارگاہ حسن کی ادب شناسی جاتی رہے اور نہ اظہار عقیدت میں اس حد تک غلو سے کام لیا جائے کہ ایک رسوائے سر بازار کی مبتذل ادائیں نظر آنے لگیں - راہ طلب کا یہ نہایت نازک مرحلہ ہے جس سے صرف وہی صاحب ذوق عہدہ بر آ ہو سکتا ہے جس کو علامہ مرحوم کا سا نکتہ سنج دماغ قدرت کی طرف سے عطا ہؤا ہو -
اس سلسلہ میں چند مثالیں اور پیش کی جاتی ہیں جن سے علامہ کی نکتہ سنجی اور لطافت خیال کا کافی طور پر اندازہ ہو گا :-

عشق کا تعلق در اصل دل سے ہے ۔ اس لیے سب سے پہلے اس آئینے کو علم و دانش کے زنگ سے پاک کرنا چاہیے ۔ ورنہ محبت کی روح پرور کیفیتوں کا جلوہ نظر نہیں آ سکتا ۔ اور نہ ایسا زنگ آلود دل محبوب کے فیضان جمال کا مستحق ہو سکتا ہے ۔ یہ وہ مقام ہے جہاں جہل و لاعلمی ہی کا دامن پھیلا کر حقائق و اسرار کے گہر ہائے آبدار کی دولت حاصل کی جا سکتی ہے ۔ علم و حکمت کے غرور کو عشق کی بزم خاص میں بار نہیں مل سکتا ۔ اس لیے علامہ کے نزدیک اس داغ کا مٹانا ضروری ہے ۔

دل کہ زنگ آلود دانش شد سزائے عشق نیست
اول ایں آئینہ را پرواز می بایست کرد

اسی خیال کو ایک دوسرے پر لطف انداز سے اس شعر میں ادا کیا ہے ۔

ترک دانش کردم و ناداں شدم
ایں دلیل آں کہ دانا بودہ ام

یہ صرف شاعری نہیں ہے بلکہ ایک لطیف حقیقیت ہے جس کو بزم سلوک کے محرمان خاص بخوبی سمجھ سکتے ہیں ۔ درس گاہ محبت کچھ عجیب مقام ہے ۔ اس کے اصول و آئین ہی کچھ اور ہیں ۔ یہاں سب سے پہلے ترک دانش ہی کی تعلیم ہوتی ہے کہ بغیر اس کے اصل دانائی کے جلووں سے چشم باطن روشن نہیں ہو سکتی لیکن نادان ہونے کے لیے بھی دانائی در کار ہے ۔ ہر شخص میں اتنی بصیرت کہاں ہوتی ہے کہ وہ اس راز کو سمجھ سکے کہ جب تک صفحۂ دل سادہ اور ہر قسم کے نقش و نگار سے معرا نہ ہو گا اس پر طغرائے محبت کے نقوش ابدی ثبت نہیں ہو سکتے ۔ اس لیے علامہ نے اپنے دانا ہونے کی جو دلیل پیش کی ہے اس کی صحت اہل نظر کے نزدیک ناقابل انکار ہے ۔ لیکن اس دور مادیت میں اب اس قسم کے دانا کہاں نظر آتے ہیں اور ہوں بھی تو ان کا قدر شناس کون ہو سکتا ہے ۔

زندگی در اصل روح کے اندرونی سوز و گداز کا نام ھے - بازار محبت میں صرف اسی متاع گراں ارز کی پرستش ھوتی ھے - محض ظاھری آب و رنگ کی کوئی قیمت نہیں -

رد کردہ متاعے است بہ بازار محبت
آں داغ کہ از لالہ ترا در جگر افتاد

کیوں ؟ صرف اس لیے کہ وہ داغ زندگی کے سوز سے خالی ھے ، عشق کا یہی وہ سوز و گداز ھے جس کی بدولت انسان کو عالم کائنات کا تاج سلطانی عطا ھؤا تھا اور جس کے بغیر وہ دیگر مخلوقات پر کسی طرح اپنی فضیلت کا دعویٰ نہیں کر سکتا -

انسان کی فطرت ھے کہ جو چیز اس کو محبوب ھوتی ھے اس کے خیال میں وہ ھر وقت محو رھتا ھے اور کوئی دوسرا ذکر خواہ کتنا ھی دل آویز کیوں نہ ھو اس کے اس عالم محویت میں خلل انداز نہیں ھو سکتا - شدت محبت کا تقاضا بھی یہی ھے جس کو علامہ نے اس طرح ادا کیا ھے -

حدیث خلد چو گویند بامن مجنوں
گماں برم کہ مگر گوشۂ زصحرا ھست

محبوب کی بارگاہ میں پیغام رسانی کے لیے عام طور پر نامہ و قاصد سے کام لیا جاتا ھے لیکن علامہ کے ذوق بلند کو یہ بار احسان گوارا نہیں- وہ یہ کام خود اپنے جذب دل سے لینا چاھتے ھیں -

نامہ و قاصد حریف آں بت خود کام نیست
خود ترا اے جذب دل ایں کار می بایست کرد

جذبۂ عشق کی شان کشش تو یہی ھے البتہ اھل ھوس کو یہ حوصلہ نصیب نہیں ھو سکتا - محبوب کی بے اعتنائی کا شکوہ ایک عام مذاق ھے لیکن اس پر نظر نہیں جاتی کہ خود دل کی وارفتگی ھی اس امر کا ثبوت ھے کہ اس کی نگاہ مست غافل نہیں ھے بلکہ یہ اسی کا فیض التفات ھے جس سے علامہ کی نکتہ سنج نگاہ باخبر ھے -

خود بے بتواں برد ز وارستگئی دل
کاں نرگس مستانہ بما نیز سرے داشت

هجر و فراق کا تخیل بے شبہ ان لوگوں کے لیے موجب آزار هو سکتا هے جن کو صرف محبوب کے خال و خط کے مشاهدۂ جمال کی آرزو هوتی هے لیکن اگر محبوب کے خیال اور یاد میں بھی ذوق و لذت کا سامان هے اور یقیناً هے تو پھر احساس فراق کی کوئی گنجائش نہیں ، بلکہ هر حالت میں اور هر جگہ دوست کی معیت محسوس هوگی - لیکن خیال دوست میں اس طرح محو و وارفتہ هونا کہ یہ محسوس هو کہ دوست هر وقت پاس هے ، هر دل کا کام نہیں هو سکتا - اس کے لیے علامہ ایسے نکتہ دان محبت کا قابل دل در کار هے جو فراق کی کیفیت سے نا آشنا هے -

با خیالش بس کہ بودم هم نشین
گوئیا با دوست هر جا بودہ ام

کیا عام غزل گو شعراء جن کے ولولہ شکن نالہ هائے شب فراق نے عشق کی بزم سرور کو مجلس عزاء بنا رکھا هے ، اپنے ذوق کو اب اتنا بلند کر سکتے هیں کہ خیال محبوب کی هم نشینی سے سکون روحانی کی نعمت بے بہا حاصل کر سکیں ؟

عشاق کو عام طور پر محبوب سے مہجوری کی شکایت رهتی هے لیکن علامہ کے نزدیک عاشق خود اس مہجوری کا ذمہ دار هے - دراصل محبوب کی کوئی خطا نہیں -

مہجوریم ز دولت وصلت هم از من ست
تو بس قریب بودی و ما دور بودہ ایم

غور کرو محبوب کی قربت کی خواهش کس نے کی ؟ ظاهر هے یہ عاشق هی کی آرزو تھی لیکن اس قرب کا نتیجہ کیا هؤا ؟ برق جمال کی شدت تابانی نے نہ صرف نگاهوں کو خیرہ کر دیا بلکہ هوش و حواس بھی گم کر دئے - ایسی حالت میں دولت وصل سے عاشق کیونکر بہرہ مند هو سکتا هے - یہ قرب کیا هؤا کہ اور بھی دوری هو گئی - آفتاب

کے جلووں سے نگاہ دور ہی رہ کر اکتساب فیض کر سکتی ہے لیکن افسوس ہے کہ طالبان وصل اب تک اس حقیقت سے بے خبر ہیں۔

شاہراہ سے الگ ہو کر چلنا بظاہر بے راہروی معلوم ہوتی ہے لیکن علامہ کی نگاہ میں در اصل بے راہروی نہیں ہے اس لیے کہ عوام کے جادہ ہائے غلط نے شاہراہ کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔

از بسکہ جادہ ہائے غلط شاہراہ گشت
بے راہہ رفتنم ز طریق خطا نبود

ظاہر ہے کہ ایسی شاہراہ سے الگ ہو کر چلنے والے پر بے راہ روی کا الزام عائد نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس پر چلنا ہی غلطی اور گمراہی کی دلیل ہے اس لیے کہ اس پر چل کر دیدۂ بینا کو حقیقت کا نظارۂ جمال نصیب نہیں ہو سکتا لیکن اس بے راہ روی کی جرأت صرف ایک بلند حوصلہ اور عالی نظر انسان ہی کے گام طلب کو ہو سکتی ہے۔

عشق کے معرکہ میں صرف اسی کا نام باقی رہ جاتا ہے جو اپنی ہستی کو مٹا کر بے نام و نشان ہو جاتا ہے۔ اس حقیقت کو دیکھو علامہ نے کس سادہ طریقہ سے بیان کیا ہے، فرماتے ہیں۔

دانی کہ دریں معرکہ با نام و نشاں کیست؟
آنست، کہ از نام و نشانش اثرے نیست

برہمن طعنہ زن ہے کہ مسلم کا ایمان تقلیدی ہے۔ علامہ کی طبع نکتہ سنج نے اس کا یہ جواب دیا ہے۔

ایمان ما اگرچہ بہ تقلید بودہ است
طعنم مزن کہ کفر تو ہم اجتہاد نیست

غور کیا جائے تو واقعہ بھی یہی ہے۔

جس ذوق و شوق کے ساتھ علامہ جمال محبوب کا نظارہ کرتے ہیں اس کی محویت کا یہ عالم ہے کہ خود نظر لذت دیدار سے بے خبر رہ جاتی ہے، فرماتے ہیں۔

آں قدر محو تماشائے جمالش بودم
کہ نگہ را خبر از لذت دیدار نماند

اور کبھی ذوق تماشا اس حد تک بڑھ جاتا ہے کہ خود جمال محبوب سے بہرہ مند نہیں ہو سکتے۔

از جمالش ہم نہ بردم بہرۂ
آں قدر محو تماشا بودہ ام

یہ پر کیف طرز دید ہر نگاہ کو نصیب نہیں ہوتا ، اس کا بہت کچھ تعلق دیکھنے والے کی روحانی استعداد سے ہے۔

غرض محبوب کے سراپائے جمال سے علامہ کی چشم و نگاہ کو جو شیفتگی ہے اس کا ایک اور پر کیف عالم ملاحظہ ہو ، فرماتے ہیں۔

بر سراپائے جمال تو نگاہم گوئی
رہروے ہست کہ از ضعف بہ ہر جا ماند

اس ندرت تشبیہہ کی مثال کہیں اور مشکل سے مل سکتی ہے۔ نفس خیال یعنی عاشق کی غایت شیفتگی کو پیش نظر رکھ کر غور کرو کہ یہ کیفیت اس تشبیہہ کے ذریعہ سے کس خوبی کے ساتھ ادا ہوئی ہے۔ تشبیہات بھی پیرائہ بیان کو موثر اور دلکش بنانے میں بہت زیادہ معین ہوتی ہیں۔ بشرطیکہ وہ دور از کار اور خارج از قیاس نہ ہوں۔

جوش و سرمستی

جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں علامہ کو قدرت کی طرف سے ایک نہایت رنگین ، شگفتہ پر کیف اور ولولہ انگیز طبیعت عطا ہوئی تھی۔ اس لیے ان کے کلام میں ایک خاص جوش مستی کا عالم نظر آتا ہے جس کی مثال بجز خواجہ حافظ کے اور کسی فارسی غزل گو شاعر کے کلام میں مشکل سے مل سکتی ہے۔ یہ مبالغہ نہیں بلکہ حقیقت ہے جس کا اندازہ مثالوں سے ہو سکتا ہے۔

یک سرو صد گونه سودائے نہانی داشتم
یاد آں روزے کہ من با خود جہانے داشتم

یاد آں روزے کو دور از ماجراہائے جہاں
ماجرائے بانگار نکتہ دانے داشتم

یاد آں روزے کہ دست افشاں گذشتم از حرم
از غرور آں کہ من ہم آستانے داشتم

ہیچ باک از گردش گردون گردانم نبود
کز زمین کوچۂ او آسمانے داشتم

خلیل آہنگ طرح کعبۂ اسلامیاں دارد
بہ دست آوردہ ام من نیز خاک آستانے را

ما از بلند و پست جہاں در گذشتہ ایم
از بسکہ دیدہ ایم نشیب و فراز را

بگذر اے ابر ، زدعویٰ کہ ہنوزم بمژہ
نم اشکے ست کہ آبستن طوفانے ہست

وسعت حوصلۂ سعی عمل بین کہ ہنوز
کف خاکم بہوائے سر دامانے ہست

برق عشقے کہ مرا بر دل و بر تن زدہ بود
ایں ہماں ست کہ بر وادیٔ ایمن زدہ ام

تا ازیں ہر دو بہ جان کہ خطر خواہد بود
دوش پیمانۂ مے بر سر پیماں زدہ ام

از پریشانی • ایام میندیش کہ من
دست در حلقۂ آں زلف پریشاں زدہ ام

کارم افتاد بہ آں بادشہ کشور حسن
دست رو بر حشم قیصر و خاقاں زدہ ام

کس چه داند که به خلوت گه آں ماه تمام
زده ام ساغر و بر یاد حریفاں زده ام

صد دکان لعل و گہر چیده ام از گفتارش
طعنه بر بے سر و سامانی عماں زده ام

سالہا گوش جہاں زمزمه زا خواهد بود
زیں نوا ، با که دریں گنبد گرداں زده ام

بے شبه پر جوش نغموں کی صدائیں کبھی خاموش نہیں ہوتیں۔ وہ همیشه فضائے آسمانی میں گونجتی رهتی هیں اس لیے که آن میں زندگی کی روح پنہاں هوتی ہے۔

دو شعر اور ملاحظه هوں جن سے اندازہ هوگا که علامه کے قلب و روح میں کس قیامت کا جوش و خروش تھا اور ان کا ذوق مستی کس حد تک تند و قوی واقع هؤا تھا۔

غنچۂ نشگفته جنون آورد بمن
تا دگر از اثر بادبہاری چه شود

ما بندۂ آں بادۂ تندیم که از جوش
از شیشه بروں جست و زمینا بدر افتاد

ان اشعار کی داد تو صرف خواجه حافظ کی روح دے سکتی ہے۔

رندی و سر مستی اور زهد و ریائی پر طعن و طنز کے مضامین لوازم شاعری میں هیں۔ خصوصاً خواجه حافظ جن کا رنگ علامه کے کلام میں زیادہ نمایاں ہے ، اس فن کے امام تھے۔ اس لیے علامه کی شاعری میں بھی اس بادۂ سرجوش کا بڑا اثر ہے۔ اور انہوں نے جس جوش کے ساتھ مست و رندانه خیالات کا اظہار کیا ہے اس کو مد نظر رکھتے هوئے محبوب سے آن کا یه مطالبه

مده از دست خود رنگین نوائے همچو شبلی را
تو شاه حسنی و در کار داری یک غزل خوان هم

کچھ ناموزوں اور بیجا نہیں۔

ان کے نزدیک اگر عیش و نشاط کی فراوانی مطلوب ہے تو سب سے پہلے عقل کو شہر بدر کرنا چاہیے کہ رندوں کی بزم سرور میں اس دیوانہ لایعقل کے پندو وعظ کا کوئی کام نہیں۔

خواہید اگر کہ عیش و نشاط فزوں کنید
دیوانہ ایست عقل ز شہرش بروں کنید

زندگی کی لذتیں در اصل عشق و محبت ہی کی ہنگامہ آرائیوں سے وابستہ ہیں۔ چنانچہ علامہ کو اس مقام پر افسوس ہے جہاں ان جذبات کا مشتعل کرنے والا کوئی فتنہ گر نہ ہو۔

نے ذوق نگاہے و نہ ہنگامۂ عشقے
اے وائے بشہرے کہ درو، فتنہ گرے نیست

ترک عاشقی بظاہر کوئی قابل اعتراض فعل معلوم نہیں ہوتا لیکن علامہ کی نکتہ رس نگاہ میں یہ ذوق و عرفان کی بربادی ہے۔

دل از خوباں گرفتی خوب کردی
و لیکن ذوق و عرفاں را زیاں کرد

اسی لیے وہ کسی طرح ذوق رندی سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہیں اور اپنے ناصح مشفق کو یہ جواب دیتے ہیں۔

از ما بدار دست کہ رندی و عاشقی
صد بار کردہ ایم و دگر می کنیم ما

اس جرأت رندانہ کی داد دینا آسان نہیں ہے۔ یہ ذوق سرمستی کا وہ جذبۂ محکم ہے جس پر وعظ و پند کا کوئی سحر کارگر نہیں ہو سکتا اور نہ ایک رند سرمست ارباب عقل و ہوش کی تلخ نوائیوں کا اس سے زیادہ مختصر اور مسکت جواب دے سکتا ہے۔

زہدو تقویٰ علامہ کے نزدیک کوئی بڑی چیز نہیں ہے لیکن پھر بھی ان کی نگاہوں میں اس کی جو وقعت ہے اس کا یہ حال ہے، فرماتے ہیں۔

رہ و آئین تقویٰ نیز بدنیست
اگر کارے نباشد می تواں کرد

غور کرو کیا اس سے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ شاعر کے دل میں احساس رندانہ کی کتنی شدید حرارت موجود ہے۔ اگرچہ رندی و مستی عقل و دانائی کی شان کے خلاف ہے لیکن علامہ کو اس فرزانگی و دانائی کی قطعی حاجت نہیں۔

گرچہ رندی و ہوس شیوۂ دانا نہ بود
حاجتم نیست کہ فرزانہ و دانا باشم

اور اسی کے ساتھ ان کے ذوق سرمستی کا یہ بے باکانہ اعلان بھی ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں:-

چند در پردہ تواں کرد سخن فاش بگوی
سنگ بر شیشۂ تقویٰ زدہ ام ہاں زدہ ام

ساغرے چند بہ یاد رخ رنگین خوردم
قدمے چند در آغوش گلستاں زدہ ام

جامۂ زہد چو بر قامت من راست نبود
شیشۂ تقویٰ سی سالہ بہ سنداں زدہ ام

تم کو معلوم ہے کہ یہ جامۂ زہد علامہ کو گوارا کیوں نہیں ہے اور وہ رندی و سرمستی کے کیوں آرزو مند ہیں؟ اس کی وجہ خود انہوں نے ظاہر کر دی ہے، فرماتے ہیں۔

فرصتم بادا کہ بامستی و رندی خوکنم
چوں رہ و رسم ریارا، مرد میداں نیستم

ارباب صومعہ کو یہ ادائے رندی کتنی ہی ناگوار ہو لیکن یہ کیا کم ہے کہ انسان ریا سے جو سب سے بڑی مصیبت ہے محفوظ تو رہتا ہے۔ اور اس کو ہاتف شیراز کا یہ طعنہ تو سننا نہیں پڑتا:-

ریا حلال شما رند و جام بادہ حرام
زہے طریقت و ملت، زہے شریعت وکیش

خواجہ حافظ نے ریاکار مدعیان زہد و تقویٰ کی کافی خبر لے لی تھی

اور ان کے ہر اعمال حسنہ کی مزید پردہ دری کی ضرورت نہ تھی ۔ لیکن پھر بھی رندی و مستی کے جوش میں ان بزرگوں کی شان تقدس کی حیقیقت کے متعلق علامہ کے قلم سے جو کچھ بے ساختہ نکل گیا ہے وہ لطف سے خالی نہیں ہے ، چند اشعار ملا حظہ ہوں ۔

ایں نمی دانم کہ گبرم یا مسلماں نیستم
ایں قدر دانم ،کہ زاھد آں‌چہ ھست، آں‌نیستم

از ما بگیر ، درس فنون ریا کہ "ما"
عمرے دراز زاھد و مستور بودہ ایم

ھر کسے‌چوں شیخ ،میداں ریا را مرد نیست
اندریں فن زحمت بسیار ، می بایست کرد

می خواھد ایں کہ در رہ رندی قدم نہد
زاھد کہ ھم بہ شیوۂ تقویٰ تمام نیست

زاھد مگرت کار بہ لعل لبش افتاد
زیں گونہ حدیث تو دل آویز نبودست

خواھیم ترک شاھد و مے ، وز برائے ایں
از زاھد فسردہ دلے دام کردہ ایم

بادہ ھر چند تہ خرقہ تواں نیز کشید
نرگس مست کسے خواست کہ رسوا باشم

لیکن جناب زاھد میں اتنی غیرت کہاں کہ ان کو اپنے جبہ و دستار کی رسوائی کا خوف ہو۔ ان کا خرقۂ ریائی تو ان کے کار خلوت کا پردہ پوش ہے کہ دنیا کے سامنے ان کے فریب تقدس کا راز طشت از بام نہ ہونے پائے ۔

ایک شعر اور ملاحظہ ہو ۔

من نیز ھمچو شیخ ، دم از زھد می زنم
اول مرا بہ بادہ و مے آزموں کنید

انداز بیان کی لطافت پر غور کیجیے کیا کہنا تھا اور کس انداز سے کہا ہے ؟ شاعر کے نزدیک زہد و تقویٰ در اصل تمام خواہشات نفسانی پر قابو حاصل کر لینے کا نام ہے اس لیے وہ اپنے ادعائے زہد کو آزمانا اور یہ جاننا چاہتا ہے کہ آیا اس کے قلب و روح میں دنیاوی ترغیبات کو ٹھکرانے کی قابلیت پیدا ہوئی ہے یا ابھی شیخ جی کی طرح وہ خود اپنے نفس کا تابع ہے کہ جہاں جام رنگیں کا جلوہ نظر آیا زہد و تقویٰ کی تمام مصنوعی ادائیں دفعتاً بھول گئیں - شاعر نے کس لطیف پیرایہ میں شیخ جی کے ضعف ایمان و تقویٰ کی پردہ دری کی ہے یعنی اپنے کو بھی شیخ جی کے ساتھ شامل کر لیا ہے اور نتیجہ آزمائش کو مخفی رکھا ہے لیکن ذہن کو اس کی طرف منتقل ہونے میں دقت محسوس نہیں ہوتی - کیونکہ وہ در اصل شیخ جی کے زہد کا امتحان ہے ظاہر ہے کہ شیخ جی کہاں کامیاب ہو سکتے ہیں - بقول خواجہ حافظ کے ان کے خرقۂ زہد و تقویٰ کی حقیقت تو یہ ہے -

خرقہ پوشئی من از غایت دینداری نیست
پردہ بر سر صد عیب نہاں می پوشم

مذکورہ بالا مثالوں سے ارباب ذوق کو اگر سیری نہ ہوئی ہو اور ان کو علامہ کی کچھ اور تند و تیز رندانہ ادائیں دیکھنے کی تمنا ہو تو یہ چند اشعار اور حاضر ہیں -

توبہ از بادہ ، نہ کار من ناکس باشد
ایں قدر ہم اگرم عقل بود بس باشد

ہندوئے زلفش چرا دامن ہمی چیند زمن
اندکے ہم کافرم ، چنداں مسلماں نیستم

دل در ادائے طاعت حق حیلہ جو نبود
عذرم بنہ ، کہ بادہ بقدر وضو نماند

اسباب زہد میں سے صرف ایک تسبیح حضرت کے پاس رہ گئی تھی اس کو بھی میخانے میں بھول آئے -

سبحۂ داشتم از جملۂ اسباب ورع
رفت از یادم و در خانۂ خمار بماند

شبستان وصال میں مستی و بیخودی کی بھی کچھ ادائیں ملاحظہ ہوں، فرماتے ہیں۔

آغوش شوق و دیدۂ گستاخ و دست شوخ
در وصل ہر چہ بود زمن خود بہ کار بود

رسم و آئین ہم آغوشی نمی دانم کہ چیست
دست گستاخ آں چہ فرمود است من آں کردہ ام

غور کیجیے اپنے آپ کو کس لطیف انداز سے بری رکھا۔ ہے الزام تو اس وقت ہو سکتا تھا جب کوئی حرکت بالارادہ سرزد ہوتی لیکن یہاں مستی و بیخودی کا یہ عالم ہے کہ جلوہ گاہ محبوب میں قدم رکھتے ہی آغوش شوق و دیدۂ گستاخ، دست شوخ، سب خود بخود بے اختیارانہ سر گرم عمل ہو جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں غریب عاشق کیونکہ خطا وار قرار دیا جا سکتا ہے؟ وہ تو دست گستاخ کی فرمائشوں سے قطعاً مجبور تھا، یہ ایک نازک مرحلہ تھا اس لیے شاعر نے بجائے تفریح کے صرف کنایہ سے کام لیا ہے جس کی وجہ سے انداز بیان نہ صرف موثر بلکہ ابتذال سے محفوظ ہو گیا ہے۔

سپیدۂ سحر نمودار ہو رہا ہے، محبوب کو ٹھہرانا چاہتے ہیں لیکن جو حیلہ ایجاد کیا گیا ہے اس کی ندرت ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں۔

من شب وصل بایں حیلہ فریبش دادم
کیں سحر نیست، فروغ رخ زیبائے تو ہست

کیا اس سے زیادہ لطیف اور موثر کوئی اور طریقہ فریب تخیل میں آسکتا ہے؟ عاشق کو بیجا خوشامد یا نیاز مندانہ التجائیں بھی نہیں کرنی پڑیں، محبوب بھی اپنے رخ زیبا کی تعریف سے خوش ہو کر اصرار بیجا سے باز رہا اور عاشق کا مقصد بھی حاصل ہو گیا۔ غور کرو اس انداز بیان کی بدولت یہ تمام مرحلے کس خوبی سے طے ہو گئے۔

بادۂ وصل کی چاشنی ایک نہایت لطیف چیز ہے اس لیے علامہ کو یہ گوارا نہیں کہ کوئی بد مذاق اس کو منہ لگائے کیونکہ اس کی لطافت برباد ہو جاتی ہے اور وہ اس قابل نہیں رہ جاتی کہ کوئی خوش مذاق اس سے لذت اندوز ہو سکے۔

گوئیا دشمن هم از نروقش نصیبے برده است
بادۂ وصلش چشیدم از مذاق افتاده بود

لیکن ہر بادہ خوار کے کام و دہن کے لیے اس کا اندازہ آسان نہیں ہے۔ اس کی تمیز صرف بلند مذاق رند ہی کر سکتے ہیں۔

مذکورہ بالا مثالوں سے کافی اندازہ ہو گیا ہو گا کہ علامہ کے مذاق رندی کی سرمستیوں کا کیا عالم ہے؟ لیکن ہمارے نزدیک جو چیز خاص طور پر قابل قدر اور علامہ کی صیحیح المذاق اور بلند نظری کی بہت بڑی دلیل ہے وہ یہ ہے کہ انتہائے سرور و مستی کی حالت میں بھی ان کی ادائیں ابتذال سے آلودہ ہونے نہیں پاتیں۔ حالانکہ رندی و مستی کے جذبات کو ابتذال کی آلائش سے پاک رکھنا نہایت دشوار ہے۔ اپنی اس بلندیٔ مذاق کا راز علامہ نے خود ظاہر کر دیا ہے۔

ساقی آن مے بقدح ریخت که از نرگس خویش
هر نفس دامِ همی کرد به مینا می کرد

غور کیجیے کہ ایسے جام لطیف کی مستی کبھی ابتذال و پستی کی طرف مائل ہو سکتی ہے؟ انداز بیان جس قدر لطیف اور دل کش ہے اس کا اندازہ صاحب ذوق بآسانی کر سکتا ہے۔ کسی تشریح کی ضرورت نہیں اور نہ ایسے اشعار کا لطف در اصل ترجمہ میں قائم رہ سکتا ہے۔

زہد و رندی دو متضاد چیزیں ہیں جن کا یک جا جمع ہونا بظاہر ممکن نہیں معلوم ہوتا۔ اس لیے اس موقع پر غالباً قارئین کو حیرت ہوگی کہ سیرۃ نبوی اور الفاروق ایسی کتابوں کا مصنف ایک رند سرمست کے لباس میں کیونکر نظر آ سکتا ہے؟ اور یہ کیسے یقین ہو سکتا ہے کہ ذوق سرمستی کا یہ بے پناہ طوفان اسی کی جنبش قلم سے اٹھا ہے

جس نے ظہور قدسی کی جان فروز سطریں لکھ کر سعادت دارین حاصل کی ہے اور اپنی اس روحانی پاکیزگی کا ثبوت دیا ہے جو باوجود وظائف نیم شبی اور اوراد سحری کے صومعہ نشنیوں کو نصیب نہیں ہوتی ۔ لیکن در اصل حیرت کی کوئی وجہ نہیں ۔ علامہ ایسے عالی ظرف اور صحیح الفطرت انسان بھی دنیا میں پیدا ہوتے ہیں جن کے ایک ہاتھ میں جام شریعت اور دوسرے ہاتھ میں سندان عشق ہوتا ہے اور ایک دوسرے کی زد سے دونوں محفوظ رہتے ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ ۔

ہر ہوسناکے نداند جام و سندان باختن

زہد و رندی کا یک جا جمع ہونا اہل ظاہر کو دشوار نظر آتا ہو لیکن علامہ کی فطرت صالحہ اور ذوق سلیم کے نزدیک کوئی مشکل کام نہیں ہے ۔

زہد و رندی را بہم کردن چہ مشکل کار بود
سعی ہا انگیختم کایں مشکل آسان کردہ ام

اس کوشش میں علامہ کے خامۂ حقیقت طراز نے جو کامیابی حاصل کی ہے اس کی بنا پر ان کا یہ دعویٰ بالکل بجا اور دورست ہے ۔

زہد را من آشنائی دادہ ام با عاشقی
ورنہ عمرے ہر دو را باہم نفاق افتادہ بود

اب ہم علامہ کے خمخانۂ عشق و محبت سے رخصت ہونا چاہتے ہیں کہ ابھی ہم کو ان کے دیگر اصناف سخن پر بھی تبصرہ کرنا ہے لیکن اس موقع پر مناسب نہ ہوگا اگر علامہ کے انداز بیان کی خصوصیات کا تذکرہ کئے بغیر قلم کی رفتار آگے بڑھ جائے ۔

روانی و برجستگیِ کلام

علاوہ شاعر ہونے کے علامہ بہت بڑے نقاد سخن بھی تھے اس لیے وہ بندش کی چستی ، فقروں کے دروبست ، الفاظ کی موزونی ، ترکیبوں کی لطافت وغیرہ کا خاص لحاظ رکھتے تھے کہ بغیر ان چیزوں کے انداز بیان جو شاعری کا ایک ضروری اور اہم عنصر ہے ، موثر اور دل کش نہیں ہو

سکتا - یہی وجہ ہے کہ علامہ کا کلام معنوی اور لفظی اسقام سے بالکل پاک ہے اور اس میں ایک خاص روانی و برجستگی پائی جاتی ہے اور پڑھتے وقت سامعہ کو ایک خاص لذت محسوس ہوتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک صاف شیریں قدرتی چشمہ ہے جس کی موجیں بلا کسی تکلف کے رقص کرتی ہوئی چلی جا رہی ہیں - چونکہ علامہ کو زبان پر غیر معمولی قدرت حاصل ہے اس لیے وہ لطیف ترکیبوں اور محاوروں کی آمیزش سے معمولی خیالات میں بھی ایک خاص لطف پیدا کر دیتے ہیں۔ مذکورہ بالا اشعار سے بھی ناظرین کو علامہ کے عام انداز بیان کی دل کشی کا کافی اندازہ کر سکتے ہیں چند مثالیں اور ملاحظہ ہوں -

شب بود و صد ہزار تماشائے دل فریب
صبح از کرانہ سرزد و دیدم کہ خواب بود

تا قدم رنجہ کنی بہر تماشائے چمن
ابر بہر تو مرا پردہ بہ گلشن زدہ بود

چشمس بشوئے ما نگہ ناتمام کرد
ساقی بہ جام ریخت مئے نا رسیدہ را

از بسکہ خوش محاورہ افتاد چشم او
کردیم فہم از و سخن ناشنودہ را

صد بار در حریم چمن پیش روئے تو
گلچیں بخاک ریخت گل تازہ چیدہ را

لطفش بہ غیر بیش زما بودہ است دوش
گویا عزیز داشت دل تو ربودہ را

افسوں طرازی نگہ ناز را بہ بیں
چیزے بمن نگفت و مرا گفتگو نماند

در دور چشم بادہ گسار تو مے فروش
خون می خورد کہ میکدہ را آبرو نماند

دیدہ و دل همه دکان تماشا چیدند
کان تماشا کدۂ حسن و ادا می آید

فغان که آں همه گنجینه هائے راز مرا
غمت ز سینه بروں داد بر زباں انداخت

فریب نرگس مست و کرشمۂ ساقی
مرا به پیروی شیوۂ فغاں انداخت

شوخے که از غرور بخود هم نمی رسد
عذرش بنه اگر نتواند بما رسید

منکر خانقه و صومعه نتواں بودن
ایں قدر مست که بت خانه دلاویز تراست

هم نے طوالت کے لحاظ سے ضرف چند مثالوں پر اکتفا کیا ہے ورنہ علامہ کے انداز بیان میں روانگی و برجستگی اور شوخی و رعنائی کا یہی عالم عام طور پر نظر آتا ہے۔ ان اشعار کو دیکھئے نفس خیال میں کوئی خاص قدرت نہیں صرف طرز ادا نے ایک خاص لطف پیدا کر دیا ہے جو محتاج بیان نہیں۔ خط کشیدہ ترکیبوں کی لطافت بھی خاص لحاظ کے قابل ہے۔ اس قسم کی لطیف ترکیبوں سے کلام کا حسن دو بالا ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے لیے ضرور ہے کہ شاعر علاوہ صحیح المذاق اور سخن سنج ہونے کے زبان پر پوری قدرت رکھتا ہو، خوش قسمتی سے علامہ کی ذات ان تمام اوصاف کی جامع تھی۔ اس لیے ان کے قلم سے ثقیل اور غیرفصیح اور مانوس الفاظ کبھی نکل نہیں سکتے تھے اور نہ پیرایۂ بیان کی بلندی و رعنائی میں کوئی فرق آسکتا تھا۔ خیالات کے متعلق اهل فن کی جو رائے بھی ہو لیکن جہاں تک زبان کا تعلق ہے کون کہہ سکتا ہے کہ یہ ایک کامل الفن خالص ایرانی شاعر کا لب و لہجہ نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک علامہ کی یہ شکایت

در سخن با خاکیان هند می سنجی مرا
ہے چه میدانی که ایں فن راچه سامان کرده ام

واقعہ نگاری

غزل گو شعراء میں عام طور پر مسلسل واقعہ نگاری کی صلاحیت بہت کم ہوتی ہے ۔ چنانچہ جب وہ اس میدان میں قدم رکھتے ہیں تو ان کی حالت اس درماندہ مسافر کی سی ہوتی ہے جو دو چار قدم بہ کوشش تن کر چلنے کے بعد طبعی ضعف کی وجہ سے دفعتاً لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے لیکن علامہ مرحوم کا قلم کسی صنف سخن کے میدان میں عاجز و درماندہ نظر نہیں آتا ۔ قصیدہ ، مثنوی ، ترکیب بند ، مراثی ، قطعات وغیرہ سب کے نمونے اس کلیات میں موجود ہیں لیکن ہر جگہ شاعر کے انداز بیان کی استادانہ پختگی اور غیر معمولی قوت نظم کا یکساں عالم نظر آتا ہے ۔

علامہ مرحوم طبعاً نہایت غیور اور خود دار تھے ۔ ان کو ہر حال میں اپنی عالمانہ شان و عظمت کے تحفظ کا خیال رہتا تھا ۔ اس لئے ان کا قلم کبھی ارباب دول کی بیجا اور خوشامدانہ مدح سرائی سے آلودہ نہیں ہؤا اور یہ ان کے مذاق شاعرانہ کی بلندی اور پاکیزگی کا بہت بڑا ثبوت ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ نے قصائد میں زیادہ تر واقعہ نگاری اور مناظر قدرت کی مصوری سے کام لیا ہے ۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں ۔

فصل بہار شعراء کا عام موضوع سخن ہے جو مدت ہائے دراز سے پامال ہوتا چلا آرہا ہے ۔ علامہ نے بھی اس موضوع پر ایک قصیدہ لکھا ہے جو کسی وجہ سے نا تمام رہ گیا ۔ تا ہم جو چند اشعار بیساختہ قلم سے نکل گئے ہیں ان کی رنگینی کا عالم ملاحظہ ہو ۔ فرماتے ہیں ۔

دوش ایں مژدہ بگوش گل و ریحاں آمد
کہ بہار آمد و بسیار بساماں آمد

ابر گوہر ہمہ افشاند چوں گریاں بگذشت
گل ہمہ زر بپراگند چوں خنداں آمد

آب را سلسلہ برپائے بہ بستند ز موج
بسکہ دیوانہ وش از طرف بیاباں آمد

لالہ چوں مغبچگاں چہرہ بہرہ افروخت بباغ
سنبل آشفتہ تر از طرۂ خوباں آمد

سبزہ سر بر زدہ از خواب دگر رفت بخواب
بسکہ باد سحرش مروحہ جنباں آمد

ہر حبابے کہ سراز آب بر آرد، گوید
باید از سر بتماشائے گلستاں آمد

می دمد گہ بچمن گاہ خرامد لب جوئے
یاد صبح آمد و بر شیوۂ مستاں آمد

بوئے گل ہست کہ بردوش صبا تکیہ زدست
من غلط کردم و گفتم کہ سلیماں آمد

آتش افروخت گل و مرغ چمن گشت خلیل
کہ برو آتش سوزندہ گلستاں آمد

زیں دو سہ حرف فزوں نیست مغاں را سخنے
کہ بہار آمد و ابر آمد و باراں آمد

غور کیجئے عالم بہار کے جتنے خاص پر کیف پہلو تھے ان سب پر شاعر کی نگاہ کس خوبی کے ساتھ پڑی ہے اور تشبیہات کی لطافت نے انداز بیان کو کس قدر مؤثر اور دلکش بنا دیا ہے۔

تذکرۂ کشمیر

علامہ مرحوم تبدیل آب ہوا کی غرض سے کشمیر تشریف لے گئے لیکن کچھ دنوں کے قیام کے بعد بیمار پڑ گئے اور وطن واپس چلے آئے۔ صحت یاب ہونے کے بعد علامہ نے ایک قصیدہ موسوم بہ قصیدہ کشمیریہ لکھا۔ جس میں علالت، علاج، تیمارداری اور صحت کے تمام حالات نہایت تفصیل کے ساتھ شاعرانہ انداز میں بیان کئے ہیں لیکن ابتدا میں کشیر کے جلوہ گاہ حسن و جمال کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ صرف علامہ ہی کے خامۂ رنگیں نگار کا کام ہو سکتا ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

گرچه شک نیست کہ آں ناصیه در زیبائی
گر تنزل بکنم خلدبریں را ما ناست

بسکه جوشیده زهر سوئے گل و لاله به دشت
از کراں تابہ کراں روئے زمیں ناپیداست

جاده را خود زخیاباں نتواں کرد تمیز
بسکه گل صف زده سرتاسر او از چپ و راست

جام گل رنگ که در بزم بائیں چینند
هم بداں گو نه گل از پهلوئے گل جلوه نماست

سبزه بر کوه فرو ریخته از سر تا بن
یا قبائے ست که بر قامت شخص آیدراست

راهرو را ندهد دل که نهد گام به راه
بسکه هر هر قدمش لاله و گل در ته پاست

دیدهٔ طفل که بر دامن مادر غلطد
جنبش باد بداں گو نه بروئے صحر است

کیا اس سے زیاده لطیف اور نادر کوئی اور تشبیه ذهن میں آ سکتی ہے ؟

گل به هر شاخ زبرگ ست فزوں تر گوئی
همه بر گل بفزود آں چه که از برگ بکاست

سرو اگر پائے بدامن نکشد ، خود چه کند
زانکه ار جوش گل و لاله چمن تنگ فضاست

بسکه بر هر قدم ار لاله چراغے بنهند
در شب تار کسے گم نشود از ره راست

کشیر میں ایک مشهور جهیل ہے جس کا نام ''ڈل'' ہے - اس کی صفائی اور لطافت کی تصویر ان الفاظ میں کهینچی ہے -

آبگیرے که بشهرست و بود نامش ڈل
گوئیا آئینه در دست عروسے زیباست

سینۂ صاف دلان ست و ھمانا کز لطف
ھر چہ در بن بود از صفحۂ رویش پیداست

گرد بر گرد ڈل آن صف زدن لالہ و گل
چوں طرازیست کہ بر دامن شوخے رعناست

کشیر میں ایک خاص قسم کی گھاس ھوتی ھے جس کو سطح آب پر پھیلا کر خاکپوش کر دیتے ھیں اور اس پر مختلف چیزوں کی کاشت کرتے ھیں ۔ اس حیرت انگیز قوت نامیہ کی طرف اس شعر میں اشارہ کیا گیا ھے ۔

آب بالائے زمیں باشد و ایں جا بینی
کہ زمیں بر سر آ بست و ھماں پا بر جاست

آخر میں سلسلۂ سخن کی طوالت کا جو عذر شاعر نے پیش کیا ھے وہ سننے کے قابل ھے ، ملاحظہ ھو ۔

گرچہ دانم کہ سخن خود بہ درازی بکشید
چہ تواں کرد سخن ھم ز سر نشو و نماست

اس کے بعد علامہ نے اپنی علالت و علاج وغیرہ کے واقعات نہایت تفصیل سے بیان کئے ھیں یعنی کس طرح ان کو بخار آیا ؟ اس بخار کی نوعیت کیا تھی؟ اس کی شدت اور تکلیف کا کیا عالم تھا؟ مقامی احباب نے کس طرح خلوص اور ھمدردی کا اظہار کیا ؟ طبیب نے نبض وغیرہ دیکھ کر اور تمام اسباب و علل پر غور کرکے مرض کی کیا تشخیص کی ؟ علاج سے کیا فائدہ ھؤا ؟ فائدہ ھو کر پھر دوبارہ مرض نے کس شدت کے ساتھ عود کیا ؟ غایت ضعف کی وجہ سے زندگی سے مایوس ھو کر پھر اپنی املاک و دولت کے متعلق بطور وصیت کیا ھدائتیں کیں ؟ وطن کس حالت میں واپس آئے ؟ یہاں کس قسم کا علاج ھؤا اور کب تک ھوتا رھا ؟ صحت کیونکر ھوئی ۔ ان تمام جزئی واقعات کو علامہ نے جس خوبی سے نظم کیا ھے اس سے اندازہ ھوتا ھے کہ ان کے قلم کو واقعہ نگاری پر کس قدر قدرت حاصل تھی ۔ آخر میں اپنے احباب خاص کو مژدۂ

صحت دینے کے بعد اپنے متعلق فرماتے ہیں اور کس قدر صحیح فرماتے ہیں۔

شبلی امروز بود بلبل بستان سخن
که از و گل کدهٔ هند پر از صوت و نواست

علامہ کے کمال واقعہ نگاری کی ایک دوسری مثال وہ قصیدہ ہے جو انہوں نے اپنے سفر روم کے حالات میں لکھا ہے۔ یہ قصیدہ دراصل ایک منظوم سفر نامہ ہے جس کو پڑھنے کے بعد معلوم ہوجاتا ہے کہ سفر کا اصلی مقصد کیا تھا؟ کس تاریخ کو اس کا آغاز ہؤا؟ جہاز پر کیا کیفیت رہی؟ کن کن مقامات سے گذر ہؤا؟ ان مقامات کی کیا حالت تھی؟ کہاں کہاں جہاز نے قیام کیا؟ اور کب منزل مقصود پر پہنچا؟ افسوس ہے کہ طوالت کے لحاظ سے ہم اس پورے قصیدے کو نقل نہیں کر سکتے، چند ابتدائی اشعار ملاحظہ ہوں۔

بہر تکمیل فن و هم پئے تحصیل عبر
روز گاریست که می داشتم آهنگ سفر

فارغ از حج و زیارت چو مرا کرد خدائے
خواستم تابسوئے روم شوم راه سپر

گرچه من گرم طلب بودم و بس مستعجل
لیک تاخیر همی رفت بفرمان قدر

دیر آں مایه شد آخر که حسوداں گفتند
که فلاں جز هوسِ خام ندارد در سر

من دریں غصه و غم خون جگر می خوردم
ناگهاں شاهد مقصود در آمد از در

اتفاقے عجبے گشت مرا عقده کشا
که از و وهم و گماں نیز نمی داشت خبر

یک دومه پیشترک زاں که زنم کوس رحیل
بودم از زحمت تپ خسته دل و تفته جگر

عزم دیرینہ بیاد آمد و گفتم چہ خوشست
کہ بیک حیلہ دوتا کار برآرد داور

آغاز سفر میں جہاز پر دو تین روز جو کیفیت رہتی ہے اس کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے ۔

الغرض از رمضان بست و ششم بود کہ من
گرم برخاستم از جائے و شدم راہ سپر
اوفتادم برہ کوہ و بیابان یک چند
بس بکشتی بہ نشستم من و یاران دگر
زحمتے صعب کشیدیم بکشتی دو سہ روز
بسکہ از موج بہر لحظے شدے زیر و زبر
کس نیارست سرش باز گرفت از بالیں
کس نیارست جدا کرد تنش از بستر

اس کے بعد جہاز جن مختلف مقامات سے گذرا ان کی تفصیل بیان کی ہے اور ہر مقام کی حالت بھی مختصراً بیان کر دی ہے ۔ مثلاً عدن کے متعلق لکھتے ہیں ۔

کوہساریست کہ ہر چند بلندست و فراخ
لیک از سبزہ و گل نیست در و ہیچ اثر
ہر کجا می گذری ، ریگ روانست و خزف
ہر طرف می نگری خاک سیاہ است و حجر
گبرو ترسا کہ نزیل اند دریں بقعہ ہمہ
بزبان عربی حرف زدندے یکسر

سویز میں اگرچہ جہاز نے بہت کم قیام کیا تھا تاہم اس کا تذکرہ قلم انداز نہیں کیا ہے ۔ فرماتے ہیں ۔

ایں ہماں نہر عجیبست کہ زنیساں کارے
جز در افسانۂ پاریں نہ شنیدیم دگر

بست فرسنگ دراز ست و بہ پہنا چندان
کہ دو دابور توانند از و کرد گذر

بیروت پہنچ کر جو دلکش سماں نظر آیا ہے اس کی تصویر ان الفاظ میں پیش کی ہے -

خوب جائے ست کہ نا خواستہ در بازد دل
ہر کہ سوزے بدلش دارد و دردے بجگر

موضع خرم و سیرے خوش و جائے دلکش
راہ ہموار و زمیں پاک و مکان خوش منظر

گبر و مسلم ہمہ خوش و جامۂ و موزوں اندام
خاص و عامی ہمہ گلگوں تن و زیبا پیکر

چون بروں رفتم ازیں جائے و ازان چارہ نبود
پیش می رفتم و بازم بقضا بود نظر

غرض اس طرح تمام مقامات راہ کا تذکرہ کرتے ہوئے بخیر و خوبی منزل مقصود پر پہنچتے ہیں لیکن سلسلۂ بیان میں کوئی انتشار یا پراگندگی پیدا ہونے نہیں پائی ہے ، بلکہ شروع سے آخر تک روانی اور تسلسل کا یکساں عالم نظر آتا ہے -

واقعہ نگاری کا اصلی کمال یہی ہے کہ جو واقعہ یا منظر پیش کیا جائے اس کی مکمل تصویر آنکھوں کے سامنے آ جائے یعنی کوئی خاص پہلو یا رخ نظر انداز ہونے نہ پائے ورنہ تصویر ناقص اور بے کیف ہو کر رہ جائے گی - اس موقع پر انداز بیان کی موزونی کا بھی لحاظ ضروری ہے یعنی جس قسم کا واقعہ یا منظر ہو اسی مناسبت سے پیرایۂ بیان اور الفاظ کا بھی انتخاب ہونا چاہئے ورنہ پوری نظم نغمۂ بے آہنگ ہو کر رہ جائے گی لیکن ان مقاصد میں حصول کامیابی کا انحصار شاعر کی قوت مشاہدہ ، قدرت زبان اور بلاغت شناسی پر ہے - قوت مشاہدہ اس لئے ضرروری ہے کہ واقعہ کا کوئی مؤثر پہلو چھوٹنے نہ پائے - قدرت زبان اس لئے درکار ہے کہ انداز بیان غیر مربوط اور پراگندہ نہ ہونے پائے -

بلاغت شناسی کی اس لئے ضرورت ہے کہ جو الفاظ استعمال کئے جائیں وہ واقعہ کی نوعیت کے لحاظ سے موزوں اور مناسب ہوں ۔

علامہ کے قصائد میں یہ تمام خصوصیتیں کافی طور پر موجود ہیں ۔ مثلاً قصیدہ کشمیریہ کو دیکھو جہاں تک کشمیر کے دل فریب قدرتی مناظر کا تعلق ہے غور کرو ۔ انداز بیان کس قدر شاعرانہ کیف و رنگینی میں ڈوبا ہؤا ہے لیکن جہاں سے واقعات کا ذکر شروع ہوتا ہے یہ رنگینی دفعتاً سادگی سے بدل جاتی ہے کہ اب شوخی و رعنائی کا موقع نہیں۔

اس سلسلہ میں علامہ کا قصیدہ عیدیہ خاص لحاظ کے قابل ہے جس میں انہوں نے عید کے عیش و طرب کی ہنگامہ آرائیوں کا منظر دکھلایا ہے ۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں جن سے اندازہ ہوگا کہ بحیثیت واقعہ نگار کے علامہ کی نگاہ کس قدر باریک بیں واقع ہوئی تھی ۔ فرماتے ہیں :

روز عید ست و دگر کار جہاں گشت بساز
بار شد بر رخ گیتی در امیّد فراز

سخن از مے چہ کنی ؟ بادہ چہ خواہی امروز؟
نشۂ عیش ندارد ، بمے و بادہ نیاز

مردماں بسکہ زہر گوشہ فراز آمدہ اند
نگہ از تنگیٔ جابار نمی یابد باز

آں یکے جلوہ فروش آمدہ در خانۂ زیں
واں دگر برزدہ بر ہودج زر بالش ناز

آں یک ار تابش خور پردہ فروہشتہ بروے
واں دگر در کنف چتر شدہ جلوہ طراز

واعظ آراستہ عمّامہ و از روئے شرف
شملہ را کردۂ چوں سر رشتۂ امیّد دراز

زاہد سادہ ہم از کلبۂ تنہائی خویش
با کہن خرقۂ خود رفت بروں بہر نماز

باھمه شوکت و فر، باھمه تمکین و شکوه
خلق در عید گه آمد زره صدق و نیاز

نفسے چند نشستند دو زانو وانگه
راست چوں سرو ، ستادند پئے ذکر و نماز

مفتیٔ شهر هم از جا به امامت برخاست
باهمه صدق و صفا ، باهمه اخلاص و نیاز

آن چه بایست ز ترتیل و سکون در قرأت
همه بر وجه حسن کرد ادا آں مختار

پس دگر خطبه بفرمود به آواز بلند
خطبهٔ چوں سخن قامت محبوب دراز

شور برخاست زہر دم که مبارکبادا !!!
عید و ایں گرمیٔ هنگامهٔ ایں زینت و ساز

کودک از روئے ادب عرض نیایش می کرد
پیر گفتی صدوسی سال ترا عمر دراز

واقعہ نگاری کے لحاظ سے ان اشعار پر غور کیجئے ۔ عید کا پورا منظر آنکھوں کے سامنے آ جاتا ھے ۔ کوئی معمولی شاعر لکھتا تو غالباً صرف اتنا کہہ کر رہ جاتا کہ عید گاہ میں مختلف قسم کے لوگوں کا ہجوم ہؤا ۔ نماز ادا کی ۔ امام نے خطبہ پڑھا اور لوگ سلام و معانقہ کر کے اپنے گھروں کو واپس چلے گئے ۔ لیکن شان و شوکت کے ساتھ عید گاہ میں ہر گوشہ سے لوگوں کا جمع ہونا ، کسی کا پیدل اور کسی کا مزین سواری پر آنا ، کسی کا دھوپ سے بچنے کے لئے چہرے کو کپڑے سے چھپائے رکھنا اور کسی کا چھتری لگائے رہنا ، چند منٹ تک لوگوں کا دو زانو ہو کر مسجد میں مؤدب بیٹھنا اور پھر نماز کے لئے کھڑا ہونا ، امام کا باقاعدہ قرأت کرنا ، نماز ختم ہونے پر ایک طویل خطبہ پڑھنا ، لوگوں کا ایک دوسرے کو مبارکباد دینا ، چھوٹوں کا بڑوں کو سلام کرنا اور بڑوں کا بزرگانہ دعائیں دینا ، ان تمام جزئیات

پر ، جن کے بغیر واقعہ کی تصویر نامکمل رہ جاتی ، ایک دقیق النظر شاعر ہی کی نگاہ پڑ سکتی تھی -

اس موقع پر دفعتاً مسلمانوں کے گذشتہ جاہ و جلال کا منظر علامہ کی نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے اور ان کا درد آشنا دل تڑپنے لگتا ہے - کہ وہ قوم کے کوکبۂ سطوت و جبروت کے آگے بڑے بڑے کج کلاہوں کی گردنیں خم ہوگئی تھیں ، اور جس کی تیغ و قلم کے نادر المثال فتوحات کے ابدی نقوش اب تک تاریخ عالم کے صفحوں پر چمک رہے ہیں آج وہ کس زوال و پستی کی حالت میں ہے اور اس کا افق حیات کس قدر تاریک اور غبار آلود نظر آتا ہے - ارباب ذوق پر ظلم ہوگا اگر ہم ان کو علامہ کے ان احساسات سے لطف اندوز ہونے کا موقع نہ دیں - انداز بیان کا جوش و خروش ملاحظہ ہو ، فرماتے ہیں -

خود ہماں جمع کہ می داشت بہم تیغ و قلم
خود ہماں قوم کہ بودہ ست بہر پایہ فراز

آں کہ در انجمن فضل نمی داشت ہمال
آں کہ در بزمگہ دھر نبودش انباز

آں کہ جاں در تن افسردہ معنی بدمید
آں کہ برداشتہ قفل از در گنجینۂ راز

ہیئت و ہندسہ را پایہ ازو گشت بلند
منطق و فلسفہ را ، داد ہم او، زیب و طراز

یاد آں رونق بازار ہنر در بغداد
یاد آں گرمئی ہنگامۂ فن در شیراز

قرطبہ آں کہ ازو کسب ہنر کرد فرنگ
واں سلر نو ، کہ اطالیہ ، باو داشت نیاز

خود ہماں جمع ، کہ افراخت بعیوق علم
آں کہ بر اوج فلک سود کلہ گوشۂ ناز

آں که پامال خرامش چه خراساں وچه پارس
آنکه تاراج نگاهش چه عراق وچه حجاز

آں کد دیلم بجبین داغ سجودش برداشت
آں که سلجوق بخاک در او کرد نماز

روم را لرزه بر اندام زبانگ غضبش
هند را غلغلۂ مقدم او زهره گداز

فتح را از پئے طاعت خم تیغش محراب
بخت را بهر پرستش در او کعبۂ راز

رخ او بود که تاج از سر قیصر بر بود
تیغ او بود که شد بادل کسریٰ همراز

اینک آں قوم بحالیست که نتواں گفتن
خود به بین تا بچه انجام رسید آں آغاز

ناله بے خواست بر آید ز دل خستۂ ما
شیشه راهست به هنگام شکستن آواز

هرچه بر ماست هم از دست سیه کارئی ماست
گلۂ نیست زبخت و فلک عربده ساز

غور کرو ان چند اشعار میں شاعر نے کس خوبی اور جوش کے ساتھ مسلمانوں کے عہد اقبال و کامرانی کا پورا سماں ہماری نگاہوں کے سامنے کر دیا ہے - تاریخی واقعات کو انداز بیان کی شعریت قائم رکھتے ہوئے اس طرح پرجوش طریقه پر نظم کرنا دراصل شاعری کا ایک بڑا کمال ہے - ان اشعار کی تاثیر کا ایک خاص سبب یه ہے که یه خود شاعر کے قلب و روح کے تاثرات ہیں -

جدت پسندی

علامه مرحوم کی طبیعت میں اجتهاد اور جدت کا غیر معمولی ماده تھا اس لئے فن میں ان کا قدم عام شاهراه سے همیشه الگ پڑتا تھا -

شاعری میں بھی قدیم روش جس کو واقعیت اور سادگی سے بہت کم تعلق تھا ان کی جدت پسند طبیعت کو بہت زیادہ پسند نہ تھی - چنانچہ ایک قصیدے میں قدیم انداز تغزل اور مدح سرائی پر پر زور الفاظ میں تعریض کی ہے اور قدماء کی کورانہ تقلید کو ننگ همت قرار دیا ہے، فرماتے ہیں۔

جادۂ پیشرواں رفتم و دانم کہ خرد
اندریں شیوہ نہ بامن بمدارا ماند

ننگ همت بود آرے کہ زبان تازہ کنی
هم ازاں جرعۂ باقی کہ بہ مینا ماند

نیست جز دوئی فطرت کہ ببازار کمال
چشم دوزی بمتاعے کہ زیغما ماند

صرفہ نبود کہ هماں بر روش پیشرواں
خامہ در راہ سخن بادیہ پیما ماند

داستاں چند تواں کرد ز محمود و ایاز
تابکے خود سخن از وامق و عذرا ماند

گر نسیم از شکن زلف کشاید گرہے
فکر را با تو صد آویزش بیجا ماند

سفلۂ رابستائی و بگوئی کہ بجاہ
کمترین بندۂ او جم و دارا ماند

هرزۂ چند بہم بافی و سنجی کہ بدهر
سخنت خاتمۂ دفتر انشاء ماند

شیوۂ مدح و غزل گرچہ دلارا دو شیست
مبتذل گشت نہ چنداں کہ گوارا ماند

قصیدہ نگاری

اس میں شبہ نہیں کہ عام شعراء کی بدمذاق کی وجہ سے غزل

صرف مصنوعی اور عامیانہ جذبات کی تماشا گاہ بن کر رہ گئی - قصیدہ جو مختلف قسم کے واقعات و مناظر کی مصوری کا ایک نہایت نمایاں آلہ تھا اس کا خاص موضوع مدح قرار دیا گیا جس میں بجز مبالغہ کے اصلیت کا شائبہ بہت کم ہوتا تھا - صنائع و بدائع ، لفظی خراش تراش ، دور ازکار اور خارج از قیاس تشبیہات و استعارات وغیرہ یہ تمام چیزیں ، جن کو نفس شاعری سے کوئی تعلق نہ تھا ، عام طور پر شاعری کے کمالات میں داخل ہو گئی تھیں - تخیلات جس قدر پادر ہوا اور جادۂ حقیقت سے دور ہوں اسی قدر وہ تعریف کے قابل سمجھے جاتے تھے - ظاہر ہے کہ ایسے فرسودہ ، مصنوعی اور بے کیف انداز سخن کی تقلید پر علامہ کا نکتہ سنج اور جدت آفریں دماغ کب آمادہ ہو سکتا تھا - چنانچہ اس محدود دائرۂ شاعری کی تقلید کے خلاف انہوں نے پر جوش صدائے احتجاج بلند کی ہے ، فرماتے ہیں -

هاں و هاں چند تواں بود به تقلید اسیر
وائے آں کس که بره سلسله برپا ماند

پائے ازین دائرۂ تنگ برون نه که سخن
خود محیطیست که هر قطره به دریا ماند

راستی ورز و چناں پیکر گفتار آرائے
که فروغ اثر از ناصیه پیدا ماند

اس کے بعد بطور مثال کے صبح کے منظر کی تصویر اپنے دلکش انداز میں پیش کی ہے - چند اشعار ملاحظہ ہوں -

مشک شب جمله بتاراج رود و زدم مهر
شوشۂ میم پراگنده به هر جا ماند

سحر از جیب اُفق سر بزند خنداخند
شب بخود پیچد و از غصه بسودا ماند

آید از صحن حرم بانگ موذن درگوش
دیر از نالۂ ناقوس پر آوا ماند

رندبا شیشه و مے راہ چمن گیرد و شیخ
در غم سبحه و مسواک و مصلاّ ماند

چمن از غلغلۂ مرغ به جنبش افتد
کوه از قہقۂ کبک پرآوا ماند

پاسبانان زسرِ کوچۂ و ره برخیزند
درمیخانه بروئے همه کس وا ماند

کارواں ها ، بره افتند و جرس ناله کشد
دشت و صحرا پراز آوازه و غوغا ماند

رند میخواره که از بادۂ دوشیں سرمست
همچناں فارغ از اندیشۂ فردا ماند

گاه سر بر زند از خواب و رود باز بخواب
گاه مخمور زجا خیزد و از پا ماند

دست در گردن معشوق چو خیزد عاشق
هم بدست دگرش گردن مینا ماند

ایسے وقت میں خود علامہ کس عالم میں ہیں ، وہ بھی ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں۔

در چنیں وقت به نعمانی آشفته گذر
که قلم در کف و آمادۂ انشاء ماند

طوالت کا لحاظ ضرور ہے تاہم ناظرین کو اس قصیدہ کی تشبیب کے چند اشعار سنائے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا ۔ تغزل کی حیثیت سے بھی ان اشعار پر غور کرنے کی ضرورت ہے ، ملاحظہ ہو۔

دل پر حوصله آخر چو ز دعوی ماند
تا که آرد که به درد تو شکیبا ماند

راضیم از نگه شوق که گوید همه باز
از زبان آنچه دم عرض تمنا ماند

بر سراپائے جمال تو نگاهم گوئی
رهروے هست که از ضعف بهر جا ماند

ارمغانے نبود در خاک در او
مگر آن سجده که آماده یه سیما ماند

نو بهاران همه نرگس بدماند که چمن
بر جمالت همه تن محو تماشا ماند

مے بیاشام و لب لعل مے آلود ببوس
کیں گنه در روش عشق به تقویٰ ماند

اس شوخی اور شوریدہ مزاجی کی داد دینا آسان نہیں ھے - اگر کسی میں اتنی جرأت بھی نہ ھو تو اس کو اس بادۂ مردافگن کے دور جام کی تمنا نہ کرنی چاھئے -

مسلسل نظمیں

علاوہ قصائد کے علامہ نے اکثر مسلسل نظمیں ترکیب بند کی شکل میں مختلف موقعوں پر لکھی ھیں جن میں انہوں نے خاص طور پر اپنے قومی اور مذھبی درد کا اظہار کیا ھے اور مسلمانوں کو اسلاف کے گذشتہ کارناموں کی یاد دلا کر موجودہ خواب غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش کی ھے اور بتایا ھے کہ ان کی اصلی فلاح و ترقی کا راز یورپ کی کورانہ تقلید نہیں بلکہ صرف کتاب و سنت کی پیروی میں پوشیدہ ھے - اس میں شبہ نہیں کہ علمی حیثیت سے علامہ نے مفکرین مغرب کی طرز تحقیق و تنقید سے بہت کچھ فائدہ اٹھایا تھا وہ ان تنگ نظر قدیم علماء میں سے نہ تھے جو یورپ کا نام لینا بھی کفر سمجھتے تھے لیکن اس جلوہ گاہ مادیت کی ظاھری آب و رنگ کی تہ میں جو اخلاق اور روحانی تیرگی و پستی کا منظر پوشیدہ تھا ، وہ ھمیشہ ان کی حقیقت آشنا نگاھوں

کے سامنے رہا - ان کا مسلمانوں سے یہ مطالبہ نہ تھا کہ وہ دنیا کو چھوڑ دیں اور قدرت نے ان کے نظام جسمانی کی راحت و آسائش کے لئے جو سامان پیدا کیا ہے اس کو کام میں لانے کی کوشش نہ کریں بلکہ ان کو ترک دین کی معصیت کا افسوس تھا ، وہ دین اور دنیا دونوں کو ساتھ لے کر چلنا چاہتے تھے کہ اسلام کی حقیقی تعلیم یہی تھی - ان کو جدید تعلیم یافتہ گروہ سے یہ شکایت نہ تھی کہ اس نے مغرب کے علوم و فنون سیکھنے میں غیر معمولی شغف سے کام لیا ہے بلکہ ان کو اس کا صدمہ تھا کہ یہ گروہ یورپ کی تقلید میں اس درجہ محو ہو گیا ہے کہ اس کو اپنے بزرگوں کی کوئی داستان یاد نہیں رہی اور ذہن سے یہ خیال بالکل جاتا رہا کہ اس فریب گاہ رنگ و بو سے ماورا بھی ایک اور عالم ہے جس کا تعلق انسان کے قلب و روح سے ہے - یہی وہ عالم ہے جس کو برباد کر کے دنیا حقیقی عیش و سکون کی دولت سے محروم ہوگئی ہے - چنانچہ علامہ نے ایک ترکیب بند میں دنیاوی جاہ و حشم کے تماشائیوں کو اس عالم روحانی کے سیر و تماشا کی خاص طور پر دعوت دی ہے - چند اشعار ملاحظہ ہوں -

عالمے ہست کہ آنجا سخن از جان باشد
عالمے ہست کہ دارویش ہمہ درمان باشد

عالمے ہست کہ ہر ذرۂ او را بہ فروغ
پنجہ در پنجۂ خورشید درخشان باشد

عالمے ہست کہ آنجا برہ و رسم نیاز
چرخ و انجم ہمہ سر بر خط فرمان باشد

خاک او معتکف دیلم و سلجوق بود
در گہش سجدہ گہ قیصر و خاقان باشد

سخن آنجا رود از منبر و محراب دعا
گر حدیثت ہمہ از گنبد و ایوان باشد

سامری دم نتواند زدن آنجا که خود او
پنجہ برتافتۂ موسی عمران باشد

داستان ہائے تو افسانۂ شاہست و وزیر
حرف آن بزم ز پیغمبر و یزدان باشد

تو حدیث از جم و دارا بسرائی و آن جا
گفتگو از عمر رض و حیدر رض و عثمان رض باشد

توبہ فرمودۂ اسپنسر و بیکن نازی
سخن آنجا ہمہ از گفتۂ یزداں باشد

کم ز آئین جہانداری سولن نبود
آن اساسے کہ بر آوازۂ نعماں باشد

ہان نگوئیم کہ آن گیری و این بگذاری
حیف باشد کہ تو سر رشتۂ دین بگذاری

علامہ کو دنیاوی جاہ و حشم کے حصول پر اعتراض نہیں، ان کو جو کچھ شکایت ہے وہ یہ ہے۔

خوش بود این کہ ترا جاہ و حشم ہم باشد
لیک حیف ست اگر حرمت دین کم باشد

ملک و دین ہر دو بپا گشتۂ نیروئے ہم اند
اندران کوش کہ این باشد و آن ہم باشد

شرط اسلام نباشد کہ بہ دنیا طلبی
التفات توبہ دین نبوی کم باشد

نکتۂ شرع بہ افسانہ برابر بہ نہی
یورپ از گپ زند آن نیز مسلم باشد

حل ہر مسئلۂ فقہ ز یورپ طلبی
شرع پیش تو ز تقویم کہن کم باشد

از ابو بکر رض و عمر رض هیچ به یادت ناید
گرمیٔ بزم تو از سیزر اعظم باشد

در سخن بگذرد از سیرت و شان نبوی
هرچه گوئی همه از گفتهٔ ولیم باشد

آن چه حق است ترا در نظر آید باطل
آن چه شهد است به کام تو همه سم باشد

غور کیجئے جدید تعلیم یافتہ گروہ کی ذہنیت کی یہ کتنی صحیح تصویر ہے۔

علامہ تعلیم جدید کے مخالف نہ تھے، وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ مسلمان شوق سے مغربی علوم و فنون سیکھیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ اپنے قومی اور مذہبی خصائص کو زندہ قائم رکھیں۔ چنانچہ ایک دوسرے ترکیب بند میں اس گروہ کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں۔

ایکه بر مائدهٔ یورپ مہمان باشی
حیف باشد اگر از جملهٔ ایشان باشی

حیف اگر از اثر فلسفهٔ مغربیان
منکر فلسفهٔ سنت و قرآن باشی

گفتهٔ سولن و آئین جہانبانیٔ او
بر زبان داری و بیگانهٔ ز نعمان باشی

از هنیبال صد افسانهٔ دستان گوئی
جاهل از معرکه هائے شه مردان باشی

قیصران را همه یک یک بشماری ز آغاز
بے خبر از عمر رض و حیدر رض و عثمان رض باشی

از خداوند جہان یاد نیاری گاہے
روز و شب خود به پرستاریٔ سلطان باشی

ور بپرسی که دریں کار چه تدبیر بود؟
دین و دنیا بہم آمیز که اکسیر بود

یہ کوئی نیا نسخہ نہیں ہے بلکہ تیرہ سو برس پہلے ایک طبیب روحانی نے یہ نسخہ دنیا کے سامنے پیش کیا تھا جس کا کبھی یہ اثر تھا کہ مسلمان جس میدان میں قدم رکھتے تھے فتح و کامرانی ان کے همرکاب رہتی تھی لیکن یہی قیصر و کسریٰ کے تاج و تخت کو ٹھکرانے والے آج خود ذلت و نامرادی کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں ، صرف اس لئے کہ ان کے ہاتھ سے دین الٰہی کا سر رشتہ چھوٹ گیا ہے اور وہ اس صدائے حق کو بھول گئے ہیں - جو افواج باطل کے لئے ہمیشہ پیام شکست بن کر بلند ہؤا کرتی تھی -

اس موقع پر ہمارے جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کو شاید یہ جاننے کا اشتیاق ہو کہ علامہ کو جس جماعت سے تعلق تھا اس کی ظاہری شان و شوکت کا کیا عالم ہے اور وہ جس درسگاہ کے مبلغ و علمبردار تھے اس میں داخل ہو کر ان کو وہ کون سی متاع بے بہا نصیب ہو سکتی ہے جو مغربی مدارس کی فلک بوس عمارتوں میں نہیں مل سکتی سب سے پہلے اس جماعت کی دنیاوی حیثیت کا حال سننا چاہئے - فرماتے ہیں -

مانه آنیم که دیہیم سکندر طلبیم
مانه آنیم که اورنگ سلیمان داریم

مانه آنیم که با حاجب و دربان باشیم
مانه آنیم که بام و در و ایوان داریم

مانه آنیم که با مسند و بالین ارزیم
مانه آنیم که سرداب و شبستان داریم

مانه آنیم که یک شیوۂ بائیں گیریم
مانه آنیم که یک کار بہ ایسان داریم

خاکساران جہانیم و ز اسباب جہان
بوریائیست که در کلبۂ احزان داریم

اب اس کلبۂ احزاں کے بوریا نشینوں کے پاس جو گراں مایہ دولت ہے اور جس کے سامنے ان کی نگاہوں میں دنیاوی جاہ و جلال کوئی وقعت

نہیں رکھتا اس کی تفصیل ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں۔

عجز و افتادگی و طوع و رضا خواهی هست
گر زما شیوهٔ پیشینهٔ ما خواهی هست

افسر و تاج و کمر بند و کله جوئی نیست
جامهٔ کهنه و پارینه ردا خواهی هست

قصر و بام و حرم وگنبد اگر خواهی نیست
مسجد و منبر و محراب دعا خواهی هست

آن مئے کوز فرنگ ست نداریم بجام
بادهٔ خمکدهٔ صدق و صفا خواهی هست

شرح افسانهٔ رو من نتوان جست زما
ور دلاویز حدیث خلفاء خواهی هست

ماورا وائے تپ و دردندانیم ولے
گر ز رنجوری الحاد شفا خواهی هست

گفتهٔ بیکن و دیکار نداریم بیاد
در حدیثے ز رسول دوسرا خواهی هست

آج اسی متاع گراں ارز سے بے بہرہ ہونے کا نتیجہ جمعیت اسلام کی وہ پستی و زبوں حالی ہے جس کا نقشہ علامہ نے اسی ترکیب بند کے ایک بند میں پیش کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

آن که در معرکه تاج از سر قیصر بر بود
دست و بازوش بیکبار ز کار افتاد ست

آں که چوں مہر جہاں تاب بعالم می تاخت
خاک ره گشتهٔ و در راه گذار افتاد ست

آں که صد قلعهٔ روئین بیکے حمله کشود
حالیا از همه سو خود بحصار افتاد ست

دست و سر پنجۂ آں شیر ژیان رفت زکار
تہمتن در تہ چہ ؟ آمد و خوار افتاد ست

آں کہ در پیکر صد مردہ ھمی جان بدمید
ھست بر بستر بیماری وز ار افتاد ست

مرغ خوش زمزمہ را کار بصیاد افتاد
دامن شاھد گل درکف خار افتاد ست

می نہ بینی کہ نژاد عرب و آل لوئی
خوار و سرگشتہ بہر شہر و دیار افتاد ست

دست ھر سفلہ بغارت گریش گشتہ دراز
ھمچو بغداد کہ در دست تتارا افتاد ست

مذکورہ بالامثالیں واقعہ نگاری کی حیثیت سے بھی قابل لحاظ ھیں۔ اب یہ نہیں کہا جاسکتا کہ علامہ مرحوم کا دائرۂ سخن صرف غزل تک محدود تھا اور ان کے قلم میں واقعات ، حالات اور قدرتی مناظر کی نقاشی کی قابلیت نہ تھی بلکہ واقعہ اس کے بالکل برعکس نظر آتا ھے۔ ان مثالوں پر غور کرو قوت نظم میں کوئی سستی یا ترتیب خیال میں کوئی پراگندگی محسوس نہیں ھوتی اور انداز بیان کی شاعرانہ لطافت و رنگینی ھمیشہ قائم رھتی ھے ۔ ھمارے نزدیک ایک با کمال شاعر کی خاص خوبی یہ ھے کہ وہ ھر قسم کے مضامین پیدا کرتا ھے لیکن وہ کبھی نہیں بھولتا کہ وہ شاعر ھے اور وہ جو کچھ کہتا ھے ھمیشہ شاعرانہ انداز سے کہتا ھے ۔ خواجہ حافظ کا خاص کمال یہی ھے کہ انہوں نے فلسفہ ، اخلاق ، تصوف ، سیاست وغیرہ ھر قسم کے مضامین ادا کئے ھیں لیکن پیرایۂ بیان کی شاعرانہ لطافت و رنگینی کا رشتہ کبھی ھاتھ سے چھوٹنے نہیں پاتا ۔ علامہ مرحوم کے انداز بیان کی بھی یہی خاص خصوصیت ھے کہ وہ معمولی باتیں بھی اس طرح ادا کرتے ھیں کہ ان میں خاص مزہ محسوس ھونے لگتا ھے ۔ مثال کے طور پر دیکھئے کہ یہ خیال کہ " مسلمان کس قدر کمزور اور بے جان ھو گئے ھیں کہ جو چاھتا ھے ان کو

غارت کرنے کے لئے کھڑا ہو جاتا ہے۔" کتنا معمولی خیال تھا لیکن غور کیجئے " همچو بغداد که در دست تتار افتاد ست " کی تاریخی تشبیہ نے اس خیال کو کس قدر پر لطف طریقہ پر ادا کر دیا ہے۔ یہ بات بھی کتنی معمولی تھی کہ " مسلمان دشمنوں کے دام ستم میں گرفتار ہیں۔" لیکن اس کو کس انداز سے ادا کیا ہے۔

مرغ خوش زمزمه را کار به صیاد فتاد
دامن شاهد گل در کف خار افتادست

اس کا نام شاعرانہ انداز بیان ہے۔ بات کیا تھی ؟ اور کس طرح کہا ہے ؟ کہ بے اختیار ذوق صحیح وجد کرنے لگتا ہے۔

مدحیہ شاعری

ان مثالوں سے یہ بھی ظاہر کرنا مقصود تھا کہ علامہ کے مذاق سلیم نے عام طور پر قصائد اور ترکیب بند سے وہی کام لیا ہے جو واقعی ان کا صحیح مصرف تھا یعنی کہیں مناظر قدرت کی مصوری کی ہے، کہیں مسلمانوں کی موجودہ روحانی اور اخلاقی پستی پر اپنے درد دل کا اظہار کیا ہے، کہیں قدیم اور جدید تعلیم کے نقائص بیان کئے ہیں، کہیں وہ نمایان مغرب کی ذلالت اور گمراھی کا راز طشت از بام کیا ہے اور کہیں اتباع کتاب و سنت کی وہ دیرینہ دعوت دی ہے جس کو قبول کئے بغیر بد نصیب مسلمانوں کے آلام و مصائب کا خاتمہ نہیں ہو سکتا۔ غرض جو کچھ لکھا ہے وہ واقفیت سے متجاوز نہیں ہے اور جس طرح لکھا ہے اس کو ایک وسیع النظر اور قادر الکلام شاعر ہی لکھ سکتا ہے۔ اگر ناظرین علامہ کی مدح سرائی کا بھی انداز دیکھنا چاھتے ہوں تو اس کی بھی مثالیں اس کلیات میں موجود ہیں، لیکن بہت کم ہیں اس لئے کہ یہ چیز ان کے مذاق کی نہ تھی۔ ہمارے نزدیک مداحی شاعری کا کوئی کمال نہیں ہے خصوصاً وہ مداحی جو عام طور پر ایرانی شعراء نے سلاطین و امراء کی ہے۔ اس سے تو کسی بلند خیال اور شریف النفس شاعر کا قلم کبھی آلودہ نہیں ہو سکتا البتہ اگر ممدوح کی صحیح تعریف کی جائے

اور بے جا مبالغہ اور غلو سے کام نہ لیا جائے تو چنداں مضائقہ نہیں مثال کے طور پر علامہ کے ایک مدحیہ قصیدہ کے چند اشعار ہم اس موقع پر نقل کرتے ہیں۔ یہ قصیدہ سابق بیگم صاحبہ بھوپال کی تعریف میں ہے اور اس موقع پر لکھا گیا ہے جب بیگم صاحبہ نے ایک متعین ماہانہ رقم سے دارالعلوم ندوہ کی امداد فرمائی تھی۔ اس قصیدے سے دراصل مصنف کو اپنے سپاس مندانہ جذبات کا اظہار مقصود تھا اور اسی سلسلہ میں کچھ تعریفی اشعار بے اختیار قلم سے نکل گئے ہیں، ملاحظہ ہو۔

آن چہ بادشت و چمن ابر بہاران کردہ است
خسرو کشور بھوپال بما آن کردہ است

ندوہ را گر سر و سامان رسد ازوے چہ عجب
زانکہ ہرکار کہ او کرد بہ سامان کردہ است

چوں نگہ کرد کہ دین نبوی در خطر است
لا جرم یاوری سنت و قرآن کردہ است

رایت علم نگوں بودۂ و، افراشتہ است
چہرۂ شرع حزین بودہ و خندان کردہ است

بہر مردان ہمہ آئین عمل خواہد بود
آن چہ در تربیت عالم نسوان کردہ است

دانش آموختن پردہ نشینان عفاف
مشکلے بود کہ از فکر خود آسان کردہ است

کار آموزش و تعلیم زنان گرچہ خوش است
نہ بآں شیوہ تواں کرد کہ نادان کردہ است

ہر چہ او گفت بآئین شریعت گفت است
ہر چہ او کرد بہ فرمودۂ یزدان کردہ است

معدلت را بہ سیاست نتواں کرد بہم
وقت او خوش کہ ہم ایں کردہ و ہم آں کردہ‌است

اس مدح غائب کے بعد بیگم صاحب کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں۔

بے کساں را نگہہ مہر تو بنواختہ است
خستگان را نظیر لطف تو درمان کردہ است

ہر کرا در چمن دولتت افتاد گذر
صدھزاران گل امید بدامان کردہ است

چرخ از چشم جہان رابعہ را گر بہ نہفت
باز در پیکر پاک تو نمایان کردہ است

اگرچہ پورا قصیدہ خوشامدانہ مداحی اور بیجا مبالغہ سے بالکل پاک ھے اور جو صفات بیان کی گئی ھیں ان میں سچائی اور واقعیت ھے تا ھم اتنی مدح بھی علامہ کی طبع غیور پر گراں ھے ، چنانچہ آخر میں ضبط نہیں ھوتا اور صاف کہہ دیتے ھیں۔

شبلی غمزدہ را مدح شہاں شیوہ نبود
لیک لطفت ھمہ را بندۂ احسان کردہ است

علامہ کو ریاست حیدر آباد سے خاص تعلق تھا لیکن یہاں بھی عزت نفس اور خود داری کا سر رشتہ ھاتھ سے چھوٹنے نہیں پایا ۔ ناظرین کو تعجب ھو گا ، لیکن ایک اقلیم علم و دانش کے فرماں روا کی شان کجکلاھی کا یہی تقاضہ تھا ۔ غرض علامہ کی شاعری بیجا مدح سرائی کے داغ سے پاک ھے ۔ جو کچھ مدح و تعریف ھے وہ کسی خاص موقع یا واقعہ سے متاثر ھو کر کی ھے اس لئے اس میں عام قصیدہ گویوں کی طرح منافقانہ تصنع کی آلائش نہیں پائی جاتی بلکہ یہ معلوم ھوتا ھے کہ خلوص و محبت کی تحریک سے بے اختیار قلم اُٹھ گیا ھے ۔

نعتیہ شاعری

علامہ مرحوم نے ایک نعتیہ قصیدہ بھی لکھا ھے ۔ یہ آغاز شباب کے زور قلم کا نتیجہ ھے ۔ جس سے اندازہ ھوتا ھے کہ علامہ کو زبان پر کتنی غیر معمولی قدرت حاصل ھے اور ھم قافیہ الفاظ کا کتنا وسیع

ذخیرہ ان کے پاس موجود ہے - چنانچہ آخری نعتیہ اشعار ملاحظہ ہوں -

آن خسرو عرش آستان ، آن داور گیتی ستان
آن قبلہ گاہ انس و جان ، آن خاتم پیغمبران

دانائے اسرار نہان ، روح الامینش پاسبان
گردون برنگ چاکران خاک درش را بوسہ زن

پیش از ہمہ شانش نگر ، عیسیٰ ثنا خوانش نگر
چرخ از غلامانش نگر ، وان قدر ایوانش نگر

برتر زکیوانش نگر ، جبریل دربانش نگر
در بند احسانش نگر ، آبائے علوی ہفت تن

عالم ہمہ خاک رہش ، قصر فلک عشرت گہش
وین بارگاہ نہ تہش ، گشتہ کمینہ خر گہش

گیتی و این ہفت و نہش ، باشد غبار درگہش
وز جلوۂ نور مہش ، روشن شد این نہ انجمن

آن تاجدار ملک و دین ، دارائے اقلیم یقین
دانائے علم اولین ، فرمان برش روح الامین

عالم شدش زیر نگین ، چرخش ہمی بوسد زمین
آدم ہماں درماء و طین ، او گشتہ میر انجمن

باوجود ایک خاص صنعت کے التزام کے غور کرو ، انداز بیان کی روانی اور الفاظ کی فصاحت و موزونی میں کہیں سے کوئی خاص نقص نظر آتا ہے - پورے قصیدہ کا شروع سے آخر تک یہی رنگ ہے -

ناظرین کو علامہ مرحوم کا یہ دعویٰ '' زاہد را من آشنائی دادہ ام با عاشقی '' غالباً یاد ہوگا مذکورہ بالا مثالوں میں علامہ نے اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس سے جس والہانہ شیفتگی اور عقیدت کا اظہار کیا ہے کیا وہ اس دعویٰ کے ثبوت کے لئے کافی نہیں ہے؟ یہ وہی دل ہے جس کے رندانہ جوش و مستی کا عالم تغزل کے

میدان میں ناظرین دیکھ چکے ہیں، لیکن اب اسی رند مینا بدوش کی اداؤں میں دین و ایمان کے ذوق و محبت کی سرشاریاں نظر آ رہی ہیں۔ اور اب اسی زبان سے جو خدا کا نام بھی بے ذوق سے لے رہی تھی اتباع کتاب و سنت کی مقدس صدائے دعوت بلند ہو رہی ہے۔

این سعادت بزور بازو نیست　　تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

مثنوی نگاری

اصناف سخن میں سے علاوہ قصائد کے مثنوی کی صنف بھی شاعرانہ کمال کا ایک خاص تماشا گاہ ہے جہاں شاعر کی قوت نظم کی سحرکاریوں کا اصلی سماں نظر آتا ہے۔ اگرچہ علامہ نے کسی خاص موضوع پر کوئی مثنوی نہیں لکھی ہے۔ تاہم اس کلیات میں کچھ ایسے نمونے موجود ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ کی سعیٔ قلم اس میدان میں بھی ناکامیاب نہیں رہ سکتی تھی۔ مثال کے طور پر ہم علامہ کی ایک خاص نظم کے چند اشعار نقل کرتے ہیں جس میں ان کے خامۂ سحر کار نے عید الضحیٰ کے موقع پر سلطان ٹرکی کی ادائے نماز کا منظر پیش کیا ہے:

مہر چو از جیب افق سر کشید
خاست زہر ناحیہ گلبانگ عید

دیدہ پر از خواب چو بر خاستند
پیر و جوان جملہ تن آراستند

شیوہ و آئین طرب تازہ گشت
کوچہ و بازار پر آوازہ گشت

مژدہ رسید اینکہ شہ چارہ ساز
زود بر آید بادائے نماز

تا برد از خوان کرم توشۂ
خلق برون ریخت زہر گوشۂ

پیک نظر راہ تماشا نیافت
نقش قدم ہم بہ زمین جا نیافت

از دو سوئے راہ بکسب شرف
خلق بآئین ادب بست صف

مہر چو در ہر جہت افشاند نور
کوکبۂ شاہ عیاں شد زدور

گشت رواں از پئے ہم خیل و فوج
موج تو گوئی کہ شکستی بہ موج

بود شعار ہمہ از ہم جدا
ہر ہمہ را رایت و پرچم جدا

پرتو آں اسلحۂ تابناک
نور ہمی ریخت بدامان خاک

با ہمہ تمکین چو گذشت این گروہ
گشت یکبار زمین پر شکوہ

غلغلہ برخاست کہ بادا نوید
مہر جہانتاب خلافت دمید

اس کے بعد سلطان المعظم عبدالحمید خان کی شان میں کچھ مدحیہ اشعار لکھے ہیں اور آخر میں سلطان کو مخاطب کر کے اپنے جذبۂ اخلاص و عقیدت کو اس طرح ظاہر کیا ہے۔

آں توئی امروز کہ در روزگار — ہست برو دولت و دیں را قرار
تازگیٔ بدر و حنین از تو ہست — زیب و طراز حرمین از تو ہست
فرۂ دین نبوی از تو ہست — بازوئے اسلام قوی از تو ہست
شرع بجاہ تو چوشد ارجمند — باد بفرمان تو چرخ بلند
سکۂ اقبال بنام تو باد — ہر چہ بگیتی است بکام تو باد

قسطنطنیہ عزیزان وطن کو مخاطب کر کے ایک ناتمام مثنوی کی صورت میں اپنے حالات و کیفیات کو بیان کیا ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

از کرم داور بالا و پست
حال من آن گو نہ کہ بایست ہست

ہم بہماں طرز روش می زیم
زندہ ام و فارغ و خوش می زیم
نیست سر انجمن آرائی
این منم و گوشۂ تنہائی
وینکہ برسید کہ زان جلوہ گاہ
تاچہ بود حاصل چشم و نگاہ
ے چہ تو ان گفت کہ ذوق سخن
ہر نفسم می برد از خویشتن
گرچہ نخواہم کہ نشینم خموش
فرصت آن کو کہ بیایم بہوش
گرچہ بعرض سخن آمادہ ام
مست زکیفیت ایں بادہ ام
بگذر ازیں حرف و مکرر مپرس
خواب خوشی دیدم و دیگر مپرس
تند مئے بود خرابم ہنوز
دیدۂ من باز و بخوابم ہنوز
باتو چگویم کہ چہا دیدہ ام
شعبدہ ھا پیش نظر چیدہ ام
بزم چواز جلوۂ زیبا پر است
دامن چشمم ز تماشا پر است

علاوہ واقعہ طرازی اور تسلسل خیال کے مذکورہ بالا مثالوں کی لطافت زبان پر غور کرو معلوم ہوتا ہے کہ ایک صاف شیریں قدرتی چشمہ پہاڑ کے دامن پر نکل کر بلا کسی رکاوٹ کے مستانہ وار بہتا چلا جاتا ہے۔

اب تک جو کچھ لکھا گیا اس سے ناظرین کو علامہ کی پر جوش اور ولولہ انگیز طبیعت کی سر مستیوں اور رعنائیوں کا کافی طور پر اندازہ ہو گیا ہو گا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ علامہ نے درد و غم کے جذبات کس طرح ادا کئے ہیں ؟ کہ یہ بھی شاعری کا ایک خاص میدان ہے ۔

مرثیہ نگاری

اس کلیات میں متعداد مراثی ہیں اور یہ ان بزرگوں کی وفات پر لکھے گئے ہیں جن کی علامہ کے دل میں خاص وقعت اور محبت تھی لیکن باوجود اس کے ان مرثیوں میں درد و غم اور سوز و گداز کی وہ خاص کیفیت محسوس نہیں ہوتی جو اصولاً مرثیہ کے لیے نہایت ضروری ہے ۔ مثلاً نواب ضیاالدین خاں متخلص بہ نیر کا مرثیۂ لکھتے ہیں تو اس کی ابتدا یوں کرتے ہیں۔

گرم ہنگامہ شو اے نالۂ دل ہان برخیز
از پئے برہمئی عالم امکان برخیز

تو هم اے آہ جہان سوز بسامان برخیز
اے جنون باز بتاراج گریبان برخیز
چشم خونابه فشاں خواست چو، طوفان کردن
خون شو اے دل ، کہ توانم سروسامان کردن

غور کیجیے یہ کسی غمزدہ دل کی ندائے درد ہے یا کسی بلند حوصلہ جوان کا نعرۂ جنگ ہے۔

دوسرے بند کا انداز ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں۔

دو جہاں ایں همه درهم شده، چوں ست وچه هست؟
آسماں حلقۂ ماتم شده ، چوں ست وچه هست؟
مہر داغ دل عالم شده ، چوں ست وچه هست؟
اختران دیدۂ پرنم شده ، چوں ست وچه هست؟
شاهد روز بمرگ که بماتم به نشست
ازچه لیلائے شب آشفتۂ و درهم به نشست

یہاں بھی انداز بیان کے جوش و خروش کا وہی عالم ہے حالانکہ یہ جوش و خوش کا وقت نہیں ہے اور نہ قلم سے شاهد روز و لیلائے شب وغیرہ کی سی رنگین ترکیبوں کے کھلنے کا موقع ہے غور کجیئے یہ صرف ایک باکمال اور نکتہ سنج شاعر کی وفات کا واقعہ ہے۔ اس کا اثر صرف بزم سخن کو ملول اور آفسردہ خاطر کر سکتا تھا لیکن دیکھئے زور قلم نے اس اثر کو کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا یعنی تمام کائنات ارضی وسماوی پر اس غبار غم کی تاریکی چھا گئی۔ حالانکہ یہ حادثہ ایسا نہ تھا کہ نظام کونین درهم برهم ہو جاتا، آسمان حلقۂ ماتم بن جاتا، ستارے اشک باری کرنے لگتے۔ اس سے میری یہ مراد نہیں ہے کہ علامہ کا دل اس واقعہ سے متاثر نہ تھا یا انہوں نے محض تصنع سے کام لیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علامہ اپنے ولولہ انگیز دل و دماغ اور سحر کار قلم کی رعنائیوں سے مجبور تھے اس لیے جذبات غم کی مصوری ان کے بس کی چیز نہ تھی۔ قدرت نے ان کو ایک رنگین اور شگفتہ طبیعت عطا کی تھی جس کے لیے

نوحہ خوانی نہایت دشوار کام تھا چنانچہ اپنے والد مرحوم کے مرثیہ میں صاف طور پر اپنی اس مجبوری کی معذرت کر دی ہے ۔

داستاں سرائے بزم طرب بودہ ام بدھر
ما را بنوحہ زمزمہ سنج فغاں مکن

علامہ نے اس شعر میں اپنی فطرت کا اصلی مذاق ظاہر کر دیا ہے اب اس کے بعد ان کے زبان و قلم سے کیا شکایت کی جا سکتی ؟

خونی تعلق کے جوش و اثر کی بنا پر خیال تھا کہ والد کے مرثیہ میں کم از کم انداز بیان کچھ ایسا پر سوز اور درد انگیز ہو گا کہ پڑھنے والے کی بھی آنکھیں پرنم ہو جائیں گی لیکن اس موقع پر بھی دل میں درد و غم کی جو روح فرسا تڑپ تھی اس کی کوئی موثر تصویر آنکھوں کے سامنے نہ آ سکی البتہ علامہ نے اپنے محترم استاد مولانا فیض الحسن مرحوم سہارنپوری کا جو مرثیہ لکھا ہے اس کے انداز بیان میں کچھ سوز وگداز کی کیفیت ضرور محسوس ہوتی ہے ۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

دریں آشوب غم عذرم بنہ گرنالہ زن گریم
جہانے را جگر خون شد ہمیں تنہا نہ من گریم

بہ تحسین صبوری چند بفریبی مرا ناصح ؟
دمے بگذار تا در ماتم فیض الحسن گریم

ہمرکش علم و فن در نالہ با من ہم نوا باشد
ہنر بر خویشتن گرید، چو من بے خویشتن گریم

خود این آشوب و این ہنگامہ از یادم نخواہد شد
ہماں نو باشد ایں غم تا دریں دیر کہن گریم

بہ یکبار انجمن برہم زدی تا از میاں رفتی
سزد من گر دریں ماتم، چو شمع انجمن گریم

چو در دل تا از کہ رنجیدی چرا رفتی
زما بگبستہ اے مولائے ما آخر کجا رفتی

علمی و ادبی فضائل و کمال کے لحاظ سے مولانا فیض الحسن مرحوم کی ہستی عدیم المثال تھی۔ علامہ مرحوم نے ان کے مکتب درس سے خاص طور پر کسب فیض کیا تھا اس لیے ان کی وفات سے علامہ مرحوم کو غیر معمولی صدمہ پہنچا تھا جس کا اندازہ آخری بند کے چند اشعار سے ہو سکتا ہے۔

زبس در کار غم دل بوده است و دیدهٔ ترهم
بخاک تربت او لعل افشاندیم و گوهرهم

سخن را ایں چنیں شیرازه بستن تا که بتواند
پس از وے دفتر معنی پریشان گشت و ابترهم

صبا گر بگذری بر تربت پاکش بگو از من
که اے در شیوهٔ دانش مرا استاد و رهبرهم

درودے پیشکش آورده ام باشد که بپذیری
که شبلی خاکبوس درگهت بودست وچاکرهم

ازین خواب گران آخر چو روز حشر برخیزی
چو صور حشر من در ناله ام وقت است اگرخیزی

لیکن اس انتہائی غم کی حالت میں بھی طبیعت کی شوخی و رعنائی نہیں گئی چنانچہ دوسرے بند میں مولانا مرحوم کے فضل و کمال کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ شعر بھی قلم سے نکل گیا۔

نکیرین از کجا سنجید لطف طبع رنگینت
بنا فہمان ندانم چوں پسندی همزبان بودن

غرض واقعہ یہ ہے کہ علامہ کا ادیبانہ قلم کسی موقع پر رنگینی سے باز نہیں آ سکتا تھا۔ یہ اس کی فطرت تھی اور فطرت کا بدلنا نہایت دشوار بلکہ تقریباً نا ممکن ہے۔ لکھنے کو تو اب تک بہت کچھ لکھا گیا لیکن معلوم نہیں کہ ارباب نظر کے نزدیک میری یہ نا چیز سعی کس حد تک علامہ مرحوم کے کلام پر نقد و تبصرہ کرنے میں کامیاب

ہوئی ہے - لیکن اتنی توقع ضرور ہے کہ باوجود اپنی محدود قابلیت کے جو کچھ عرض کر سکاھوں اس سے اہل ذوق کو علامہ مرحوم کی شاعری کے نمایاں محاسن و خصوصیات کا کافی طور پر اندازہ ہو گیا ہو گا۔

علامہ کے خیالات و جذبات کی شوخی ، رعنائی ، حرارت ، بلندی اور لطافت کچھ کم قابل قدر نہیں ہے - لیکن ہمارے نزدیک بحیثیت فارسی شاعر کے ان کا اصلی کمال ان کی خالص ایرانی طرز ادا ہے جو بہت کم ہندی نژاد فارسی شعراء کے کلام میں نظر آتی ہے - علامہ نے تقریباً ہر صنف سخن پر طبع آزمائی کی ہے لیکن ہر جگہ زبان کے لحاظ سے اپنے صحیح ذوق فارسیت کا ثبوت دیا ہے یعنی ہندوستان میں بیٹھ کر انہوں نے وہ زبان استعمال کی ہے جس پر اہل زبان کو بھی حرف گیری کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ علامہ اگرچہ الفاظ و محاورات کی صحت کا خاص خیال رکھتے تھے یعنی کوئی لفظ یا محاورہ ان کے قلم سے ایسا نہیں نکلتا تھا جس سے ہندوستانیت کی بو آتی ہو - تا ہم سفر روم کے قصیدے میں ایک جگہ لفظ عرصہ بمعنی مدت و زمانہ استعمال کر گئے ہیں حالانکہ فارسی میں یہ بمعنی میدان وغیرہ مستعمل ہے مثلاً عرصۂ عالم ، عرصۂ محشر ، عرصۂ خیال ، وغیرہ مدت و زمانہ کے مفہوم میں اس کا استعمال صحیح نہیں ہے - وہ شعر یہ ہے :

آرنلڈ آنکہ رفیق است و ہم استاد مرا
ہم در آن عرصہ با نگلینڈ ہمی خواست سفر

لیکن ہمارے نزدیک یہ قلم کی محض اتفاقی لغزش معلوم ہوتی ہے ورنہ یہ کیوں کر تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ علامہ کو عرصہ کا صحیح فارسی لفظ معلوم نہیں تھا - خیالات کی رو میں نا دانستہ اس کا سہو اساتذۂ فن سے بھی ہو جاتا ہے -

غرض علامہ مرحوم نے باوجود اپنی علمی مصروفیتوں کے فارسی شاعری کا جو نمونہ پیش کیا ہے اس کی ندرت اور بلندپائگی سے انکار نہیں ہو سکتا اور نہ مجموعی حیثیت سے ہندوستان کے دوسرے

فارسی گو شعرا کے کلام میں اس کی مثال مل سکتی ہے ۔

اکثر باکمال شعرا نے اپنے کمال فن پر اظہار فخر کیا ہے ۔ فیضی و عرفی وغیرہ کے فخریہ اشعار تمھاری نظر سے گزرے ہوں گے علامہ نے بھی متعدد مواقع پر اپنے اس احساس کا اظہار کیا ہے ۔ زبان کی لطافت، روانی اور برجستگی کے لحاظ سے بھی یہ اشعار سننے کے قابل ہیں، سیرۃالنعمان کے دیباچہ میں فرماتے ہیں ۔

باز بر آنم که دریں داوری
دل برم از خلق بافسونگری

خواسته ام طرح دگر ریختن
شعبدۂ تازه بر انگیختن

بزم دگر هست و تماشا دگر
باده دگر آرم و مینا دگر

زمزمۂ تازه بساز افگنم
غلغله در حلقۂ راز افگنم

باده فرستم بحریفاں دگر
از مے دوشین قدرے تند تر

زخمه که بر تار سخن می زنم
هاں بنگر تابچه فن می زنم

قاعدۂ سحر طرازیست ایں
نیک نگه کن که چه بازیست ایں

حرمت ایں کار نگهداشتن
نامه به لعل و گهر انباشتن

کار من ست ایں حد هر خام نیست
ایں بود آں مے که به هر جام نیست

کان معانی ہمہ کاویدہ ام
کیں گہرے چند فراچیدہ ام

غارت بت خانۂ چین کردہ ام
تا صنمے چند گزیں کردہ ام

خاک در میکدہ ھا بیختم
کیں مئے صافی بقدح ریختم

گرچہ متاع از دگر آوردہ ام
قطرہ ربودم گہر آوردہ ام

گرچہ مرا شیوۂ فن ایں نبود
حرف بہ اردو زدن آئیں نبود

پیشتر از گرم طلب بودہ ام
بادیہ پیمائے عرب بودہ ام

بزم چو آں فرۂ و آں ساز داشت
ساغر من بادۂ شیراز داشت

لیک چو آں مطرب و ساقی نماند
بوئے ازاں میکدہ باقی نماند

ایک دوسری نظم کے سلسلہ میں علامہ کی جدت آفرین طبیعت کی شان ادعا ملاحظہ ہو۔

خواهم اکنوں عناں بگردانم
رسم پیشینیاں بگردانم

زیں بساط کہن چو بر خیزم
پیکرے تازۂ بر انگیزم

رسم دیرینہ را بر اندازم
در سخن طرح دیگر اندازم

بدمم خلق را فسون دگر
کردہ ام ساز ارغنون دگر

تا بسنجی کہ با کمال سخن
تنگئی نیست در مجال سخن

بطور دیباچہ الفاروق علامہ مرحوم نے جو قطعہ لکھا ہے اس کو اس موقع پر نظر انداز کر دینا ارباب ذوق پر بہت بڑا ظلم ہو گا اور اب

هم اس قطعه پر اس ریو یو کو ختم کرنا چاهتے هیں - عجیب پرجوش اور کیف انگیز قطعه هے ، فرماتے هیں -

منکه یک چند زدم مهر خموشی بر لب
کس چه داند که دریں پرده چه سودا کردم؟

پیکر تازه که خواهم به عزیزاں بنمود
لختے از ذوق خودش نیز تماشا کردم

محفل از بادهٔ دو شینه نیا سود هنوز
بادهٔ تند تر از دوش به مینا کردم

باز خواهم که دمم در تن اندیشه رواں
منکه دریوزهٔ فیض از دم عیسیٰ کردم

هم نشین نکتهٔ حکمت ز شریعت می جست
لختے از نسخهٔ روح القدس املا کردم

شاهد راز که کس پرده زرویش نگرفت
گره از بند قبایش به فسوں وا کردم

بسکه هر بار گهر پاش گذشتم زین راه
دشت معنی همه پر لولوئے لالا کردم

افسوس که اس خامه سحر کار کی گهر پاشیوں سے چمنستان ادب همیشه کے لیے محروم هو گیا - معلوم نهیں که علامه کے ان نازک اور پر کیف نغموں نے اهل ذوق کے شاعرانه احساس پر کیا اثر ڈالا هے لیکن هم تو علامه مرحوم کی بار گاه سے یه کهه کر رخصت هوتے هیں -

بانگ قلمت درین شب تار
بس معنیٔ خفته کرد بیدار

نذرِ عقیدت

خواجہ دل محمد صاحب

حضرت سلامت - یوم شبلی کے لئے چار رباعیاں اور ایک قطعہ بامثال امر پیش خدمت ہے - گر قبول افتد زہے عز و شرف -

رباعیات

(۱)

نیر رنگ فصاحت ہے مقال شبلی
یک رنگ خیال و حال و قال شبلی

اے اہل قلم کبھی جو لکھنے بیٹھو
بھولو نہ مثال بے مثال شبلی

(۲)

روشن ہے کلام لا کلام شبلی
ممتاز و بلند ہے مقام شبلی

تاریخ و ادب زیر قلم تھے دونوں
سکہ تھا یہاں رواں بنام شبلی

(۳)

مخلص ، ہمدرد ، رہنما تھے شبلی
مخدوم و مطاع و مقتدا تھے شبلی

کی عمر بسر فلاح ملت کے لئے
سو جان سے قوم پر فدا تھے شبلی

(۴)

خوش گو خوش فکر و خوش بیان تھے شبلی
مانند ہزار داستاں تھے شبلی

سر سید مرحوم تھے جس قوم کا دل
اس قوم کے دل کا ترجماں تھے شبلی

قطعہ

۱۸۵۷ء
ستاون میں ابھرا تھا ستارا ایک نورانی
ستاون سال تک دنیا نے دیکھی جس کی رخشانی

۱۹۵۷ء
ستاون سن پھر آیا ہے صدی کروٹ بدلتی ہے
مناؤ یادگار حضرت شبلی نعمانی

نوٹ:- علامہ شبلی ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ۵۷ سال کی عمر پائی۔